برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است

ایں دو قوت اعتبارِ ملت است

اقبالؒ اور قرآن کریم

فکر و پیامِ اقبالؒ ——— قرآن کی روشنی میں

جلد دوم

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵-بی، گلبرگ ۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	------	اقبال اور قرآن
		(مبنی برخطابات محترم پرویز صاحب)
تالیف	------	محمد عمر دراز
ناشر	------	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	------	25-B گلبرگ II لاہور 54660
طابع	------	دوست ایسوسی ایٹس
	------	الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
مطبع	------	عصمت اسلم پرنٹرز
پہلا ایڈیشن	------	اگست 1988ء
دوسرا ایڈیشن	------	مئی 1996ء

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فہرست

نمبر شمار	عنوان		صفحہ
۱۔	متعاول اقبالؒ	ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء	۱
۲	اقبالؒ اور ختم نبوّت	اپریل ۱۹۷۵ء	۱۸
۳	متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی	اپریل ۱۹۷۶ء	۴۴
۴	اسلامی مملکت کا تصور اقبالؒ کے نزدیک	اپریل ۱۹۷۷ء	۹۴
۵	فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ قرآن	اپریل ۱۹۷۸ء	۱۲۲
۶	روحؒ کا مسئلہ اقبالؒ کی نظر میں	اپریل ۱۹۷۹ء	۱۶۳
۷	قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء	اپریل ۱۹۷۹ء	۱۷۳
۸	اقبالؒ اور کمیونزم	اپریل ۱۹۸۰ء	۲۰۷
۹	دو قومی نظریۂ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کی نگاہوں میں	نومبر ۱۹۸۰ء	۲۳۰
۱۰	احترامِ آدمیت کس نگردد در جہاں	اپریل ۱۹۸۱ء	۲۵۸
۱۱	پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ	اگست ۱۹۸۱ء	۲۸۹
۱۲	نذرِ اقبالؒ	نومبر ۱۹۸۱ء	۲۹۷
۱۳	حقیقت خرافات میں کھو گئی	اپریل ۱۹۸۲ء	۳۱۵
۱۴	خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر	اپریل ۱۹۸۲ء	۳۳۹

پیش لفظ

(طبع اوّل)

"اقبالؒ اور قرآن" محترم پرویزؒ صاحب کے ان مقالات اور خطابات کا مجموعہ ہیں جو انہوں نے وقتاً وقتاً ارزاں فرمائے۔ اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس میں ۱۹۷۴ء تک کے خطابات و مقالات آ گئے ہیں۔ اس بات کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ محترم پرویزؒ صاحب کے ۱۹۷۵ء اور بعد (ان کی وفات تک) کے مقالات کو بھی کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ جلد دوم اسی ضرورت کے پیشِ نظر طبع کی جا رہی ہے، اور اس کے ساتھ، ان کا وہ مقالہ بھی زینتِ دہ اوراق ہے جو اوراقِ گم گشتہ سے ڈھونڈ کر نکالا گیا ہے کیونکہ (غالباً) یہ فکرِ اقبالؒ پر ان کی پہلی نگارش ہے اور اوّلاً ماہنامہ نیرنگِ خیال لاہور کے خصوصی شمارہ، اقبالؒ نمبر، بابت ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہ انجمن ترقّی اردو کی طرف سے شائع کردہ کتاب "اقبال معاصرین کی نظروں میں" میں بھی شائع ہوا، اور جس کا عنوان ہے "متناول اقبالؒ"۔

ہمیں امید ہے کہ اس جلد دوم کی طباعت سے محترم پرویزؒ صاحب کی فکرِ اقبالؒ سے متعلق تمام نگارشات کتابی صورت میں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔

اس کے بعد، اگر ان کی اس سلسلہ کی کوئی تحریر سامنے آئی تو اسے جلد دوم کی آئندہ اشاعت میں شامل کر دیا جائے گا۔

واللہ المستعان!

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

گلبرگ لاہور (۱۹۸۸ء)

ماہنامہ نیرنگ خیال
اکتوبر ۱۹۳۲ء

متفاولِ اقبالؒ

کوئی تین برس اُدھر کا ذکر ہے، مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی، جس کا عنوان تھا ——— اقبالؒ معاصرین کی نظر میں ——— کتاب کے مرتب تھے پروفیسر وقار عظیم صاحب (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں)۔ اس میں ایک مقالہ بہ عنوان "متفاولِ اقبالؒ" پرویزؔ صاحب کے قلم سے بھی شامل تھا، حوالہ صرف "۱۹۳۲ء" دیا گیا تھا۔ ایک دوست کی نگاہوں سے یہ مقالہ گزرا تو انہوں نے ہم سے کہا کہ مقامِ حیرت ہے کہ پرویزؔ صاحب کا یہ مقالہ (جو غالباً علامہ اقبالؒ پر ان کی اوّلین نگارش ہے) طلوعِ اسلام یا اس کی طرف سے شائع کردہ کسی کتاب میں درج نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس مقالہ (بلکہ پرویزؔ صاحب کی اس قسم کی اور تحریروں کو بھی) طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ کر لینا چاہیئے کہ ان کا شمار نوادرات میں ہوتا ہے۔ ہم نے ان سے اتفاق کیا، چنانچہ یہ مقالہ پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔

پس منظر اس کا یہ ہے کہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں، ماہنامہ نیرنگ خیال (لاہور نے اپنا خصوصی شمارہ، اقبالؒ نمبر کے نام سے شائع کیا۔ (وہ غالباً کسی ماہنامہ کا پہلا اقبالؒ نمبر تھا) اور پرویزؔ صاحب نے ان کے حسبِ فرمائش یہ مقالہ تحریر فرمایا۔ یہ آج سے پینتالیس سال پہلے کی بات ہے جب پرویزؔ صاحب کی عمر ۲۸/۲۹ سال کی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پرویزؔ صاحب، تلاشِ حقیقت میں، تجسس و تحقیق کی مختلف وادیوں میں سرگرداں تھے۔ اور اگرچہ وہ اپنے دامن کو قدامت پرستی کی خار دار جھاڑیوں سے بڑی حد تک چھڑا چکے تھے لیکن ہنوز اُن سے بالکلیہ باہر نہیں نکل پائے تھے۔ چنانچہ آپ کو ان کے اس مقالہ میں، اس ماضی کے کئی ایک نقوش دکھائی دیں گے، جو بعد میں قرآن خالص پر آنے سے مٹ گئے۔ ہم نے مقالہ کے حواشی میں ان کی نشاندہی کر دی ہے۔

اس مقالہ کی اشاعت سے ہمارے پیشِ نظر جہاں یہ مقصد ہے کہ اس قسم کے نوادرات

طلوعِ اسلام کے اوراق میں محفوظ ہو جائیں، وہاں یہ دکھانا بھی مطلوب ہے کہ ایک مفکر کی فکر کن ارتقائی مراحل سے گزرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ پر جب ایک دفعہ یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے اپنے سابقہ خیالات میں تبدیلی کر لی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ جامد تو پتھر ہوتا ہے۔ میں انسان ہوں۔ اور انسانی فکر میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ پہلے نیشنلسٹ تھے، اب دو قومی نظریہ کے داعی کیسے ہو گئے، تو انہوں نے کہا کہ میں کبھی پرائمری میں بھی پڑھا کرتا تھا اور پرویز صاحب تو اپنی ہر تصنیف کے آخر میں وضاحت سے لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ میری فکر نہ حرفِ آخر ہے نہ سہو و خطا سے منزّہ ہے۔ یہ قرآن کریم کے سمجھنے کی انسانی کوشش ہے اگر اس میں کوئی بات قرآن مجید کے خلاف نظر آئے تو میں ان پر مزید غور کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں اور اس کے غلط ثابت ہونے پر اصلاح کے لئے آمادہ۔ اس مقالہ کے مطالعہ کے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ آج سے پینتالیس سال پہلے بھی، پیامِ اقبالؒ اور قرآنی حقائق پر انہیں بہ ہیئتِ مجموعی کس قدر عبور حاصل تھا۔

اب آپ وہ مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔

مئی ۱۹۷۷ء

"متفاولِ اقبال"

ترا چنانکہ توئی ہر کسے کجا داند
بقدرِ طاقتِ خود می کنند ادراک

عام انسان ملائکہ سے افضل ہیں یا نہیں۔ یہ امر تو علم الاخلاق میں کسی حد تک متنازع فیہ رہا ہے۔ لیکن اس میں

۱؎ متفاول (OPTIMIST) متشائم (PESSIMIST)

تو کسی کو کلام نہیں کہ عالمِ خلق میں حضرتِ انسان سے زیادہ شرف و اعتبار کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔[1] ایک طرف صُحفِ مقدسہ اس کی تصدیق میں رطب اللسان ہیں اور دوسری طرف دورِ جدید کے انکشافات اس کے مؤید۔ انجیل بتاتی ہے کہ آدم کو خدا نے اپنی شکل پر پیدا کیا ہے۔ خود قرآن حکیم خلقتِ انسانی کو "احسن تقویم" سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی ممکناتِ زندگی کو لامحدود قرار دیتا ہوا فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ... (۴۵/۱۳) کہ پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب حضرتِ انسان کے تابع فرمان ہے۔ ادھر ماہرینِ نظریۂ ارتقاء نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجوداتِ عالم کی زنجیر کی آخری کڑی حضرتِ انسان ہے اور اس سے بڑھ کر اشرف و مکمل ہستی ہنوز صفحۂ ارض پر نمودار نہیں ہوئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس یہ نظری شہادات نہ بھی موجود ہوتیں تو بھی انسانی قدرت و امکان کی داستانیں ہمیں مجبور کر دیتیں کہ اس کی خلافت و نیابتِ الٰہی پر آمنّا و صدّقنا کہا جائے۔[2]

لیکن طبائع و اخلاقِ انسانی کی بوقلمونی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایک طرف تو اس کی ہمت و حوصلہ کی وسعتوں کا یہ عالم، اور دوسری طرف، جب بعض ناگزیر اسباب و علل کے ماتحت اس کے ارادوں میں تزلزل اور عزائم میں فسخ شروع ہوتا ہے تو یہ دوں ہمتی، یاس و قنوط، افسردگی و پژمردگی تعطل و تفلج کا عجیب نمونہ پیش کرتا ہے، باید و شاید۔ پتہ نہیں سب سے پہلے وہ کون سا شکستہ خاطر و اندوہگیں انسان تھا جو حوادث و آلام سے مجبور ہو کر دل چھوڑ بیٹھا۔ اور اپنے ماحول۔ دنیا و مافیہا، بلکہ خود اپنی ذات سے تنگ آ گیا اور وہ کرنے ناقابلِ برداشت مصائب و آلام تھے، جن سے تنگ آ کر اس نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ دنیا، حزن و آلام، رنج و کرب، عقوبات، صعوبات، مشکلات و تکالیف کا گھر ہے اور مسرت و انبساط و سرور کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ متشائم نظریہ قرونِ اولیٰ ہی سے انسانی دماغوں پر کالی گھٹاؤں کی طرح چھا گیا تھا۔ حکمتِ یونان لینے اوج کمال پر پہنچی کہ افلاطون کا فلسفۂ نفیِ حقیقت رائج ہو گیا۔ ادھر ہندوستان میں ویدوں کے زمانہ میں ہی اس کا سراغ مل جاتا ہے۔ اُپنشدھ کی تعلیم کے مطابق آتما حقیقی اور اس کے ماوراء سب کچھ وہم لغو ہے اور موجوداتِ عالم مایا یعنی سراب۔

---

[1] پرویز صاحب نے قرآن مجید پر مزید غور و فکر کے بعد، ان نظریات میں تصحیح کر لی ہے۔ خدا نے آدم کو (جس سے مراد آدمی ہے) مسجودِ ملائکہ قرار دیا ہے اور انسان کے متعلق کہا ہے کہ اسے "اکثر مخلوق" پر فضیلت عطا کی ہے (۱۷/۷۰)۔ قرآن کریم اس کی بھی تصدیق نہیں کرتا کہ خدا نے آدم کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔

[2] آدم کے خلیفۃ اللہ ہونے کا نظریہ بھی صحیح نہیں۔ پرویز صاحب نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔

اس کے بعد بدھ مت کا زمانہ آتا ہے اور اس نے تو یوں کہئے کہ امیدوں کی چمکتی دنیا کا گویا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔ مہاتما بدھ کی تعلیم کے مطابق، حزن و ملال خلقتِ انسانی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں انسان کا وجود بذاتِ خود ایک بلائے عظیم ہے۔ اس تعلیم کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ "زندگی نام ہے خواہش و آرزو کا۔ اور آرزو سراپا درد و الم ہے۔ لہٰذا زندگی فی نفسہٖ درد و الم ہے۔ اور صرف ترکِ علائق، نفیِ خودی اور تعطلِ آرزو یعنی امید و دل کی فنا اور خواہشات کی موت سے انسان سکونِ ابدی اور راحتِ سرمدی کو حاصل کر سکتا ہے۔ جس کا نام نروان ہے"

دوسری طرف عیسائیت میں مسئلہ کچھ اور بھی لچک لے کر ابھرا۔ ان کے نزدیک اس مجلس آب و گل میں انسان تشریف ہی اس لئے لاتا ہے کہ اپنے اوّلین ماں باپ (آدم و حوّا) کے گناہوں کی سزا بھگتے۔ لہٰذا جتنا اس جیل خانہ سے دور رہے اتنا ہی سکھ ہے کہ بس

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

فلاسفۂ یورپ میں LIBNITZ کے وقت تک پھر بھی ایک حد تک متفادل نظریۂ حیات کا چرچا تھا۔ ہیوم نے اس روش کا کچھ کانٹا بدلا۔ ہیگل اور سپنسر اثبات سے تشکیک پر اترے اور شوپنہار نے تو بالکل بدھ مت کا چولا پہن لیا۔ وہ زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق، گردانتا ہے۔ اس کے نزدیک "انسان ایک غیر فانی درد و کرب کا تختۂ مشق ہے اور مسرّت و انبساط کا جو سراب اسے نظر آتا ہے وہ محض اس لئے ہے کہ یہ مصائب جھیلنے کے لئے ارتباطِ جسم و جان قائم رکھ سکے۔" لیکن چونکہ یورپ نے ایسے فلسفیانہ نظریات کو عملی دنیا میں دخل نہ دینے دیا۔ اس لئے یہ چیزیں ان کی مادی ترقی میں مانع نہ ہوئیں۔

اسلام دنیا میں آیا اور امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لایا۔ اس نے آتے ہی للکار کر کہا کہ:

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۹)

"مت گھبراؤ، بالکل خوف نہ کھاؤ۔ تم ہی سب سے بلند و برتر ہو۔ بس قوانینِ خداوندی کو ہاتھ سے نہ چھوڑو"۔

اس نے موجوداتِ عالم، اس کی فرمانبردار ٹھہرائیں۔ متاعِ دنیا اور مال و منال اس کے لئے باعثِ زینت و افتخار قرار دیئے۔ سرخروئی عقبیٰ کے ساتھ ساتھ دنیاوی فلاح و بہبود کی زندگی کو بھی خاصۂ حیات گردانا

اور ایک مسلم کی زبان سے یہ دعا نکلوائی کہ:۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً ...(۲/۲۰۱)

اس نے ایمان و عمل اور پھر ایمان و عمل کو رازِ حیات بتایا۔ اور یاس و قنوط، ناامیدی اور عدمِ آرزو کو کفر سے تعبیر کیا اور صاف صاف فرما دیا کہ: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (۳۹/۵۳) مصائب و آلام کی گھٹائیں چاروں طرف چھا رہی ہیں۔ مسلمان ۔ ۔ ۔ ۔ بے یار و مددگار نظر آتے ہیں۔ بظاہر دل ہلا دینے والے اسباب جمع ہیں۔ لیکن اسلام زندہ آرزوؤں کا مذہب اسلام، اس وقت پکار پکار کر کہتا ہے ؎

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (۹/۴۰) مت گھبراؤ، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ (۲/۲۱۴) وہ دیکھو نصرتِ خداوندی سامنے کھڑی ہے۔

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (۲/۴۵) ہمت و استقلال سے کام لو۔ ہمت بھی کرو۔ دعائیں بھی مانگو۔ حوصلہ رکھو، تم دس ہو گے تو سو پر فتح پاؤ گے۔ سو ہو گے تو ہزار پر بھاری ہو گے۔ بشرطیکہ امید کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔

یہ قانونِ فطرت دنیا میں خدا کا آخری پیغام بن کر آیا اور چند دنوں میں، صدیوں میں نہیں چند دنوں میں، اس نے سرزمینِ عرب کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں، بوریا نشین، بادیہ پیما، اونٹ چرانے والے بدوؤں کے ہاتھوں میں دے دیں۔

لیکن افسوس، یہ تابناک و درخشندہ عہد کچھ زیادہ دیر نہ رہنے پایا تھا کہ فطرت کے یہ سیدھے سادے قوانین گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہونے لگ گئے۔ شروع شروع میں شام و فلسطین کے کلیساؤں نے ان پر اپنا رنگ چڑھایا۔ پھر جب حکمتِ یونان عربی میں منتقل ہونی شروع ہوئی، فلسفۂ اشراقین نے اپنا اثر ڈالا۔ عجم میں زرتشتی آتش کدے ان اثرات کو جلا دینے کے لئے تیار تھے اور اس کے بعد جب ہندوستان میں پہنچے تو ویدانت نے ایسا "من تو شدم تو من شدی" کا منتر پھونکا کہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بحیرۂ "ہمہ اوست" ہو گئے۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ جہاں جہاں اور جب تک حکومت ہاتھ میں رہی اس کے اثرات زیادہ نہ ابھرے، لیکن جونہی حکومت کا سلسلہ ہاتھ سے چھوٹا ان کا رنگ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ ؏:۔

بالیقیں من نیم، و وہم و گمانم باقیست

میرے نزدیک تصوّف تہذیبِ نفس انسانی اور قوائے ملکیہ کی جلا کے لئے از بس ناگزیر ہے۔ لیکن وہی تصوّف جو "نانِ شعیر" سے قوتِ حیدری پیدا کردے جس سے اویس قرنی رضؓ کا سا عشق، بوذرؓ کا سا فقر، سلمانؓ کا سا صدق، صدیقؓ کا سا ایثار اور خبیبؓ کا سا استقلال پیدا ہو جائے۔ جو خوفِ غیر اللہ کو اس طرح قلبِ مومن سے محروم کر دے کہ راجپوتانے کے سے کفرستان میں تنہا توحید کا نعرہ بلند کرنے میں باک نہ سمجھے۔ جو سرزمین دہلی کو جاں سپاری و سرفروشی کی امتحان گاہ بنا دے، جو یہ سبق سکھلائے کہ پانی پت کے میدان میں مسلمان سپاہیوں کی قبروں کے پہلو بہ پہلو حضرت مخدوم جلال اور ترک شیرازی کے مقبرے بھی ہونے ضروری ہیں۔

ہاں تو عرض یہ کرنا تھا کہ ہندوستان میں پہنچ کر فلسفۂ ویدانت نے اسلامی تصوّف پر اس قدر گہرا رنگ چڑھا دیا تھا۔ یہ کیوں ہوا، اس کا جواب مثنوی اسرار و رموز کی ایک تمثیلی حکایت سے ملے گا۔ لکھا ہے کہ ایک جنگل میں بہت سی بھیڑیں رہتی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں کچھ شیر آ گئے اور ان بھیڑوں کا شکار کرنے لگے۔ ان میں سے ایک بھیڑ بڑی دانا اور ہشیار تھی اس نے سوچا کہ بھیڑوں کو شیر بنانا تو مشکل ہے۔ آؤ ایک ایسی چال چلیں کہ شیر بھیڑوں کی خُو بُو اختیار کر لیں۔ وہ ایک مقدس صورت اختیار کر کے شیروں کے پاس گئی اور ناپائداریِ دنیا، نفیِ وجود، سرابِ ہستی کی خوش آئند تعلیم دینی شروع کی۔ رفتہ رفتہ شیر اس پندِ خواب آور سے اس درجہ متاثر ہو گئے کہ انہوں نے دینِ گوسفند اختیار کر لیا۔ حتیٰ کہ ؎

شیر بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

کچھ گرد و پیش کا اثر جس کے متعلق BLOOMFIELD ایک جگہ لکھتا ہے۔ "ارضِ ہند اپنی آب و ہوا فطری اثرات اور معاشرتی حالات کی بنا پر متشائم فلسفۂ حیات کی کافی وجوہ اپنے اندر رکھتی ہے" اس پر فلسفۂ ویدانت کا رنگ نتیجہ یہ کہ اکبر کے وقت تک اچھے خاصے ہمہ اوست کے رنگ میں رنگے گئے اور اگر سچ پوچھو تو عالمگیرؒ کے بعد جو سلطنت کو زوال ہوا تو اصولی طور پر سب سے پہلے "شطحیاتِ دارا شکوہ" اس کے ذمہ دار ہیں۔

شاعری بقول میکالے حکمتِ ہی دورِ تنزل و انحطاط میں ہے۔ جہاں تک ورودِ حیات، کشمکشِ روزگار

لہ اس زمانے میں پرویز صاحب ہنوز تصوّف کی بھول بھلیوں سے نکل نہیں پاتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھے کہ وہ اس وقت بھی کسی قسم کے تصوّف کے قائل تھے۔

جذبۂ للبقاء کا سوال در پیش ہو۔ وہاں فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایام سے متشائم فلسفۂ حیات جذباتی شعراء کو ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ ہومر کا یہ المیہ گیت کسے یاد نہیں :-

"دنیا میں جتنی چیزیں ہیں انسان سے زیادہ المناک کسی اور کی زندگی نہیں۔"

اور سوفقلیس کا یہ نوحہ کسے بھولا ہوا ہے :-

بہترین آرزو یہ ہے کہ دنیا میں انسان آئے ہی نہیں۔

اور اگر آ گیا ہے تو پھر سب سے بہتر یہ ہے کہ :-

انسان جہاں سے آیا ہے جتنی جلدی ہو سکے وہیں واپس لوٹنے کی کوشش کرے۔

عرب کے ولولہ خیز خون میں حرارت پیدا کرنے والے رجزیہ زمزمے جب عجمی دورِ تعیش و تنعم کی مجلس میں آئے تو یہاں دنیا ہی نرالی دیکھی۔ نتیجہ یہ کہ :ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

حرارت و اضطراب، تڑپ اور سیمابیت کی جگہ کیف و خمار، آسودگی و تن آسانی نے لے لی۔ اس دور کی شاعری پر نظر ڈالیے تو صاف نظر آ جائے گا کہ کہاں یہ کہ :-

اگر جز بکامِ من آید جواب
من و گرز و میدانِ افراسیاب

اور کہاں یہ کہ :-

حدیثِ مے و مطرب گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

ہندوستان میں اول تو سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ہی لیکن بالخصوص غدر کے بعد اردو شاعری پر یہ دورِ یاس و قنوط چھا گیا اور خوب اچھی طرح سے چھا گیا۔ شعر کی انتہائی خوبی یہ قرار دی گئی کہ اس میں سوز و گداز ہو، افسردگی ہو، یاس ہو، موت ہو۔ بلکہ موت کے بعد بھی کوئی تڑپ، کوئی حرکت نہ ہو۔ کامل سکوت اور بے حسی ہو غرضیکہ واہ واہ کی جگہ، ہائے ہائے ہو۔ محفل میں چاروں طرف ایک کہرام مچ رہا ہو اور بزمِ مشاعرہ پر ماتم کدہ کا گمان گزرے۔ اس دور کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے واضح ہو جائے گا کہ جن شعراء کو اساتذۂ فن کے زمرہ میں اولین صف میں جگہ دی جاتی ہے۔ ان کا طرۂ امتیاز یہی افسردگی و یاس کا فلسفہ ہے۔ کسی ایسے شاعر کا دیوان اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہی رنگ نظر آئے گا۔ دو چار شعر ملاحظہ ہوں :-

اب تو یہ چاہتا ہوں کہ، اے انتہائے غم
آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

عالم کی فضا پوچھو، محرومِ تمنا سے — بیٹھا ہوا دنیا میں، اُٹھ جائے جو دنیا سے

کیا ہنسے انسان اور کیا رو سکے — جی ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

میرے دم پر جو گزر رہی ہے گزر جانے دو — قصۂ غم نہ بڑھاؤ مجھے مر جانے دو

تمہید ہے خزاں کی یہ ہنگامۂ بہار — اچھا ہے میرا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پہ ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

دلِ مایوس میں اُمید نے لی اس طرح کروٹ — اُبھر کر کوئی سطحِ آب پر گویا حباب آیا

کیا کروں شرحِ خستہ جانی کی — ہم نے مر مر کے زندگانی کی

صبا شکستہ پروں کی دعائیں لیتی جا — جھکا دے اور ذرا شاخ آشیانے کی

فنا سے پہلے غمِ دل کی انتہا معلوم — مگر یہ دل بھی مٹے گا کبھی یہ کیا معلوم

غم ایک ہی ایسا ہے جو دنیا کو بھلا دے — غم کیا ہے یہ نعمت ہے مگر جس کو خدا دے

پوچھا اثر سے میں نے جو دل کا معاملہ! — اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا

مجبوری و بے بسی ملاحظہ ہو:-

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے   قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

غرضیکہ کہاں تک لکھتے جایئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صف ماتم بچھ رہی ہے۔ جس پہ دنیا و مافیہا کی نوحہ خوانی ہو رہی ہے۔ اور تو اور جو چیزیں کبھی حصول سرور و انبساط کی غرض سے اختراع کی گئی تھیں، ان سے بھی مقصود حزن و غم ہی لیا جاتا ہے۔ شراب تک کی بھی خواہش محض اس لئے رہ گئی کہ ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے۔ اور ہمارے اس "موروثی ذوق ماتم کدہ" کا اندازہ آج بھی اس سے لگ سکتا ہے کہ موسیقی جیسی طرب انگیز اور گرما دینے والی چیز بھی اس وقت تک محظوظ نہیں کر سکتی جب تک اس میں نغمہ ہائے جانگداز اور "سوز" کی سریں نہ ہوں۔

غرضیکہ افسردگی و غنودگی کا یہ عالم مسلمانان ہند پہ چھا رہا تھا۔ اور لطف یہ کہ اس کا نام "تہذیب و اخلاق" رکھ چھوڑا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انحطاط و زوال کے وقت خدا کے بندے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُمت مرحومہ میں تو ایسے ایسے صاحبان فکر و بصیرت پیدا ہوتے ہیں جو بنی اسرائیل کے انبیاء کرام کے سے کام کر کے دکھانے ہیں (حدیث شریف[1]) چنانچہ شعراء میں حالی مرحوم نے اس کا احساس کیا۔ قوم پر بڑی لے دے کی۔ ہر چند دل میں بڑا درد تھا۔ لیکن صدیوں کے نشہ کو چند "طعنوں" سے اُتارنا مشکل تھا۔ اکبر مرحوم بھی جب دل کی ٹیس سے مجبور ہوئے تو مریض کو ہوش میں لانے کے لئے کچوکے دیئے اور حقیقت یہ ہے کہ خوب دیئے اور ہنسا ہنسا کر، گدگدا گدگدا کر ایسی ایسی پتے کی کہہ گئے کہ جو تن لاگے سو تن جانے۔ لیکن مرض کی کہنگی اور مریض کی ضد سے وہاں بھی یاس کا پہلو غالب رہا۔

لیکن قدرت کاملہ نے "بانگ درا" کی خدمت کسی اور کے حصہ میں رکھی تھی۔ وقت آیا اور وہ ہستی پنجاب کے ایک "اقبال" کے نام سے منصۂ شہود پر جلوہ فگن ہوئی۔ اس کی چشم حقیقت بیں نے واقعات کو چھوڑ کر ان کے علل و اسباب پر غور کیا۔ اور اس رموز شناس فطرت نے خوب محسوس کیا کہ فقدان عمل، بے حسی اور مُردہ دلی کا سبب یہ ہے کہ سینوں میں دل اور دلوں میں آرزوئیں اور اُمنگیں، جوش و ولولے پیدا کرنے والی حرارت موجود نہیں۔ آتش دان ہیں، لیکن افسردہ اور ٹھٹھرے ہوئے اور علت مرض یہ ہے کہ قوم اپنی حقیقت سے بے خبر ہو چکی ہے

---

[1] اس حدیث کی صحت بھی مشکوک ہے۔

افرادِ ملت کا نظریۂ حیات متشائم ہو چکا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ انہیں ان کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں ممکناتِ زندگی کی وسعتوں سے روشناس کرایا جائے۔ اور مثنوی کے تمثیلی شیر کی طرح جو ایک عرصہ تک بھیڑ طول کے گلہ میں پرورش پا کر اپنے آپ کو بھیڑ ہی شمار کرنے لگا تھا، کسی آئینہ میں اسے اس کے اصلی خط و خال سے واقف کرا دیا جائے۔ ایک حقیقت بیں نباض کی طرح اس نے علتِ مرض دریافت کی اور بہترین معالج کی طرح اس کے لئے نسخے تجویز کئے اور ہر چند مرض مزمن اور مریض ضدی۔ اور ضدی بھی ایسا کہ خود درد کو دوا سمجھنے لگ گیا تھا۔ لیکن اس کی پیشانی پر شکن تک نہیں آیا۔ اس نے طبائع کی کمزوریوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ ان کے حال زبوں پر رحم کھایا اور مشفقانہ طور پر گرے ہوئے کو اٹھایا اور اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

سب سے پہلے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ اس نے زندگی کی درخشندہ و تابناک تصویر، جس پر صدیوں سے یاس و مُردہ دلی کا گرد و غبار پڑ رہا تھا، کس طرح اپنے اصلی خط و خال میں پیش کی۔ ہر چند علامہ ممدوح کا سارا کلام انہیں رموز و حقائق سے لبریز ہے۔ لیکن مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں:۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور وسعت ملاحظہ فرمائیں:۔

وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کو زمیں سے آسماں تک ہے

شبِ معراج سے یہ سبق اخذ فرماتے ہیں کہ:۔

کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات
رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں

اس کے "دست و بازو" کو یہ مادیات تک ہی محدود نہیں گردانتے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ارشاد ہے:۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا　　نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دامِ تسخیر کی وسعت اور ملاحظہ فرمائیے:۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

وہ "حیاتِ جاوداں کو" زندگی کی چار دیواری تک محصور نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک:۔

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں　　ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

جب حضرتِ انسان کی ممکناتِ زندگی کی یہ وسعتیں ہوں، تو اسے کیوں نہ یہ درسِ حیات دیا جائے کہ:۔

اے ز آدابِ امانت بے خبر　　از دو عالم خویش را بہتر شمر
تا کجا خود را شماری ما و طین　　از گلِ خود شعلۂ طور آفریں

یاد رکھیے:۔

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد
نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد

اور یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ:۔

ولے ایں راز جز من کس نداند　　ضمیرِ خاک و خوم بے چگوں است

انتہا یہ ہے کہ:۔

قدم در جستجوئے آدمے زن　　خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اس سے زیادہ اور کیا قیمت ہو سکتی ہے کہ خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست۔ اللہ اکبر۔ یہ قدر و قیمت!

ہاں! اور چلتے چلتے ذرا اس معرکۃ الآرا۔ زندہ جاوید نظم کے دو چار شعر بھی سنتے جائیے۔ جس کا عنوان ہی اس پیامبرِ حیات نے "زندگی" رکھا ہے۔ دیکھیے اور غور فرمائیے کہ کیا یہ ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔

زندگی کی بقا، ملاحظہ فرمائیے:۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں، پیہم دواں۔ ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے

پھر اس کے اثرات ملاحظہ فرمائیے:۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

ممکناتِ زندگی کے ساتھ ساتھ متاعِ دنیا کے تمتع اور تسخیرِ قوائے نظامِ عالم کا درس بھی ضروری تھا۔ کیونکہ متشائم فلسفۂ حیات نے متاعِ دنیا کو حرام سمجھ رکھا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ
عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را
دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد
جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
نائبِ حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکمِ او محکم شود
دست رنگیں کن ز خونِ کوہسار
جوئے آب گوہر از دریا برار
جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن
غنچۂ از خود چمن تعمیر کن
شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن

یعنی عناصرِ عالم کے سامنے سرنیوڑھا کر، ہاتھ باندھ کر اطاعت کے لئے کھڑا نہ ہو جا۔ بلکہ ان سے خدمت لے۔ انہیں تابعِ فرمان بنا اور متاعِ دنیا سے پورا پورا فائدہ اٹھا۔

حقیقت سے آگاہی کا لازمی نتیجہ تھا کہ قوم کو اپنی بے حسی اور جمود و سکوت کا احساس پیدا ہوتا۔ چنانچہ جب دیکھا کہ قلبِ ملت میں خوابیدہ حیات کی بیداری کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں۔ عروقِ مردہ میں خونِ زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، تو تخلیقِ آرزو (یا کم از کم تجدیدِ آرزو) کی ضرورت پڑی۔ کیونکہ جب ایک طرف متاعِ حیات کی قدر و قیمت اور دوسری طرف اپنی قوتِ بازو کا احساس پیدا ہو گیا تو جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے آرزوؤں کا پیدا ہونا اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ لہٰذا آرزو کی اہمیت مختلف پیرایوں میں واضح کی گئی اور میں کہوں گا کہ یہی چیز علامہ ممدوح کا حقیقی پیغام ہے۔ پہلی منزل کو اس کا مقدمہ سمجھنا چاہئے اور قوتِ عمل کو اس کا نتیجہ۔ یہی جوہر تھا جس کے فقدان سے قوم پر مردہ دلی اور بے حسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں

اور اس کی تخلیق یا رجعت اس مرض کا علاج تھا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ کس جوش اور ولولے سے اُمّید دل کی بستی از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے للکار کر یہ پیغام سنایا کہ :-

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

دیکھئے اس ایک شعر کے اندر کس قدر سربستہ رازِ حیات پوشیدہ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سارے فلسفہ حیات کا نچوڑ اس پیغام کے اندر موجود ہے۔ آرزو سے خالی دل کی کچھ قدر و قیمت ان کے نزدیک نہیں ہے۔ فرماتے ہیں :-

اگر ز رمزِ حیات آگہی بجوئے مگیر دلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است

مثنوی اسرار و رموز میں جس میں علامہ ممدوح کا حقیقی معنوں میں مکمل پیغامِ حیات محفوظ ہے اور اس کے بعد کا کلام اسی کلام کی تفسیر و تشریح۔ مسئلہ آرزو پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے اور مختلف انداز سے اس کی اہمیت پر زور ڈالا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :-

زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار!
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را خضر باشد موسیٔ ادراک را
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات
چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند شہپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی! موجِ بے تابے ز دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند دفترِ افعال را شیرازہ بند
زندہ را، نفیِ تمنا مردہ کرد شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

گرم خون انساں ز داغ آرزو — آتش ایں خاک از چراغ آرزو
از تمنا مے بجام آمد حباب — گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمونِ تسخیر است و بس — آرزو افسونِ تسخیر است و بس
زندگی صید، افگن و دام آرزو — حسن را از عشق پیغام آرزو

ایک جگہ یاس و حزن و خوف کو اُمّ الخبائث و قاطعِ حیات قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

مرگ را ساماں ز قطع آرزوست — زندگانی محکم از لاتقنطوست
تا اُمید از آرزوئے پیہم است — نا اُمیدی زندگانی را سم است
زندگی را یاس خواب آور بود — ایں دلیل سستی عنصر بود
از دمش میرد قوائے زندگی — خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

یاس و نا اُمیدی فی الحقیقت ان کے پاس تک نہیں پھٹکتی، سخت سے سخت مصیبت میں بھی سر رشتۂ اُمید ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتے۔ فرماتے ہیں :-

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے — ہے بھروسا اپنی ملّت کے مقدر پر مجھے

اور :-

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار — فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

ریاضِ ملّت پر خزاں مسلط ہو چکی ہے۔ بادِ سموم کے جھونکوں نے ہرے بھرے درختوں کو خشک کر دیا ہے۔ برگ و گل مرجھا مرجھا کر گر پڑے ہیں۔ ایک آدھ پتا کہیں کہیں مثل چہرۂ مدقوق زرد نظر آتا ہے۔ یاس و قنوط کے اس اندوہناک سماں میں کیسے اُمید ہو سکتی ہے کہ یہ اُجڑا چمن پھر بھی آباد ہوگا۔ لیکن ہمارا اُمیدوں کا شہزادہ ہے کہ اب بھی متشائم نظریہ کو پاس تک نہیں آنے دیتا اور چپکے سے آ کر یہ درسِ حیات دیتا ہے کہ :-

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

اس مضمون کو مثنوی میں اس طرح فرمایا ہے :-

برگِ سبزے کز نہالِ خویش ریخت — از بہاراں تارِ اُمیدش گسیخت
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار — از شجر مگسل باُمیدِ بہار

اُمید — اُمید — اور ہر حالت میں اُمید - کبھی مایوسی نہیں - کبھی افسردگی نہیں۔ پھر
اس گلچینِ بہار میں وسعتِ داماں ملاحظہ فرمایئے :۔

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری — وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے :۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اُمید و آرزو کا ایسا متغادل فلسفۂ حیات کم ہی کسی کے ہاں ملے گا۔

اب جبکہ آرزوئیں پیدا ہو گئیں۔ اُمیدیں وابستہ ہو گئیں۔ نا اُمیدی کا چھلاوا غائب ہو گیا۔ حُزن و ملال کا بوجھ دل سے ہلکا ہُوا تو حصولِ مُدعا کے لئے فطری طور پر دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی۔ یہاں پہنچ کر اب یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ یاد رکھو، کامیابی و کامرانی، فتح و نصرت کا راز عمل اور قوت میں پوشیدہ ہے اور آرزو بغیر عمل کے بالکل مہمل چیز ہے۔ چنانچہ یہ رازِ سربستہ کھول کر سامنے رکھ دیا کہ :۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مثنوی میں فرماتے ہیں :۔

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات

قوت کی اہمیت کے متعلق ذیل کے دو مصرعوں میں جن دو حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بھی مضمون سما نہ سکتا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے :۔

زندگی کشت است و حاصل قوت است — شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

یہ وہ معارف و حقائق ہیں جو کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ ملل و اقوامِ عالم کی تاریخ۔ اور خود دورِ حاضرہ کے روزانہ مشاہدات اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

جب اپنی حقیقت سے آگہی۔ دل میں آرزو اور جوشِ عمل اور بازو میں قوت پیدا ہو گئی تو ایک ایسا معیارِ حیات مقرر کر دیا جس سے زندگی کی خامیاں دُور ہو کر اس میں پختگی پیدا ہو جائے اور زندگی اس درجہ محکم و استوار ہو جائے کہ بڑے سے بڑا خطرہ اور مہیب سے مہیب حادثہ اس میں تزلزل نہ پیدا کر سکے۔ اس مقام پر قرآن حکیم نے فرمایا کہ : وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ .... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ

راجِعُونَ ؕ ۲/۱۵۵ ۔ کہ "دنیا میں تمہارے اوپر مختلف قسم کی آزمائشیں آئیں گی ۔ منجملہ ان کے خوف وحزن، بھوک پیاس نقصِ مال وجان وغیرہ ہوں گی ۔ پس فتح وکامرانی کی خوشخبری ان کے لئے ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہمت واستقلال سے کام لیتے ہیں اور بے باکانہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری زندگی اور موت ، رنج وغم ، سود وزیاں جو کچھ بھی ہے ، سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے"۔

چنانچہ ایک ایسی ہی زندگی کا نقشہ علامہ ممدوح نے پیش کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :-

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است　　سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں :-

مرا صاحبدلے این نکتہ آموخت　　ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

بے باک زندگی کے متعلق فرماتے ہیں :-

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است　　دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است　　اگر ترسی بہ ہر موجش نہنگ است

پوچھا گیا کہ رازِ حیات کس چیز میں ہے ۔ جواب سن لیجئے :-

رفیقش گفت اے یارِ خردمند　　اگر خواہی حیات اندر خطر زی
خطر تاب و توان را امتحان است　　عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

لالۂ طور میں فرماتے ہیں :-

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت　　شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی　　بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں :-

بدریا غلط و با موجش در آویز　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

آپ نے غالباً یہ تعلیم بھی سنی ہو گی :-

بدریا در منافع بے شمار است　　وگر خواہی سلامت برکنار است

اب ذرا اوپر کے شعر کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیے :-

خیال کن تو کجائی و ما کجا واعظ

دوسروں کے آسرے پر زندگی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :-

مرا از شکستن چنیں عار ناید　　که از دیگراں خواستن مومیائی

اسی طرح :-

نفس دارد ولیکن جاں ندارد　　کسے کو بر مراد دیگراں زیست

یہ شعر تو یقیناً آج ہر مسجد کے محراب پر کندہ کروا دینا چاہیے اور اس کے قطعات ہر مکان اور ہر دکان میں آویزاں ہونے چاہئیں۔

بخود خزیده و محکم چو کوہساراں زی!
چو خس مزی که هوا تیز و شعله بیباک است

اللہ اکبر۔ کس قدر "زندگی" ہے اس پیغام کے اندر۔
پھر جب زندگی اس قالب میں ڈھل جائے۔ قوم کی قوم اس رنگ میں رنگی جائے تو امیدوں کی جیتی دنیا کا تخیل کس جنت ارضی کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ سن لیجئے :-

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے　　زمین از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے

یہ ہے مختصر اً پیغام حیات ہمارے متفادل رموز شناس فطرت شاعر کا۔ جس نے فی الواقعہ مسیحا کا کام کیا ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ قوم کی حالت بدلنے کے لئے پہلے افراد ملت کی ذہنیت بدلنی ضروری ہوتی ہے تو بلا خوف تردید کہا جائے گا کہ آج تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اگر کچھ زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ تو یہ علامہ ممدوح مدظلہ العالی کے پیام حیات بخش کے رہین منت ہیں۔ آج اگر ان اثرات کی ابتدا ہے۔ تو کل بعونہٖ تعالےٰ یہ شجر طیب اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء بن کر بڑھے پھولے گا اور اسلام کی حیات جدیدہ میں علامہ موصوف کا نام درخشندہ ستارے کی طرح تابناک رہے گا۔

اے کاش مُردوں کی یادگاریں قائم کرنے والی قوم اپنے زندہ افراد کی قدر کرنا بھی سیکھے!

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

پرویز

تحریر کردہ ۱۹۳۲ء برائے اقبال نمبر ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ اور ختمِ نبوّتؐ

(بتقریب یومِ اقبالؒ اپریل ۱۹۷۵ء)

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلامُ علیکم!

اِس سال یومِ اقبالؒ کی تقریب کے لیئے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے، میرے نزدیک حالات کی مناسبت سے وہ نہایت موزوں ہے۔ ایک تو اس لیئے کہ ختمِ نبوّت دین کی اساس و بنیاد ہے اور دوسرے اس بنا پر کہ علاّمہ اقبالؒ نے جس طرح پاکستان کا تصوّر دے کر مسلمانانِ ہند کی جدّوجہدِ آزادی کے لیئے ایک نصب العین متعیّن کر دیا، اسی طرح انہوں نے عقیدۂ ختمِ نبوّت کی اہمیّت اور عظمت کی وضاحت سے اس تحریک کو بھی نشانِ منزل عطا کر دیا۔ حضرتِ علاّمہ کے یہ اتنے بڑے احسانات ہیں کہ ان کی یاد قائم رکھنا قوم کا ملّی فریضہ ہے، اس لیئے بھی کہ خود اس کی دینی زندگی کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

آجکل اس افتراء کو فضا میں عام کیا جا رہا ہے کہ علاّمہ اقبالؒ مرزا غلام احمد کے دعویٰ کی صداقت کے قائل تھے اور ان کی جماعت کی حقانیت کے معترف۔ "احمدی" حضرات کا یہ عام شعار ہے کہ یہ تلبیس سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے امام (مرزا غلام احمد) کی تحریروں سے چُن چُن کر وہ عبارتیں پیش کریں گے جن میں مرزا صاحب نے، اپنی زندگی کے ابتدائی دَور میں مسلمانوں جیسے عقائد و نظریات کی تلقین کی تھی اور ان کی انبار در انبار اُن تحریروں کو کبھی سامنے نہیں لائیں گے جن کی رُو سے انہوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور تمام مسلمانوں کو خارج از اسلام قرار دے کر اپنی الگ اُمّت کی تشکیل کی تھی۔ علاّمہ اقبالؒ نے ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک تقریر کی تھی جس کا اُردو ترجمہ "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے، ٹھیٹھ

اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے۔ اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوُا ہے جسے فرقۂ قادیانی کہتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کا اظہارِ حقیقت

"احمدی" حضرات اِس اقتباس کو ہر جگہ اُچھالتے پھرتے ہیں اور اسے اپنے امام کے دعویٰ کی صداقت کے لیئے بطورِ سند پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ نہیں بتاتے کہ خود علامہ اقبالؒ نے اِس عبارت کے متعلق کیا کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:

جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے (یعنی ۱۹۳۵ء سے) ربع صدی پیشتر مجھے اِس تحریک سے اچھے نتائج کی اُمید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانیٔ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، کتاب "براہینِ احمدیہ" میں بیش قیمت مدد پہنچائی۔ لیکن مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیئے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیٔ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے۔ معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوُا تھا جب ایک نئی نبوت ـــ بانیٔ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوّت ـــ کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سُنا۔ درخت جڑ سے نہیں، پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویّہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن اپنے آپ کو صرف پتھر جھٹلا نہیں سکتے۔

(احمدیت اور اسلام)

مفکرین کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ جوں جوں ان کے معاملہ میں وسعت اور فکر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے، وہ اپنے سابقہ خیالات پر نظر ثانی کرکے ان میں تبدیلی . . . کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو صرف خاصۂ نبوت ہے کہ اس کا پیغام روزِ اوّل سے آخری دن تک یکساں اور واحد رہتا ہے۔ یہ اس لیئے کہ اس پیغام کا سرچشمہ علم خداوندی ہوتا ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء اور ہرآن بدلنے والے احوال و کوائف کی اثر پذیری سے منزّہ و معرّا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی تقریر کے متعلق جو وضاحت کی ہے، اس کے علاوہ خود "احمدی" حضرات کے ہاں سے بھی ایسی شہادت ملتی ہے جس کی رُو سے ان حضرات کا یہ دعویٰ کہ علامہ اقبالؒ بھی قادیانیت کی صداقت کے معترف تھے، پاش پاش ہو جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیر احمد نے "سیرت المہدی" کے عنوان سے اپنے والد کے سوانح حیات قلمبند اور شائع کئے ہیں۔ وہ اس میں لکھتے ہیں کہ:-

> ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا . . . . . شیخ نور محمد صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریر پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبالؒ اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود کے معتقد تھے۔ چونکہ سر محمد اقبالؒ کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس لیئے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبالؒ کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ . . . . آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ مرحوم کے نام گیا جس میں لکھا گیا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں . . . . . ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری ایام میں احمدیت کے شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر اقبالؒ کا مخالفانہ پروپیگنڈہ تھا۔
>
> (سیرت المہدی۔ جلد سوم صفحہ ۲۴۹۔ طبع اول اپریل ۱۹۳۹ء)

میں ان بیانات کے تنقیدی جائزہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ "احمدی" حضرت علامہ اقبالؒ

کی تقریر کے ایک فقرہ کو تو اُچھالتے پھرتے ہیں لیکن نہ ان کی طرف سے پیش کردہ وضاحت کا کبھی ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی خود مرزا صاحب کے صاحبزادہ کی اس شہادت کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ہے ان کے تلبیسی پراپیگنڈے کے انداز کی ایک مثال۔

علامہ اقبالؒ کی طرف سے تحریکِ "احمدیت" کی اس (بقول مرزا بشیر احمد) زہر آلود مخالفت کی ابتدا ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ اور یہیں سے میں بھی اس داستان کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کی تمہید کے طور پر ایک اور واقعہ کا پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسے پیش کرتے وقت مجھے کچھ جھجک سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ ذکر علامہ اقبالؒ کا ہو رہا ہے اور اس واقعہ کا تعلق خود میری اپنی ذات سے ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا اس جھجک پر غالب آجاتا ہے اور اس جرأت کا کفارہ بن جاتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے

بہاول پور کا مقدمہ

کہ سابق ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسلک اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتد ہو گیا ہے۔ اس لیئے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس لیئے نہیں کہ اس میں فریقین کی حیثیت بڑی ممتاز تھی۔ وہ تو بالکل غیر معروف سے تھے۔ یہ اس لیئے کہ (غیر منقسم) ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسلک اختیار کرنے کے بعد مسلمان رہتا ہے یا نہیں؟ اس اعتبار سے یہ متعلقہ فریقین کا مابہ النزاع معاملہ نہ رہا بلکہ قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے مابین ایک دینی سوال بن گیا جس کا عدالتی فیصلہ، ظاہر ہے کہ، بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ مقدمہ قریباً نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخرالامر محمدؐ اکبر صاحب ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے (جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں) ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو اس کا فیصلہ سُنا دیا۔ یہ فیصلہ اپنی شہرت اور اہمیت کے پیشِ نظر اس زمانے میں بھی الگ چھپ گیا تھا اور اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ میرے سامنے اس وقت اس کا وہ نسخہ ہے جسے جون ۱۹۷۳ء میں "محفلِ ارشادیہ، سیالکوٹ" نے شائع کیا اور جو اَب عام طور پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس فیصلہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مدعیہ کی طرف سے بڑے بڑے جید علمائے کرام بطورِ گواہ پیش ہوئے۔ مثلاً مولانا غلام محمدؐ صاحب شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور۔ مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور۔ مولانا محمدؐ شفیع صاحب مفتی دار العلوم دیوبند۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری اور مولانا سید انور شاہ صاحب شیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند[1] وغیرہم۔ اس سے اس معاملہ کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کسے کہتے ہیں؟ لیکن (انہوں نے کہا کہ) مشکل یہ ہے کہ:

"موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں۔ اس لیئے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کر سکتا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر چیخ و پکار کی جارہی ہے۔ اس لیئے ضروری ہے کہ اس کی کچھ تھوڑی سی حقیقت بیان کردی جائے۔ مدعیہ کی طرف سے نبی کی کوئی تعریف نہیں بیان کی گئی۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے اور نبی کے لیئے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ فریق ثانی نے بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ احکام شریعت کی تبلیغ کے لیے بھیجتا ہے، برخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے۔ کتاب لائے نہ لائے۔ رسول کے لیئے کتاب لانا شرط ہے۔ اسی طرح رسول کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو صاحب کتاب ہو یا سابقہ شریعت کے بعض احکام کو منسوخ کردے۔" (فیصلہ صفحہ ۱۰۷ ــ ۱۰۶)

اس کے بعد فاضل جج نے لکھا:

"یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی نہ تھیں، اس لیئے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی جامع تعریف مل جائے جو تصریحاتِ قرآنی کی رُو سے تمام لوازمِ نبوت پر حاوی ہو۔" (صفحہ ۱۰۷)

اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ انہوں نے اس باب میں کافی جستجو کی۔ لیکن نبی کی کوئی جامع تعریف انہیں نہ مل سکی۔

"آخرکار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان "میکانکی اسلام" از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہبِ اسلام کے متعلق آجکل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں

---

[1] ان کا نام زبان پر آتے ہی، ان کے علم و تقویٰ کے احساس سے نگاہیں ان کے احترام میں جُھک جاتی ہیں۔

نبوّت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی[1]۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں (صفحہ نمبر ۱۰۷)

ازاں بعد انہوں نے میرے اس مضمون سے، خاصہ مفصّل اقتباس درج کیا اور نبی کی جو تعریف میں نے پیش کی تھی اس پر مبنی بحث کے بعد اپنے فیصلہ میں کہا:

> مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخِ ارتدادِ مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔ (صفحہ ۱۸۲)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس مقدمہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے جید علمائے کرام پیش ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن فاضل جج حقیقتِ نبوّت کے متعلق ان میں سے کسی کے بیان سے بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ وہ مطمئن ہوئے تو میرے ایک ایسے مضمون سے جو اس مقدمہ سے بالکل الگ آزادانہ لکھا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ میرے مضمون کی وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ اس قدر اطمینان بخش اور قولِ فیصل ثابت ہوگا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ میں نے مقامِ نبوّت کی وضاحت قرآن کریم کی روشنی میں کی تھی اور خارج از قرآن بحثوں کو اس میں دخیل نہیں ہونے دیا تھا۔ یہی مسلک علّامہ اقبالؒ کا بھی تھا۔ اور میرے دل میں ان کے احترام کی بنیاد بھی یہی ہے۔ انہوں نے اپنی سب سے پہلی تصنیف —— اسرار و رموز کے آخر میں بحضورِ رحمۃ اللعالمین ایک عرضداشت پیش کی ہے جس میں وہ بصد سوز و گداز کہتے ہیں ؎

اقبالؒ اور قرآن

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ... ور بحرفم غیرِ قرآن مضمر است

تو

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ... ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

اور انتہا یہ کہ :۔

---

[1] یہ اُس شخص کے متعلق "عدالتی سند" ہے جس کے خلاف "منکرِ رسالت" ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور ایسا کہنے والے نہ کوئی جھجک محسوس کرتے ہیں، نہ ندامت۔ (طلوعِ اسلام)

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اس کے برعکس

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اور اس کے بعد بھی وہ تمام عمر مسلمانوں سے یہی کہتے رہے کہ:-

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

ختمِ نبوّت کی ماہیّت

ختمِ نبوّت کی حقیقت و ماہیت کو سمجھنے کے لیئے ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ نبوت کہتے کسے ہیں۔ یہ موضوع بڑی فرصت چاہتا ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں۔ لیکن بایں ہمہ میں چند الفاظ میں اس کا ملخص پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انسان، عقل و فکر، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ ذرائع علم ہر شخص کے لیئے کُھلے ہوتے ہیں۔ اس لیئے جو شخص بھی چاہے اپنی صلاحیّت اور محنت کے مطابق اکتسابِ علم کر سکتا ہے۔ لیکن علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جس میں انسان کی اپنی عقل و فکر اور سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ علم خدا کے ایک برگزیدہ بندے کو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا تھا۔ اس کی کیفیّت یہ تھی کہ جس منتخب ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا اسے اس سے ایک دن پہلے تک بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ اس علم کو وحیٔ خداوندی یا منزل من اللہ کہا جاتا تھا اور جس برگزیدہ ہستی کو یہ وحی عطا ہوتی تھی اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا۔ اس کی وحی کو خدا کی طرف سے عطا کردہ کتاب سے بھی تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ ہر نبی کو خدا کی طرف سے کتاب ملتی تھی۔ نبی اور رسول میں یہ فرق کہ رسول وہ ہوتا تھا جسے کتاب ملتی تھی اور نبی بلا کتاب آتا تھا، قرآنِ کریم کی تعلیم سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآنِ کریم نے انبیاء اور رسل دونوں کے متعلق کہا ہے کہ انہیں کتاب دی جاتی تھی۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ ۪ وَ اَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ ..... (۲/۲۱۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کو کتاب دی۔ دوسری جگہ سورۂ حدید میں ہے کہ :-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۵۷/۲۵)

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام رسولوںؑ کو کتاب ملی۔ ان آیات (اور انہی جیسی متعدد دیگر آیات) سے واضح ہے کہ ہر نبیؑ اور ہر رسولؑ کو خدا کی طرف سے کتاب ملتی تھی اور "احمدیوں" کا یہ کہنا کہ نبیؑ بلا کتاب آتا تھا۔ قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ نبیؑ اور رسولؑ بھی الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک ہی ہستی کی دو خصوصیات تھیں۔ یوں کہیئے کہ خدا کی طرف سے وحی پانے کی حیثیت سے اسے نبی کہا جاتا تھا اور اس وحی کو دوسروں تک پہنچانے کی حیثیت سے رسول۔ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے تھے۔

خدا کی طرف سے وحی یا کتاب نازل ہونے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تاآنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ زمانہ آگیا جب یہ سمجھا گیا کہ انسانی راہنمائی کے لیئے جو کچھ خدا کی طرف سے دیا جانا مقصود و مطلوب ہے اسے نہایت واضح اور مکمل حیثیت سے آخری مرتبہ دے دیا جائے۔ چنانچہ یہ آخری وحی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ۔

وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (۶/۱۱۵)

"خدا کو جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، جو کلام ان سے کرنا تھا، جو باتیں ان سے کرنی تھیں اس کتاب میں انہیں مکمل طور پر دے دیا گیا ہے۔ ان میں اب کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی یہ ضمانت بھی دے دی کہ :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

"ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں"۔ اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ وحی تو خدا کی طرف سے انسانوں کے لیئے راہنمائی کی خاطر آتی تھی۔ جب وہ راہنمائی مکمل اور غیر متبدل طور پر دے دی گئی اور قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا تو پھر وحی کی ضرورت کیا باقی رہی اور جب وحی کی ضرورت ہی نہ رہی تو پھر کسی نبی یا رسول کے آنے کا مقصد کیا! اسی حقیقت کو ختمِ نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ نظریہ اس قدر صاف، واضح اور مسلّم تھا کہ مسلمانوں کو اس باب میں نہ کبھی کوئی شک گزرا، نہ الجھن پیدا ہوئی۔ امام اعظمؒ کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے سچا ہونے کی نشانیاں دکھلانے کے لیئے مہلت چاہی۔ امام صاحب نے سنا تو فرمایا کہ جس شخص نے اس مدعیٔ نبوت سے کوئی علامت بھی طلب کی وہ بھی کافر ہو جائے

گا کیونکہ اس سے مترشح ہو گا کہ اسے نبی اکرمؐ کے آخری نبی ہونے کی بابت تردد ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ ختمِ نبوت کا عقیدہ مسلمانوں میں کس قدر مسلّم اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ ختمِ نبوت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اب انسان اس راہنمائی کی روشنی میں جسے قندیلِ قرآنی میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اپنے معاملات کا حل آپ دریافت کرے۔ واضح رہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان کو اب وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ تنہا اپنی عقل و فکر کی رُو سے اپنے معاملات حل کر سکتا ہے۔ ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ انسانی عقل اسی طرح وحی کی محتاج ہے جس طرح انسانی آنکھ سورج کی روشنی کی محتاج۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر (بالخصوص اپنے خطبات میں) بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ وحی کی روشنی میں انسانی معاملات کا حل انفرادی طور پر نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہ ایک اجتماعی نظام کی رُو سے ہو گا جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے۔ مزید سمجھنے کے لئے اسے قرآنی نظامِ مملکت کہہ لیجئے۔ یعنی مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت جس میں تمام کاروبار قرآنِ کریم کے عطا کردہ اصول و اقدار و قوانین کے تابع رہ کر سرانجام دیا جائے۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں جسے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔

یہ سیاسی تحریک تھی

مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے ایک مذہبی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کیا تاکہ مسلمان اسی اُلجھاؤ میں رہیں اور اس مقصد اور غایت کی طرف ان کی نگاہ ہی نہ اُٹھنے پائے جس کے لئے یہ سارا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ تحریکِ "احمدیت" مذہبی تحریک ہے ہی نہیں۔ یہ ایک خالصتہً سیاسی تحریک ہے جسے انگریزوں کے حکومتی مصالح نے پیدا کیا ہے اور جسے عوام کو دھوکہ دینے کے لئے مذہبی نقاب اوڑھا دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی تو اس کے خلاف انہیں سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی طرف سے تھا۔ سیاسی طور پر تو اس لئے کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے سلطنت چھینی تھی اور مذہبی سطح پر اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھا کہ مسلمان غیر مسلموں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرنا خلافِ اسلام سمجھتے تھے اور ایسی حکومت کے خلاف جہاد کرنا اپنا دینی فریضہ۔ آپ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب (THE INDIAN MUSALMANS) اُٹھا کر دیکھئے۔ اس نے اس حقیقت کو بڑے واشگاف

الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اسی دینی جذبہ کے ماتحت حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے تحریک جہاد شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تہ میں بھی اُسے یہی جراثیم کارفرما نظر آتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہابی تحریک کو بھی وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی بیان کرتا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کے دین فروش علماء سے اس قسم کے فتاویٰ بھی حاصل کر لئے جن میں کہا گیا کہ انگریزوں کی اطاعت فرض ہے اور ان کے خلاف جہاد حرام۔ لیکن مسلمانوں پر ان فتاویٰ کا چنداں اثر نہ ہوا۔ ہمارے علماء کے فتاویٰ عام طور پر اپنی اثر انگیزی کھو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں برطانوی سیاستدان اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان صرف وحی سے متأثر ہو سکتا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں یہ بتایا جائے کہ ان پر خود خدا نے حکومتِ برطانیہ کی اطاعت فرض قرار دی ہے اور اس نے جہاد کو منسوخ اور حرام قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ پردہ جسے علامہ اقبالؔ نے ۱۹۳۵ء میں یہ کہہ کر اٹھایا کہ:

> مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں "احمدیت" کا مؤقف ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

(احمدیت اور اسلام۔ بحوالہ ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت" پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۹۴)

اس تشریح میں انہوں نے کہا کہ:

> مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے، صرف ایک چیز قطعی طور پر متأثر کر سکتی ہے یعنی وحی کی سند۔ لہٰذا راسخ عقائد کو مؤثر طریق پر جڑ بنیاد سے اکھیڑنے اور مذکورہ بالا سوالات میں جو دینی نظریات مضمر ہیں ان کی ایک ایسی نئی تفسیر و تعبیر کرنے کے لئے جو سیاسی طور پر مفید مطلب ہو، یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کی بنیاد وحی پر رکھی جائے یہ بنیاد "احمدیت" نے فراہم کر دی۔ خود "احمدیوں" کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انہوں نے سرانجام دی ہے۔ (احمدیت اور اسلام۔ انگریزی ایڈیشن صفحہ ۱۲۶)

میں نے اس اجمال کی تفصیل اپنی کتاب "ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں مرزا غلام احمد صاحب کی تحریروں کی روشنی میں پیش کی ہے۔ انہی میں سے چند ایک میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مرزا صاحب کی خاندانی خدمات

انگریزوں کو اس مقصد کیلئے جس قسم کی شخصیت کی ضرورت تھی اس کے لئے اپنے آپ کو بطورِ "امیدوار"

پیش کرتے ہوئے مرزا غلام احمد نے عرضداشت پیش کی کہ۔

میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا جن کو دربارِ گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسانِ پنجاب میں ہے اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکارِ انگریزی کو مدد دی تھی۔ یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانہ غدر کے وقت سرکارِ انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔ (کتاب البریہ۔ صفحہ نمبر ۳)

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

پھر میرے والد کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدماتِ سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموّ کی رہگذر پر مفسدوں کا سرکارِ انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکارِ انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک ہوئے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۵)

ان "خدماتِ جلیلہ" کی روشنی میں، مرزا صاحب اس منصب کے لیئے منتخب کر لیئے گئے اور انہوں نے ماموریت من اللہ ہونے کے دعاوی شروع کر دیئے۔ انہوں نے پہلی ہی جست میں اپنے نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق بتدریج اس مقام پر پہنچے۔ ملہم ربّانی، صاحب کشف و الہام۔ محدّث۔ مجدّد۔ مسیح موعود، ظلّی، بروزی، حلولی نبوت اور پھر آخر الامر مکمل نبوت اور رسالت۔ ایسا تدریجی پروگرام کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کی مصلحت خود انہی کی زبان سے سُنیئے۔ مرزا صاحب شروع میں عام مسلمانوں کی طرح یہی کہتے چلے آرہے تھے کہ قرآنِ مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو آیات آئی ہیں ان میں حضرت عیسیٰ سے مراد وہی پیغمبر ہیں جو رسول اللہ سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ لیکن بعد میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں اور ان آیات میں میرے ہی متعلق ذکر کیا گیا ہے۔ شروع کے بیانات اور اس دعویٰ میں اختلاف کیوں ہوا، اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

پیچ میں پھنسانے کے لئے

"یہ الہامات اگر میری طرف سے اس موقعہ پر ظاہر ہوتے جبکہ علماء مخالف ہو گئے تھے، تو وہ ہزارہا اعتراض کرتے۔ لیکن وہ ایسے موقعہ پر شائع کئے گئے جبکہ یہ علماء میرے موافق تھے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس قدر جوشوں کے، ان الہامات پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ ایک دفعہ ان کو قبول کر

چکے تھے اور سوچنے سے ظاہر ہوگا کہ میرے دعویٰ مسیح موعود ہونے کی بنیاد انہی الہامات سے پڑی ہے انہی میں خدا نے میرا نام عیسےٰ رکھا اور جو مسیح موعود کے حق میں آیتیں تھیں وہ میرے حق میں بیان کر دیں۔ اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی ان کو قبول نہ کرتے یہ خدا کی قدرت ہے کہ انہوں نے قبول کر لیا اور اس پیچ میں پھنس گئے۔" (اربعین نمبر ۲ - صفحہ ۲۱)

انگریزوں کی اطاعت

آپ نے غور فرمایا کہ بتدریج دعویٰ کرنے میں کیا مصلحت پنہاں تھی؟ یہ تو بہرحال ان کے دعاوی کی سیڑھیاں تھیں۔ لیکن ہر دعوے کی لِم اور غایت ایک ہی تھی۔ یعنی یہ کہ انگریزوں کی اطاعت فرض ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۴/۵۹)۔ مرزا صاحب نے اس آیت کے لکھنے کے بعد تحریر کیا کہ

"اولی الامر سے مراد جسمانی طور پر بادشاہ اور روحانی طور پر امام الزمان ہے اور جسمانی طور پر جو شخص ہمارے مقاصد کا مخالف نہ ہو اور اس سے مذہبی فائدہ ہمیں حاصل ہو سکے وہ ہم میں سے ہے۔ اس لئے میری نصیحت اپنی جماعت کو یہی ہے کہ وہ انگریزوں کی بادشاہت کو اپنے اولی الامر میں داخل کریں اور دل کی سچائی سے ان کے مطیع رہیں۔"

(ضرورت الامام - صفحہ ۲۳)

علامہ اقبالؒ ضربِ کلیم میں نفسیاتِ غلامی کے عنوان سے کہتے ہیں کہ:

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب — کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ — دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی
ہو اگر قوّتِ فرعون کی درپردہ مُرید — قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

جہاد حرام ہے

اس طرح مرزا صاحب آہستہ آہستہ اُس مقام پر پہنچ گئے جس کے لئے یہ سارا ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ یعنی انہوں نے اعلان کر دیا کہ جہاد حرام ہے۔ انہوں نے کہا۔

"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اُٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔"

(اربعین نمبر۴ - صفحہ ۴۷)

اپنے اسی "الہام" کو نظم میں یوں بیان فرمایا کہ :-

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال — دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح، جو دیں کا امام ہے — دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے — اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے

دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبیؐ کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(مندرجہ تبلیغِ رسالت جلد نہم - صفحہ ۴۹)

گورنمنٹ کی خدمت میں درخواستیں

اس کے بعد ان کی "نبوت" کا فریضہ یہ قرار پاگیا کہ وہ اس خیال کو عام کرتے رہیں کہ جہاد حرام ہے، جہاد حرام ہے۔ وہ یہ کرتے تھے اور ساتھ کے ساتھ اس کی اطلاع حضور گورنمنٹ برطانیہ کو دیتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء کو ایک اشتہار شائع کیا جس کا عنوان تھا "اشتہار لائقِ توجہ گورنمنٹ جو جناب ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند اور جناب گورنر جنرل ہند اور لیفٹیننٹ گورنر پنجاب اور دیگر معزز حکام کے ملاحظہ کے لئے شائع کیا گیا"، اس میں انہوں نے کہا۔

"میں نے برابر سولہ برس سے یہ اپنے پر حق واجب ٹھہرالیا ہے کہ اپنی قوم کو اس گورنمنٹ کی خیر خواہی کی طرف بلاؤں اور ان کو سچی اطاعت کی طرف ترغیب دوں۔ چنانچہ میں نے اس مقصد کے سرانجام کے لئے اپنی ہر اک تالیف میں یہ لکھنا شروع کیا کہ اس گورنمنٹ کے ساتھ کسی طرح مسلمانوں کو جہاد درست نہیں ہے۔"

دوسری جگہ لکھا ہے۔

"میں نے خدا تعالیٰ سے یہ عہد کیا ہے کہ کوئی مبسوط کتاب بغیر اس کے تالیف نہیں کروں گا۔ جو اس میں احسانات قیصرۂ ہند کا ذکر نہ ہو"۔

(نور الحق۔ حصہ اوّل ص ۲۸)

وہ اپنی کتاب تریاق القلوب میں لکھتے ہیں :۔

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہارات شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں"۔

(صفحہ ۱۵)

چنانچہ وہ فخریہ بیان کرتے ہیں کہ میری ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ :۔

"لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیئے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت ظہور میں آئی کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہ سکا"۔

(ستارۂ قیصرہ۔ صفحہ ۲)

یہ تھا اس نبوتِ جدیدہ کا ماحصل۔ اقبالؒ کس درد و سوز سے کہتے ہیں کہ :۔

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام — ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی — ہو جاتی ہے خاکِ چمنستان شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار — کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی صحبت — دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

(ضرب کلیم ص ۵۱)

فریاد! مجھے مولوی ستاتے ہیں!

وحیِ خداوندی کی تاثیر سے تو فی الواقعہ خاکِ چمنستان شرر آمیز اور بلبلِ ناتواں میں شاہین کی ادا نمودار ہو جاتی ہے لیکن ہمارے دور کے مدعیٔ نبوت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ "حضورِ گورنمنٹ عالیہ کی خدمت میں عاجزانہ درخواست" پیش کرتے ہیں جس میں کہتے ہیں کہ :-

"میں اس گورنمنٹِ محسنہ کے زیرِ سایہ ہر طرح سے خوش ہوں۔ صرف ایک رنج اور درد اور غم مجھے لاحق ہے جس کا استغاثہ پیش کرنے کے لئے اپنی محسن گورنمنٹ کی خدمت میں حاضر ہوں اور وہ یہ کہ اس ملک کے مولوی، مسلمان اور ان کی جماعتوں کے لوگ حد سے زیادہ مجھے ستاتے اور دکھ دیتے ہیں۔" (مندرجہ تبلیغِ رسالت جلد ہشتم صـ۵۳)

انگریزوں کا خود کاشتہ پودا

اس کے بعد وہ سرکارِ عالیہ سے کہتے ہیں کہ ہم جو آپ کو مدد کے لئے پکارتے ہیں تو کچھ اپنی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ یہ اس پودے کی حفاظت کے لئے ہے جو خود آپ کے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے نام اپنی درخواست مؤرخہ ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء میں کہتے ہیں :-

"میری اس درخواست سے جو حضور کی خدمت میں معہ اسمائے مریدین روانہ کرتا ہوں، مدعا یہ ہے کہ اگرچہ میں ان خدماتِ خاصہ کے لحاظ سے جو میں نے اور میرے بزرگوں نے محض صدقِ دل اور اخلاص اور جوش اور وفاداری سے سرکارِ انگریزی کی خوشنودی کے لئے کی ہیں، عنایتِ خاص کا مستحق ہوں۔ صرف یہ التماس ہے کہ سرکارِ دولت مدار . . . اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو ارشاد فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھے۔ . . . اس لئے کہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکارِ انگریزی کی نمک پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ موردِ مراحمِ گورنمنٹ ہے۔"

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ہم نے جو اس گورنمنٹ کے زیرِ سایہ آرام پایا اور پا رہے ہیں وہ آرام ہم کسی اسلامی گورنمنٹ میں بھی نہیں پا سکتے۔ ہرگز نہیں پا سکتے۔" (ازالۂ اوہام۔ صہ ۵۰۹)

وہ اپنے اشتہار مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۹۷ء میں لکھتے ہیں:

"میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں، نہ روم میں نہ شام میں، نہ ایران میں، نہ کابل میں۔ مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لئے میں دعا کرتا ہوں۔"

(مندرجہ تبلیغ رسالت۔ جلد ششم ص۶۹)

وقت کی کمی کی بنا پر میں انہی اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔ جو احباب مزید تفصیل دیکھنا چاہیں وہ میری کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" کا مطالعہ فرمائیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں، میں نے یہ بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ مرزا صاحب نے کس طرح نبوت کا دعویٰ کیا، مسلمانوں کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیا اور اپنے متبعین پر مشتمل ایک نئی اُمت کی تشکیل کی۔ یہ نکتہ زیادہ اہم ہے اور اب میں اسی کے متعلق کچھ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اُمت رسولؐ کی نسبت سے متشکل ہوتی ہے

دُنیا میں خدا کے ماننے والے عام ہوتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تخصیص و تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن ایک جداگانہ اُمت کی تشکیل اس رسولؐ پر ایمان لانے سے ہوتی ہے جسے اس کے پیرو سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی سمجھیں۔ مثلاً ایک یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر کے تمام انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان لاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ اُمتِ عیسوی کا فرد قرار نہیں پاتا۔ جس دن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے وہ قوم یہود کا فرد نہیں رہتا، عیسائی اُمت کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک عیسائی، رسول اللہؐ سے پہلے کے تمام انبیاء پر ایمان رکھتا ہے لیکن وہ اُمتِ محمدیہ کا فرد نہیں بنتا۔ جس دن وہ نبوتِ محمدیہ پر ایمان لے آتا ہے وہ عیسائی اُمت کا فرد نہیں رہتا۔ اُمتِ محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق اگر کوئی شخص رسول اللہؐ کے بعد کسی نبوت پر ایمان لے آتا ہے تو وہ اُمتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہتا اس نئے نبی کی اُمت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو "رموزِ بے خودی" میں بڑے

دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید ! دز رسالت در تنِ ما جاں دمید
حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
ما ز حکمِ نسبت اُو ملتیم اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
فرد از حق ملت از وے زندہ است از شعاعِ مہرِ اُو تابندہ است
از رسالت ہمنوا گشتیم ما
ہم نفس ، ہم مدعا گشتیم ما

مسلمان جو ایک جداگانہ اُمت کے فرد قرار پاتے ہیں تو خدا پر ایمان کی بنا پر نہیں بلکہ محمدؐ رسول اللہ کی رسالت پر ایمان لانے کی بنا پر ایسا قرار پاتے ہیں۔ یہ اُمتِ محمدیہ کے فرد اسی صورت میں قرار پا سکتے ہیں کہ یہ حضورؐ کو سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی سمجھیں۔ ختمِ نبوت کے معنی یہی نہیں کہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر نبوت ختم ہوگئی بلکہ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اب دنیا میں دین کی بنیادوں پر کوئی نئی اُمت وجود میں نہیں آسکتی۔ حضرت علامہؒ اس باب میں فرماتے ہیں :۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

اور اس ساری بحث کا نکتۂ آخریں یہ ہے :۔

رونق از ما محفلِ ایام را اُو رسل را ختم و ما اقوام را

ساری بحث چار لفظوں میں ختم — اُو رسل را ختم و ما اقوام را — اسی حقیقت کو وہ بانگِ درا میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

وہ "احمدیت اور اسلام" میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا۔ لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے"۔

خود مرزا غلام احمد بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "آئینہ کمالاتِ اسلام" میں لکھتے ہیں :

"جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اس دعویٰ میں ضرور ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرے اور نیز یہ بھی کہے کہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے میرے پر وحی نازل ہوئی اور نیز خلق اللہ کو وہ کلام سُنادے جو اس پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ایک اُمّت بنا دے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔"
(ص ۳۴۴)

اسی بنا پر مرزا صاحب نے اپنے متبعین کو مسلمانوں سے الگ قرار دیا اور ان کی ایک نئی اُمّت تشکیل کی اور ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں خود درخواست دے کر ان کا ایک الگ جماعت کی حیثیت سے شمار کرایا۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ مرزا صاحب نے اپنی الگ اُمّت کیوں بنائی، اخبار الفضل نے لکھا:۔

"کیا مسیح ناصری نے اپنے پیروؤں کو یہود بے بہبود سے الگ نہیں کیا؟ کیا وہ انبیاء جن کے سوانح کا علم ہم تک پہنچا ہے اور جن کے ساتھ جماعتیں بھی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی جماعتوں کو غیروں سے الگ نہیں کر دیا؟ ہر ایک شخص کو ماننا پڑے گا کہ بے شک کیا ہے۔ پس اگر حضرت مرزا صاحب نے بھی جو کہ نبی اور رسول ہیں اپنی جماعت کو منہاجِ نبوت کے مطابق غیروں سے الگ کر دیا تو نئی اور انوکھی بات کون سی کی!"

(الفضل بابت ۲۶ فروری ۔ ۲ مارچ ۱۹۱۸ء)

انہوں نے، اپنی اُمّت کو اُمّتِ محمدیہ سے الگ بھی ایسے واضح اور نکھرے الفاظ سے کیا کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہ جائے۔ انہوں نے کہا کہ:

"خدائے تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک وہ شخص جس تک میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے وہ مسلمان نہیں۔"

(ارشاد مرزا صاحب منقول از اخبار الفضل۔ بابت ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء)

میاں محمود صاحب اس سے بھی آگے بڑھے اور فرمایا کہ:

"کُل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوتے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سُنا۔ وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔"

(آئینۂ صداقت ص ۳۵)

مرزا صاحب کے دوسرے صاحبزادہ، بشیر احمد کہتے ہیں:

"ہر ایک شخص جو موسیٰؑ کو مانتا ہے مگر عیسیٰؑ کو نہیں مانتا۔ یا عیسیٰؑ کو مانتا ہے مگر محمدؐ کو نہیں مانتا۔ یا محمدؐ کو مانتا ہے مگر مسیح موعود کو نہیں مانتا۔ وہ نہ صرف کافر بلکہ پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"
(کلمۃ الفصل۔ مصنّفہ صاحبزادہ بشیر احمد)

جب مسلمان، دائرہ اسلام سے خارج قرار پا گئے تو دین کی بنیادوں پر ان سے ہر قسم کے تعلقات بھی ناجائز ہو گئے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز۔ ان کا جنازہ پڑھنا بھی ناجائز۔ مرزا صاحب نے خود اپنے بیٹے (فضل احمد) کا جنازہ بھی اس لئے نہ پڑھا کہ وہ "غیر احمدی" تھا۔ اور چوہدری ظفر اللہ خان صاحب، قائداعظمؒ کے جنازہ کی نماز میں بھی اسی لئے شریک نہ ہوئے، غیر مسلموں کے ساتھ ایک طرف الگ کھڑے رہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے ساتھ رشتوں ناطوں کا تعلق ہے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی لڑکیاں لی تو جا سکتی ہیں انہیں لڑکیاں دی نہیں جا سکتیں۔ مرزا محمود صاحب نے کہا تھا کہ اس باب میں ان کی پوزیشن، ہندوؤں اور سکھوں جیسی ہے کہ ان کی لڑکیاں بھی لی جا سکتی ہیں۔ انہیں لڑکیاں دی نہیں جا سکتیں۔ (الفضل۔ ۱۷ جولائی ۱۹۲۲ء)

انہی فیصلوں کی رُو سے، صاحبزادہ بشیر احمد نے لکھا کہ:

"غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ ہو گئیں۔ ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا۔ ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے جو ہم ان کے ساتھ مل کر سکتے ہیں۔ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک دینی دوسرے دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ و ناطہ ہے۔ سو یہ دونوں ہمارے لئے حرام قرار دے دیئے گئے ہیں۔"
(کلمۃ الفصل)

الگ قوم قرار دی جائے

علامہ اقبالؒ نے ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں یہ تحریک اٹھائی اور تجویز یہ کیا کہ:۔

"میری رائے میں حکومت کے لئے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی اہل مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔"

(احمدیت اور اسلام)

میں نے جو اقتباسات آپ حضرات کے سامنے پیش کئے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ مرزا غلام احمد کے متبعین روزِ اوّل سے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ اُمّت تصوّر کرتے تھے۔ وہ اس تصوّر کی عام نشر و اشاعت بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو کہتے مسلمان ہی تھے۔ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ اس کے متعلق، علّامہ اقبالؒ نے کہا تھا:-

"اس امر کے سمجھنے کے لئے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے مفاد کے ان کی موجودہ آبادی جو چھپن ہزار ہے، انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لئے انہیں سیاسی اقلیت کی ... بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔" (احمدیت اور اسلام)

ان لوگوں کی اسی دو رُخی پالیسی کے پیشِ نظر انہوں نے (علّامہ اقبالؒ نے) کہا تھا کہ، بہائیت قادیانیت سے زیادہ دیانت دار ہے کہ انہوں نے اگر دعویٰ نبوت کیا ہے تو اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ اُمّت قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے حکومت سے کہا یہ تھا کہ وہ اس معاملہ کو یکسو کر دے اور جس بات کو یہ الگ اپنے عقیدے کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی مسلمانوں سے ایک الگ اُمّت) اسے قانونی حیثیت دے دیں۔ انگریزی حکومت نے اس تجویز کو قابلِ قبول نہ سمجھا کیونکہ یہ خود ان کے مصالح اور مقاصد کے بھی خلاف جاتی تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی مسلمانوں نے اس مطالبہ کو متعیّن طور پر پیش نہ کیا، یا یوں کہئے کہ یہ آواز شور و غوغا میں گم ہوجاتی رہی۔ البتہ طلوعِ اسلام اسے متعیّن طور پر دہراتا رہا تا آنکہ ستمبر ۱۹۷۴ء میں اس نے قانونی شکل اختیار کرلی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا سہرا بالواسطہ حضرت علّامہؒ ہی کے سر بندھتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لاہوری "احمدی"

لاہوری "احمدی" یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے۔ مسیحِ موعود مانتے ہیں اور یہ ایسا دعویٰ نہیں جس کے نہ ماننے سے کوئی مسلمان کافر قرار پا جائے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قادیانیوں کے ساتھ ہمیں بھی کیوں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔

مرزا صاحب نے مسیحِ موعود ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ اور انہوں نے کون سا دعویٰ نہیں کیا تھا، ملہم۔ مامور من اللہ۔ محدّث۔ مجدّد۔ مہدی۔ ظلّی۔ بروزی۔ حلولی۔ حقیقی نبی۔ محمدؐ کا اوتار۔ خود محمدؐ۔ کرشن گوپال وغیرہ۔ انہوں نے ان کے دعویٰ مسیحِ موعود کے منکرین کے متعلق کہا:۔

"کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ ہے کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرت کو رسول نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیحِ موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمامِ حجّت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔" (حقیقۃ الوحی۔ ص ۱۷۱)

آپ دیکھیں گے کہ لاہوری "احمدی" حضرات مرزا صاحب کی اس عبارت کو کبھی پیش نہیں کریں گے۔ یہ تو رہا مرزا صاحب کو مسیحِ موعود نہ ماننے والوں کے متعلق کہ وہ کافر ہیں۔ اب مرزا صاحب کا خود اپنے متعلق فتویٰ بھی سن لیجئے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے جہاد بالسیف کو منسوخ قرار دیا اور اسے حرام بتایا۔ جہاد بالسیف قرآن کریم کا جس قدر اہم حکم ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں قرآن کے کسی حکم کو منسوخ قرار دینے والے کے متعلق مرزا صاحب کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اپنی کتاب ازالہ اوہام میں لکھتے ہیں۔

"ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتبِ سماوی ہے۔ اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور اوامر سے نہ زیادہ ہو سکتا نہ کم ہو سکتا ہے اور اب کوئی ایسی وحی یا الہام منجانب اللہ نہیں ہو سکتا جو احکامِ فرقانی کی ترمیم

تنسیخ یا کسی ایک حکم کی تبدیلی و تغیر کر سکتا ہو۔ اور اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک جماعتِ مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے۔" (صفحہ ۱۳۸۔ بحوالہ پیغامِ صلح۔ بابت ۵، دسمبر ۱۹۷۲ء)

اب آپ سوچئے کہ مسلمانوں نے اگر مرزا صاحب کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے تو یہ خود مرزا صاحب کے فیصلے کے مطابق ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بحث ہی بیکار ہے کہ لاہوری جماعت مرزا صاحب کو کیا مانتی ہے اور قادیانی (ربوی) جماعت کیا؟ لاہوری جماعت کا یہی کہنا ہے نا، کہ مرزا صاحب کو نبی تو ربوہ والے مانتے ہیں۔ ہم انہیں ایسا نہیں مانتے۔ اس لئے ربوہ والوں کے ساتھ ہمیں بھی دائرۂ اسلام سے خارج کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک جو لوگ مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں انہیں دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جانا درست ہے۔ لیکن ٹھہریئے۔ یہ بھی فریب دہی کی ایک اور شکل ہے۔ لاہوری "احمدی" قادیانیوں (اہلِ ربوہ) کو بھی دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیئے جانے کے لیے تیار نہیں۔ جس زمانے میں یہ سوال زیرِ غور تھا کہ "احمدیوں" کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو لاہوری جماعت نے اپنے اخبار "پیغامِ صلح" کی اشاعت بابت ۳۰ مئی ۱۹۷۴ء میں لکھا تھا۔

"ان حالات میں اوّل تو کسی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا صحیح نہیں۔ اور اگر اس شوق کو پورا ہی کرنا ہے ۔۔۔۔ تو کم از کم "احمدیوں" کے اس گروہ کو اس سے مستثنےٰ کرنا ضروری ہے جو حضرت خاتم النبیینؐ کے بعد کسی بھی نبی کے آنے کے قائل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں ہیں۔ ہمارے نزدیک قادیانی ہو یا غیر قادیانی ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ اس کو غیر مسلم قرار دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ قادیانی اور لاہوری، اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ان کا باہمی نزاع، جنگِ زرگری سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ میں نے اسی بنا پر تجویز کیا تھا کہ قانون یہ پاس ہونا چاہیئے کہ مرزا غلام احمد کو مسلمان سمجھنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

مقامِ نبوّت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ علّامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء میں جو تجویز پیش کی تھی کہ مرزا

غلام احمد کے متبعین کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور جسے قانونی حیثیت ستمبر ۱۹۷۴ء میں مملکت پاکستان میں دی گئی - وہ کس قدر مبنی بر حقیقت اور خود مرزا صاحب کے مسلک کے عین مطابق تھی - لیکن قطع نظر ان قانونی مباحث کے، مرزا صاحب کے دعوئ نبوت نے خود منصب نبوت کی اس قدر تذلیل کی ہے جس کے تصور سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے - انہوں نے نبوّت جیسے بلند و بالا منصب کو، جو شرف و مجدِ انسانیت کی معراج کبریٰ ہے، انتہائی پست سطح پر لا کھڑا کر دیا - میں نے شروع میں بتایا ہے کہ بہاول نگر کے ڈسٹرکٹ جج محمد اکبر مرحوم نے اپنے فیصلہ میں کہا تھا کہ انہوں نے مقامِ نبوت کو میرے ایک مضمون سے سمجھا اور اسی بنا پر اپنا فیصلہ صادر کیا - میں نے اس کے بعد مقامِ نبوت کے متعلق اپنی کتاب، معراجِ انسانیت، میں بڑی شرح و بسط سے لکھا تھا - جی چاہتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں اس کا ایک اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کروں - میں نے اس میں لکھا ہے :-

"نبوّت کا مقام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جِلا، قلب میں روشنی، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں - نبیؑ کا پیغام انقلاب آفریں دین و دُنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے - وہ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے اس سے قوم کے عروقِ مفلوج میں پھر سے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے - وہ اپنی ملّت کو زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دے دیتا ہے - وہ اپنی ہوش رُبا تعلیم اور محیّر العقول عمل سے باطل کے تمام نظامہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر آئینِ کائنات کو ضابطۂ خداوندی پر متشکّل کر دیتا ہے - اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے - آرزوئیں آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھتی ہیں - ولولے جاگ پڑتے ہیں - ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں - روح کی مسرتوں کے چشمے اُبلتے ہیں، قلب و جگر کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں - تازہ اُمیدوں کی کلیاں مہکتی ہیں - زندہ مقاصد کے غنچے چٹکتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحنِ چمن، دامانِ صد باغبان و کفِ ہزار گلفروش کا فردوسی منظر پیش کرتا ہے - حکومتِ الٰہیّہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانینِ خداوندی کا نفاذ اس کا منتہیٰ ہوتا ہے جب اس کے ہاتھوں خدا کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی قوت

پہاڑوں کے غاروں میں منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصرِ فلک بوس کے کنگورے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتش کدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قدوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکش اور خود پرست قوتیں اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے ان انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ ان اللّٰہ وملٰئکتہٗ یصلون علی النبی۔"

یہ تھا مقامِ نبوت جسے شمعِ قرآنی سے اکتسابِ ضیا کے بعد میں نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ایک مدعیٔ نبوت آتا ہے جس کی ساری عمر انگریزوں جیسی ابلیسی سیاست کی حامل قوم کی غلامی کی تلقین و تاکید میں گزر جاتی ہے۔ وہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کو درخواستوں پر درخواستیں گزارتا ہے کہ میں نے آپ کی اس قدر خدمت کی ہے، آپ اس کے صلہ میں میری حفاظت بھی کریں اور خصوصی مراعات سے بھی نوازیں! سوچئے عزیزانِ من! کہ اس سے نبوت کو کس مقام پہ لے آیا گیا ہے؟ یہی وہ احساس تھا جس سے تڑپ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

مقامِ نبوت کے تعارف کے بعد، میں نے اپنی مذکورہ صدر کتاب میں لکھا تھا:۔

"مقامِ نبوت تو ایک طرف، شمعِ نبوی سے اکتسابِ ضیا کرنے والے مردِ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کے دل تک نہیں پہنچ سکتا۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس کی شمشیرِ جگر دار کے سامنے لرزہ براندام ہوتی ہیں۔ اس کی قوتِ بازو حکومتِ خداوندی کے تمکن و بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ وہ قوانینِ خداوندی کا عملاً نفاذ کرتا ہے۔ یہ وہ "مجدد" ہوتا ہے جس کی قوتِ ایمانی اور بصیرتِ قرآنی سے محمدٌ رسول اللّٰہ والذین معہٗ کے عہدِ سعادت مہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ وہ "مسیحا" ہوتا ہے جس کے اعجازِ نفس سے مردہ قوم میں از سرِ نو زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ وہ "مہدی" ہوتا ہے جو خود اللہ کے صراطِ مستقیم پہ گامزن ہو کر ساری دنیا کے لئے ہدایت و رشادت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ مرکز ہوتا ہے جس کے گرد ایسی جماعت کا دائرہ کھنچ جاتا ہے

جس کے متعلق فرمایا کہ۔

یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ٘ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىٕمٍ...... (۵/۵۴)

"اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے۔ وہ مومنوں کے سامنے جھکے ہوئے اور مخالفین کے مقابل میں غالب ہوتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے"۔

مومنین کی جرأتِ ایمانی

حضرات انبیاء کرامؑ کا مقام تو ایک طرف رہا، عام مومنین کی جرأت ایمانی کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اس کے لئے خود قرآن کریم نے ایک واقعہ درج کیا ہے جو عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب ساحرینِ دربارِ فرعون نے صداقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر خدا پر ایمان کا اعلان کر دیا تو فرعون نے بجلی کی سی کڑک اور شیر کی سی دھاڑ کے ساتھ کہا کہ تمہیں یہ جرأت کس طرح سے ہوگئی کہ میری اجازت کے بغیر ایمان کا اعلان کر دو! تم دیکھو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں تمہیں حوالۂ دار و رسن کر دوں گا اور تمہارے ایک ایک حصۂ بدن کو کٹوا کر الگ کر دوں گا۔ اِن مومنین نے (جنہیں ایمان لائے ابھی چند ثانیے ہی گزرے تھے) اس قہر آلود دھمکی کو نہایت سکون و سکوت کے ساتھ سنا اور ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ کہا —— فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲) —— جو تیرے جی میں آئے کر لے۔ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا (۲۰/۷۳) ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں اور پھر تو ہمارے ساتھ کر بھی کیا سکتا ہے۔ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۲۰/۷۲) تیرا دائرۂ اختیار ہماری اسی دنیاوی زندگی تک ہے اور زندگی تو یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ آگے بھی بڑھتی ہے۔ اور اُس دائرے تک تجھے رسائی ہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تو ہمیں ڈراتا کس بات سے ہے!

یہ ہوتی ہے مومنین کی جرأتِ ایمانی! اس کے برعکس اس مدعیٔ نبوت کی "جرأتِ ایمانی" کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے۔ مرزا صاحب نے جب اپنے ان الہامات کی نشر و اشاعت کی جن میں اپنے مخالفین پر خدا کے عذاب کی وعید تھی تو بٹالہ کے مولوی محمد حسین (مرحوم) نے ان کے خلاف زیرِ دفعہ (۱۰۷) تعزیراتِ ہند، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، گورداسپور کی عدالت میں استغاثہ دائرہ کر دیا۔ دفعہ (۱۰۷) کے تحت اگر جرم ثابت بھی ہو جائے تو سزا پھانسی

نہیں ہوتی، ضمانتیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کی "جرأتِ ایمانی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے عدالت میں معافی نامہ داخل کر دیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"میں، مرزا غلام احمد قادیانی بحضور خداوند تعالیٰ باقرار صالح اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ :۔

(۱) میں آئندہ ایسی پیش گوئی شائع کرنے سے پرہیز کروں گا جس کے یہ معنی ہوں یا ایسے معنی خیال کیے جاسکیں کہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو خواہ ہندو ہو یا عیسائی وغیرہ) ذلت پہنچے گی یا وہ موردِ عتابِ الٰہی ہوگا۔

(۲) میں خدا کے پاس ایسی اپیل (فریاد درخواست) کرنے سے بھی اجتناب کروں گا کہ وہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلیل کرنے سے یا ایسے نشان ظاہر کرنے سے کہ وہ موردِ عتابِ الٰہی ہے، یہ ظاہر کرے کہ مذہبی مباحثہ میں کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

(۳) میں کسی چیز کو الہام بتا کر شائع کرنے سے مجتنب رہوں گا جس کا یہ منشا ہو یا جو ایسا منشا رکھنے کی معقول وجہ رکھتا ہو کہ فلاں شخص (یعنی مسلمان ہو، خواہ ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلت اٹھائے گا یا موردِ عتابِ الٰہی ہوگا۔ . . .

(۴) جہاں تک میرے احاطۂ طاقت میں ہے میں تمام اشخاص کو جن پر کچھ میرا اثر یا اختیار ہے، ترغیب دوں گا کہ وہ بھی بجائے خود اس طریق پر عمل کریں جس طریق پر کاربند ہونے کا میں نے دفعہ ۱ تا ۳ میں اقرار کیا ہے۔

العبد	گواہ شد
مرزا غلام احمد بقلم خود	خواجہ کمال الدین بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔

دستخط۔ جے۔ ایم۔ ڈوئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ ۲۴ فروری ۱۸۹۹ء۔

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ :۔

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہہ — مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر — فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام
عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے — یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

والسلام
پیر و ریز

بتقریب یوم اقبالؒ
۱۱ اپریل ۱۹۷۶ء

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت!

آپ نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ آواز آپ کے کان میں مسلسل آتی رہی ہوگی کہ مسلمانوں میں اتحاد نہیں، اتفاق نہیں۔ ان میں انتشار ہے، تشتت ہے۔ یہ مختلف قوموں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں میں منقسم ہیں۔ اگر ان میں کہیں اتحاد پیدا ہو جائے تو یہ ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ سب پر غالب آسکتے ہیں۔ اس قسم کی آوازیں زمانہ حال ہی کی پیداشدہ نہیں۔ یہ قصہ صدیوں پرانا ہے۔ ہمارے اختلافات اور تفرقات کی داستان ہزار بارہ سو سال سے مسلسل آگے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ ان اختلافات کو مٹانے کی کوششیں بھی بہت ہوئیں۔ دور کیوں جایئے۔ ابھی پچھلی صدی میں جمال الدین افغانی جیسی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ ساری عمر نعل بر آتش، اسی اتحاد کا درد اور تڑپ سینے میں لئے مسلمانوں کے مختلف ممالک میں بگولے کا سا رقص کرتے رہے۔ مسلسل سفر کی مشقتیں اٹھائیں۔ کہیں قید و بند کی صعوبات برداشت کیں۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں انہیں زہر تک بھی دے دیا گیا۔ بہر حال وہ ساری عمر اسی جدوجہد میں مصروف اور اسی تگ و تاز میں سرگرداں رہے لیکن انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی سبھے اُن کی تحریک پان اسلامزم کے مالہٗ و ماعلیہ سے بحث نہیں۔ میرا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ان کی عمر بھر کی جدوجہد بلا نتیجہ ثابت ہوئی۔ بلکہ مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کے اختلافات کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئے۔ ان کے بعد ہمارے دور میں حکیم الاُمت علامہ اقبالؒ بھی اسی درد کو دل میں لئے ہوئے اُٹھے۔ انہوں نے بھی اپنی ساری عمر اسی آہ و فغاں میں بسر کر دی۔ آپ جوابِ شکوہ کو دیکھئے۔ وہ کس کرب و اذیت سے کہتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

اُن کے شکوہ کا جو جواب ندائے جمال کی طرف سے ملا اُس میں اقبالؒ سے کہا گیا کہ تم نے مسلمانوں کی ذلت و پستی کی دردانگیز داستان بھی سنائی اور اس باب میں ہماری بے اعتنائی کا شکوہ بھی کیا۔ لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ :-

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یُوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

یہاں تو انہوں نے مسلمانوں کی مختلف ذاتوں اور گوتوں کا ہی ذکر کیا ہے لیکن آگے چل کر انہوں نے اپنے اس پیغام کی آماجگاہ کو وسیع تر کرتے ہوئے دنیا بھر کے مسلم ممالک کو مخاطب کیا اور کہا :-

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کریگا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

یہ کچھ انہوں نے خضرِ راہ میں کہا اور اس سے اگلے ہی سال، اپنی مشہور نظم طلوعِ اسلام میں انہوں نے خون کے آنسوؤں کے ساتھ کہا کہ :-

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل، اُچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

میں نے حضرتِ علامہؒ کے یہ چند اشعار مثال کے طور پر پیشِ خدمت کئے ہیں، ورنہ ان کا سارا کلام اسی حقیقت کا ترجمان اور ان کا پیام اسی نصب العین کا داعی ہے۔ لیکن بصد حسرت یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی یہ آتش نوائی بھی کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کر سکی۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ :-

دیا اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

سوال یہ ہے کہ جب اختلاف و افتراق کے نقصانات کا بھی سب کو احساس ہے اور مسلمانوں کی ستر اسی کروڑ آبادی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو آپس کے اتحاد و ائتلاف کی ضرورت اور اہمیت کا قائل نہ ہو، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں یہ اتحاد پیدا نہیں ہوتا؟ اس ضمن میں دردمندانِ ملت کی تمام کوششیں کیوں بے نتیجہ رہتی ہیں؟

اس کی وجہ کیا ہے؟

یہ وہ سوال ہے جو ہر دلِ دردمند میں بار بار اُٹھتا ہے اور پھر کوئی جواب نہ پاکر کاشانۂ قلب میں بصد حسرت و یاس واپس لوٹ جاتا ہے۔ اسی سوال کا جواب میرے آج کے خطاب کا مرکزی خیال ہے۔

آج جہاں ہر شخص مسلمانوں کے اختلافات کا شکوہ سنج اور ان کے افتراق کا نوحہ خواں ہے، وہاں ہر فرد اس حقیقت کا معترف بھی ہے کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں اُمّت میں کامل اتحاد ہی نہیں بلکہ وحدت تھی، مسلمانوں میں کسی قسم کا اختلاف اور افتراق نہیں تھا۔ اس اتحاد کے لئے اُن کے جسم ہی آپس میں ملے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ، قرآن کریم کے الفاظ میں، ان کے دل بھی ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے تھے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں ایسی وحدت کس طرح پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کے بعد وہ کون سا عنصر تھا جس کے نہ رہنے سے یہ وحدت اس طرح پارہ پارہ ہو گئی کہ وہ پھر دوبارہ آج تک پیدا نہ ہو سکی۔ اگر ہم اس کھوئی ہوئی حقیقت کو تلاش کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے اپنے مزمن مرض کی صحیح تشخیص کر لی ہے اور ظاہر ہے کہ صحیح تشخیص کے بعد مرض کا علاج ممکن ہو جاتا ہے۔ آئیے ہم اس اصل و بنیاد کی تلاش کے لئے بقلبِ سلیم، تاریخ کی راہوں پر چودہ سو منازل پیچھے کی طرف لوٹیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام، مذہب نہیں دین تھا۔ مذہب میں مقصود ہر شخص کی انفرادی نجات ہوتا ہے جس کے لئے وہ انفرادی طور پر کچھ رسوم بجالاتا اور مذہب کے بتائے ہوئے نیک کام کرتا ہے۔ اس میں اجتماعیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر شخص اپنے اپنے طور پر ہر مقام پر اور ہر قسم کے حالات میں مذہب پر کاربند رہ سکتا ہے۔ اس کے برعکس، دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہوتا ہے۔ اس اجتماعی نظام کو قائم کرنے کے لئے ایک اُمّت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ افراد، جو دین کے نظریہ یا آئیڈیالوجی کی صداقت کو بہ طیبِ خاطر تسلیم کرتے ہیں، وہ انفرادی زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ اس اُمّت کے اجزا بن

جاتے ہیں۔ یہ جو آج کل آپ عام طور پہ سُنتے چلے آ رہے ہیں اور سُنتے رہتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار ایمان کا اشتراک ہے تو اس کے یہی معنی ہیں۔ اس پوری کی پوری اُمت کا نصب العین حیات بھی ایک ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لئے راستہ بھی ایک۔ اسے وحدتِ فکر و عمل کہتے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معیار اور منہاج کے مطابق ایک اُمت کی تشکیل کی تھی۔ یہی وہ اُمت تھی جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہا تھا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳) اس آیہ جلیلہ میں تین اہم حقیقتوں کا بیان ہے۔ پہلی یہ کہ مسلمان مختلف

اُمت کی تشکیل

افراد نہیں تھے بلکہ ایک اُمت تھے۔ دوسری حقیقت یہ کہ اس اُمت کا وجود خود اپنی منفعت ہی کے لئے نہیں تھا، اس کا فریضہ یہ تھا کہ یہ اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اسی اعتبار سے اسے اُمتِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اُمت دنیا کی ہر قوم کے لئے یکساں فاصلے پہ ہوگی، جس طرح دائرے کا مرکز اس کے محیط کے ہر نقطہ سے یکساں فاصلے پہ ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے دوسری جگہ کہا گیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود و منفعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے"۔ اور تیسری حقیقت یہ کہ خود اس اُمت کی بھی ایک مرکزیت ہوگی۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ حضورؐ کا منصب یہ تھا کہ وہ اس اُمت کے اعمال کی نگرانی کریں۔ یہ تھا اس اُمت کا منہاج اور طریقِ کار۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا نقطۂ اتصال تھا جس نے ان افراد کو ایک اُمتِ واحدہ کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ "بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ" یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح۔ (۶۱/۴) قرآن کریم نے اس حقیقت کی ان الفاظ میں وضاحت کر دی کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲) یعنی ان کی وجہِ جامعیت "اعتصام بحبل اللہ" تھی۔ "حبل اللہ" کے لفظی معنی "اللہ کی رسی" کے ہیں اور اس سے مقصد خدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ حبل اللہ یا رسی کی تشبیہ سے بات بڑی واضح ہو جاتی ہے۔ بہارو (جھاڑو) کے سینکڑوں تنکے ایک تاگے یا رسی سے بندھے ہوتے ہیں۔ جو کام ان تنکوں کو باہمد گر پیوست رکھنے میں جھاڑو کی رسی کرتی ہے وہی کام مختلف افراد کو اُمتِ واحدہ بنانے کے لئے اللہ کی رسی یعنی اس کی کتاب سر انجام دیتی ہے۔ یعنی خدا کی کتاب وہ ضابطہ حیات تھی جو ان مختلف افراد کی باہمد گر پیوستگی کا ذریعہ تھی۔ لیکن کتاب تو حروف اور الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے اور مجرد (ABSTRACT)

الفاظ مختلف افراد کے لئے وجہِ جامعیت نہیں بن سکتے۔ اس کے لئے کسی محسوس اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو ان افراد کو یکجا رکھ سکے اور ان کے اختلافی معاملات میں حکم بن جائے۔ یہ محسوس اتھارٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ قرآن کریم نے افرادِ اُمت کے مومن ہونے کے لئے شرط ہی یہ بتائی تھی کہ

رسول اللہ کا منصب

وہ اس سنٹرل اتھارٹی کے فیصلوں کو بطیبِ خاطر قبول کریں۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵) "تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ان کی حالت یہ نہ ہو کہ یہ اپنے ہر اختلافی معاملے میں تجھے اپنا حکم تسلیم کریں اور اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ اُسے بطیبِ خاطر قبول کریں اور اس کے سامنے .... سرِ تسلیم خم کر دیں۔" افرادِ اُمت کے مومن ہونے کے لئے تو یہ شرط عاید کی گئی اور دوسری طرف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) "تم ان کے اختلافی معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔" دوسرے مقام پر اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی گئی۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰)۔ "تمہارے تمام اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہونا چاہئے۔" ان تصریحات کی روشنی میں اُس اجتماعی نظام کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جسے قائم کرنے کے لئے یہ اُمت وجود میں لائی گئی تھی اور جس سے خود اس اُمت کی وحدت قائم رہتی تھی یعنی:۔

(۱) ان افراد کے فکر و عمل کا مرکز قرآن مجید

(۲) لیکن قرآن مجید کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی اتھارٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اجتماعی طور پر۔ اس اتھارٹی کے لئے جیتی جاگتی ہونے کی شرط نہایت اہم اور لاینفک ہے۔

زندہ اتھارٹی

یہی ہے وہ محور جس کے گرد اسلامی نظام گردش کرتا ہے۔ اور یہی ہے وہ نقطۂ ماسکہ جس سے اُمت کی وحدت قائم رہتی ہے۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ اس میں اطاعت کے لئے وَاسْمَعُوا بنیادی شرط ہے۔ یعنی احکام کا سننا، اور ان کی اطاعت کرنا۔ سورۃ تغابن میں ہے فَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا (۶۴/۱۶)۔ "احکام کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔" سورۃ انفال میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (۸/۲۰) "اے جماعت مومنین۔ اے

اُمّتِ مسلمہ۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو۔ درآں حالیکہ تم اس کے احکام کو سن رہے ہو" اور مومنین کی طرف سے اس کا جواب آتا تھا۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (۲/۲۸۵) "ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں" ان تصریحات سے واضح ہے کہ اطاعت کے لئے احکامات کا سننا بنیادی شرط ہے اور احکامات وہی سنے جاسکتے ہیں جو کسی زندہ اتھارٹی کی طرف سے دیئے جائیں۔ اس نقطہ کو عزیزانِ من! بڑی اچھی طرح سے ذہن نشین فرما لیجئے کہ یہی دین کی لم ہے۔ اطاعت کتابوں کی رو سے نہیں کی جاسکتی، زندہ اتھارٹی کی رو سے کی جاسکتی ہے۔

اب آگے بڑھیے۔

اللہ اور رسول سے مراد

قرآن کریم میں قانون یا نظام کے الفاظ نہیں آئے کیونکہ یہ قرآن کریم کی اولین مخاطب قوم کے ہاں مروج نہیں تھے۔ اس نظام کو "اطاعتِ خدا اور رسول" کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی خدا کی اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے۔ قرآن مجید میں "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" کی جامع اصطلاح اسی مفہوم کی ادائیگی کے لئے آئی ہے۔ دورِ حاضرہ میں اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جائے گا جو کتاب اللہ کی اطاعت کے لئے قائم کی گئی ہو۔ واضح رہے کہ یہ مفہوم نہ میرا ایجاد کردہ ہے نہ دورِ حاضرہ کا وضع کردہ۔ ہمارے متقدمین کی تفسیروں میں اس سے یہی مفہوم لیا گیا ہے۔ وہ اس سنٹرل اتھارٹی کے لئے عام طور پر امام کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ نظام کا لفظ ابھی ان کے زمانے میں بھی رائج نہیں ہوا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ اصطلاح رائج ہو چکی ہے اور عصرِ حاضر کی تفاسیر میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ اس ضمن میں دو ایک مثالیں پیش خدمت ہیں۔ سورۃ الانفال کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ ..... (۸/۱) لفظی ترجمہ ان الفاظ کا یہ ہے۔ "اے رسولؐ! لوگ تم سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو! کہ مالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔" اس کی تشریح کرتے ہوئے (مولانا) ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:-

> "مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیے کہ جو جس کے ہاتھ میں پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔"

مولانا آزاد نے یہاں "اللہ اور رسولؐ" کے لئے متقدمین کے اتباع میں، امام کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن

اگلے ہی صفحے پر یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی ہے کہ :-

"قرآن حکیم نے حکم دیا ہے کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے، حکومت (یعنی اسٹیٹ) کا ہے۔"

(ترجمان القرآن۔ جلد دوم صفحہ ۵۴۔ ۵۳)

اب دوسری مثال لیجئے۔ سورۃ المائدہ میں ہے۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ... (۵/۳۳) ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ دیا ہے :-

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ..... (ان کی سزا یہ ہے کہ .....)

اس ترجمے پر وہ حسب ذیل حاشیہ لکھتے ہیں۔

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو ..... ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا ..... دراصل خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیرات ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے "بادشاہ کے خلاف لڑائی" (WAG ING WAR AGAINST THE KING) کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔"

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء، صفحہ ۴۶۵)

اس کے بعد مختلف سزاؤں کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے حسب ذیل حاشیہ لکھا ہے :-

"یہ مختلف سزائیں بر سبیل اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے۔" (ایضاً)

ان حوالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کہنا کہ "اللہ اور رسولؐ" سے مراد اسلامی نظام یا اسلامی حکومت ہے، ایجاد بندہ نہیں۔ اور تو اور خود مودودی صاحب بھی اس سے یہی مراد لیتے ہیں۔ میں نے مودودی صاحب

کا نام خاص طور پر اس لئے لیا ہے کہ یہ صاحب اور ان کی جماعت میرے خلاف سب سے بڑا الزام یہ عاید کرتی ہے کہ میں "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی نظام لیتا ہوں اور اسی بناء پر یہ حضرات میرے خلاف "منکرِ سنت" ہونے کا پراپیگنڈا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کی غرض میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔

بہر حال بات یوں چلی آ رہی تھی کہ قرآن کریم کی رُو سے دین سے مراد ایک اجتماعی نظام ہے، اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت سے مقصود اس نظام کی اطاعت ہے۔ اور اس اطاعت کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی موجودگی لازمی ہے۔ اس نظام کی یہ سب سے پہلی سنٹرل اتھارٹی حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک قائم رہنا تھا یا اسے آگے بھی چلنا تھا؟ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو آخری کتاب اور اسلام کو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے دین الحق قرار دیا تو اس سے واضح ہے کہ اس نظام کو حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں رہنا تھا، آگے بھی چلنا تھا۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ (۳/۱۴۳)

"محمدؐ، بجز ایں نیست کہ، خدا کا ایک رسولؐ ہے۔ اس سے پہلے کئی رسولؑ دنیا میں آئے اور اپنے اپنے فرائضِ منصبی سرانجام دینے کے بعد رخصت ہو گئے۔ اگر یہ رسولؐ بھی کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ خیال کر کے کہ یہ نظام تو اس رسولؐ کی زندگی تک محدود تھا، پھر اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس سے واضح ہے کہ اس نظام کو رسول اللہؐ کے بعد ختم نہیں ہو جانا تھا، آگے بھی چلنا تھا۔ اس نظام کو

خلافت علیٰ منہاج رسالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوںؓ (خلفاء) نے برقرار رکھنا تھا۔ اس میں خلیفۃ الرسول کی اطاعت نے رسول اللہؐ کی اطاعت کی جگہ لے لینی تھی۔ اور "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کی عملی شکل خلافت علیٰ منہاج رسالتؐ کی اطاعت تھی۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے حضورؐ نے فرمایا تھا:۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِىْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ ۔

(مشکوٰۃ ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

"تم پر میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین ، مہدیین کے طریقے کی پیروی لازمی ہے"۔

اس نظام کی بنیادی شرط اُمّت کی وحدت تھی ۔ یا یوں کہئے کہ اس نظام کا لازمی نتیجہ اُمّت کی وحدت تھی ۔ اگر اُمّت میں تفرقہ پیدا ہو جائے تو یہ نظام باقی نہیں رہ سکتا تھا ۔ دوسرے الفاظ میں ، اس نظام کے باقی نہ رہنے سے اُمّت کی وحدت ختم ہو جاتی تھی ۔ یعنی پھر اسلام دین نہیں رہتا تھا ، مذہب بن جاتا تھا ۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے اُمّتِ مسلمہ کو بڑی شدت کے ساتھ تاکید کی کہ تم تفرقہ پیدا کر لینا سورۃ الروم میں ہے وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ (۳۰/۳۱-۳۲) "اے اُمّتِ واحدہ ! ایسا نہ ہو کہ تم مشرکین میں سے ہو جاؤ ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا ۔ فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے اور پھر ان کی حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اس فریب نفس میں مبتلا ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں"۔ یہاں دیکھئے ! اُمّت کی وحدت ٹوٹنے کو شرک قرار دیا گیا ہے ۔ بات بالکل واضح ہے جب

تفرقہ شرک ہے

اُمّت ایک اتھارٹی کے تابع رہے تو اس کی وحدت قائم رہتی ہے ۔ تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف گروہ ، مختلف اتھارٹیز کے تابع ہو جاتے ہیں ۔ اسی کا نام شرک ہے ۔ اس کی تفسیر میں دوسری جگہ کہا ۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (۶/۱۵۴) اے رسولؐ ! ان سے کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے ۔ اسی کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے ۔ تم سب نے اسی کا اتباع کرنا ۔ اگر تم نے مختلف راستے اختیار کر لئے تو پھر خدا کی طرف لے جانے والا راستہ کسی کے سامنے نہیں رہے گا" یعنی اس طرح دین ، مذہب میں تبدیل ہو جائے گا اور "مذہب میں خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ہوتا ہی نہیں" ۔ دوسرے مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِىْ شَىْءٍ (۶/۱۶۰) "جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود گروہ بن کر بیٹھ جائیں ۔ اے رسولؐ ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔ رسول تو اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی تھا جس کے فیصلوں کا اطلاق تمام اُمّت پر یکساں ہوتا تھا ۔ جن لوگوں نے کسی اور اتھارٹی کو تسلیم کر لیا وہ اگر اس نظام کے اندر رہے تو ان کی حیثیت باغیوں کی ہو گی ۔ اور اگر نظام سے باہر چلے گئے تو اُمّتِ محمدیہ

کے افراد نہ رہے۔ دونوں صورتوں میں رسول کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا۔ قرآنی آیات کے علاوہ اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث بھی ہیں جن میں تصریح کہا گیا ہے کہ اُمّت سے علیحدگی کے معنے دائرہ اسلام سے خارج ہو جانا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت ہے جس کا تشریحی ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"حضورؐ نے فرمایا۔ میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ الجماعۃ۔ والسمع والطاعۃ۔ والہجرۃ۔ والجہاد۔ یعنی جماعت (کے ساتھ رہو)۔ (حکم امیر) سنو۔ اور (اس کی) اطاعت کرو (ضرورت پڑے تو اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی) چھوڑ دو۔ (اسے ہجرت کہتے ہیں)۔ اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو۔ یاد رکھو! جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا۔ اسلام کا پٹہ اس کی گردن سے اتر گیا۔ عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور نمازیں پڑھتا ہو۔ (کیا پھر بھی اسلام سے خارج ہو جائے گا) فرمایا۔ ہاں! خواہ وہ نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو (دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا)"۔

اُمّت کو اس قسم کی واضح تاکیدات کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے اس نظام کو اسی طرح قائم رکھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ رسولؐ اللہ خدا کے مامور تھے اور یہ خلفاء۔ قرآن کریم کے مشاورت کے حکم کی رُو سے، اُمّت کے منتخب کردہ (ختم نبوت کے ساتھ مامورین من اللہ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مامور من اللہ صرف رسولؐ ہوتا تھا۔ لہٰذا رسولؐ اللہ کے بعد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی اُمّت کا منتخب کردہ امام، یا خلیفہ ہوتا تھا)۔ منصب اور فریضہ دونوں کا ایک تھا۔ یعنی دین کے نظام کا قیام جس میں قوانینِ خداوندی (قرآن مجید) کی اطاعت کرائی جائے۔ یہ نظام خلافتِ راشدہ تک قائم رہا۔ اُس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ پیدا ہوا نہ سیاسی پارٹی۔ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے لئے ایک سنٹرل اتھارٹی موجود تھی اور اس طرح اُمّت کی وحدت قائم تھی۔ انتظامی مقاصد کے لئے یہ وسیع و عریض مملکت بے شک مختلف ولایتوں (صوبوں) میں منقسم تھی لیکن ان سب کی سنٹرل اتھارٹی ایک ہی تھی۔ اس قسم کے انتظام کا ذکر خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (۴/۵۹)۔ "اے جماعتِ مومنین! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور ان حاکموں کی جنہیں اسلامی نظام نے کچھ اختیارات سونپے ہوں"۔ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الآخر... (۵۹/۴) " اگر تم میں اور ان حکام میں کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کے رفع کرنے کے لئے اللہ اور رسول یعنی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی طرف رجوع کرو۔ تم اس طریق پر قائم رہے تو پھر سمجھا جائے گا کہ تم صاحب ایمان ہو۔"

بنی اُمیّہ کے زمانے میں اس نظام کی کیا کیفیت تھی اس کے متعلق تاریخ سے کوئی واضح نقشہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تاریخ بالکلیہ قابل اعتماد نہیں۔ اسے مختلف زوایائے نگاہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ اتنی بات واضح ہے کہ اس زمانے میں بھی کم از کم اُمّت کی سیاسی وحدت قائم تھی۔ بنو عباس کے زمانے میں نہ مملکت کی سیاسی وحدت قائم رہی نہ دین کا وہ نقشہ برقرار۔ مسلمانوں کی الگ الگ خود مختار سلطنتیں قائم ہونی چلی گئیں۔ دوسری طرف سیکولر نظام رائج ہو گیا جس کی وجہ سے سلطنت نے پبلک امور تو اپنے اقتدار میں رکھ لئے اور مذہبی امور علماء کی تفویض میں دے دیئے۔ اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مختلف فرقے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ان میں سے ہر فرقہ کی اتھارٹی الگ الگ تھی۔ چونکہ دین کی سنٹرل اتھارٹی باقی نہ رہی اس لئے اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ " کا صحیح مفہوم بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے معنی ہو گئے۔ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسولؐ کی اطاعت۔ اس سے یہ سوال ابھرا کہ اللہ کی اطاعت سے مراد تو اس کی کتاب کی اطاعت ہوئی۔ اس کے رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ رسولؐ کی اطاعت، حضورؐ کی طرف منسوب احادیث کی رُو سے کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے احادیث کے مختلف مجموعے مرتّب کئے گئے۔ لیکن ان احادیث میں باہمدگر اختلاف تھا۔ اس لئے ان کی رُو سے اطاعت میں بھی اختلاف ہو گیا۔ مختلف فرقوں کا وجود اس اختلاف کا فطری نتیجہ تھا۔ اُمّت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سنٹرل اتھارٹی کے نہ رہنے سے، کس طرح دین کا نظام بھی ختم ہو گیا اور اُمّت کی وحدت بھی معدوم!

یہ ہے وہ کیفیت جو ہمارے ہاں صدیوں سے مسلسل چلی آ رہی تھی۔ کروڑوں افراد پر مشتمل مسلمان افراد کا بے شک نام تو ایک ہے (یعنی مسلمان) لیکن اس نام کے سوا ان میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ مذہب میں ہوتا ہی یہی ہے۔ آپ عیسائیوں کے ہاں دیکھئے۔ دنیا میں ان کی آبادی مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے لیکن ان میں اشتراک صرف نام کا ہے۔ عیسائیت کا مذہب ان کی وجہ جامعیت نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی سلطنتیں باہمدگر مصروف جنگ و قتال رہتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں بنیادی طور پر عیسائی مملکتوں کے مابین ہی تھیں۔ ان عیسائیوں میں مشترک قدر اتنی ہی ہے کہ وہ اتوار کے دن گرجوں میں چلے

ہماری حالت

جاتے ہیں یا کرسمس کے تہوار کا جشن مسرت منا لیتے ہیں۔ بعینہ یہی حالت ہم مسلمانوں کی ہے۔ ہم سب اپنا نام مسلمان رکھتے اور اسلام اپنا مذہب لکھتے اور بتاتے ہیں۔ لیکن یہ مذہب مختلف مسلم سلطنتوں میں تو ایک طرف، ایک ہی مقام پر بسنے والے مسلم افراد میں بھی کسی قسم کی یگانگت کا موجب نہیں بنتا۔ مثلاً قرآن کریم نے کہا تھا: وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴:۹۳) ”جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا تو وہ ابدی طور پر جہنم میں رہے گا۔“ یہ تھی قرآن کی رو سے مسلمانوں کے ہاتھوں کسی ایک مسلمان کے قتل کی پاداش۔ اب صورت یہ ہے کہ انفرادی طور پر ہر روز مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں اور اجتماعی طور پر مسلمان مملکتیں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف جنگ و قتال رہتی ہیں۔ مذہب اسلام کا اشتراک انہیں اس سنگین جرم کے ارتکاب سے باز نہیں رکھتا۔ مختلف فرقوں کی یہ کیفیت ہے کہ ہر فرقے کی مسجد الگ الگ ہے اگرچہ ہر فرقہ اپنی مسجد کا رُخ ایک ہی سمت (قبلہ) کی طرف رکھتا ہے۔ باجماعت نماز ادا کر کے سمجھ لیا جاتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ رہنے کا جو تاکیدی حکم دیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی۔ امام کی آواز پر رکوع و سجود کی ادائیگی سے اس خود فریبی میں مبتلا رہا جاتا ہے کہ ”سمع و طاعت“ کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی پوری پوری تعمیل ہو رہی ہے۔ حج کے موقع پر لاکھوں کے میکانکی اجتماع کو اتحادِ اسلامی کا رُوح پرور نظارہ کہہ کر تکبیر کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر رابطہ عالم اسلامی کی سی تحریکوں اور سربراہان مملکت اسلامیہ کی کانفرنسوں سے یہ اطمینان حاصل کر لیا جاتا ہے کہ ہم وحدت اُمت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک قسم کی اجتماعیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى (۵۹:۱۴) ”تم انہیں یکجا دیکھ کر خیال کرو گے کہ یہ واقعی ایک جماعت ہے۔ لیکن ان کا یہ اتحاد محض ان کے جسموں کا یکجا ہونا ہے۔ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔“ دو سال اُدھر جو خود ہمارے ہاں مسلم سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کے ”اتحاد“ کا بھانڈا ابھی حال ہی میں پھوٹا ہے۔ اس میں مصر کے صدر سادات اس اتحاد کی کوششوں میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر ہر ایک سے گلے مل رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجیب الرحمٰن کو کانفرنس میں شریک کرنے اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کے لئے بھی نمایاں ”خدمات“ سرانجام دی تھیں۔ نظر آتا تھا کہ اس شخص کا سینہ دردِ ملت سے لبریز اور اس کا دل اتحادِ اُمت کے جذبہ سے سرشار ہے۔ اب حال ہی میں

یہ بھید کھُلا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں روسی اسلحہ کے لدے ہوئے جہاز قاہرہ ایئر پورٹ سے سیدھے بھارت بھیجے جاتے تھے تاکہ وہ ان کے ذریعہ بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجوں کو شکست دے سکیں[۱] اور اسی سے یہ راز بھی کھُلا کہ صدر سادات سربراہی کانفرنس کے اختتام پر یہاں سے سیدھے بھارت کیوں تشریف لے گئے تھے۔ سوال، عزیزانِ من! کسی ایک مملکت یا کسی ایک سربراہ کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "مذہب" مختلف افراد میں وجہ اخوت اور مختلف مملکتوں میں باعث یگانگت بن سکتا ہے۔ یہ فریب نفس ہے۔ مذہب (خواہ کوئی بھی ہو) نہ کبھی وجہ یگانگت بنا ہے نہ اب بن سکتا ہے۔ یہ صورت تو دین سے پیدا ہوتی ہے۔

اقبالؒ کا پیغام

اور یہ وہ پیغام تھا جسے اقبالؒ عمر بھر عام کرتا رہا۔ سب سے پہلے اس نے اس حقیقت کو واشگاف کیا کہ دین کی رُو سے فرد کی ہستی ربطِ ملت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ یعنی وہی چیز جسے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے تمسک بالجماعت کہہ کر پکارا تھا۔ اسرار و رموز، علامہ اقبالؒ کا سب سے پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است　　جوہر اُو را کمال از ملت است

فرد و قوم، آئینۂ یک دیگر اند　　سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند

فرد می گیرد ز ملت احترام

ملت از افراد می یابد نظام

جاوید نامہ ان کے فلسفہ اور پیغام پر مشتمل بڑی اہم کتاب ہے۔ وہ اس میں ایک مقام پر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اُمت کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے۔۔۔ کہتے ہیں کہ:-

قوتِ دیں از مقامِ وحدت است　　وحدت از مشہود گردد، ملت است

یعنی افراد کی وحدت جب محسوس اور مشہود شکل اختیار کرے تو اسے ملت یا جماعت یا اُمت کہا جاتا ہے اور یہی وہ وحدت ہے جس سے دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

ارمغانِ حجاز ان کا آخری مجموعۂ کلام ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ وہ اس میں اس طرح

---

[۱] بعد میں ڈپلومیٹک طریق پر اس کی تردید کر دی گئی۔

متشکل شدہ اُمت کے متعلق کہتے ہیں کہ :-

میانِ اُمتاں والامقام است — کہ آں اُمت دو گیتی را امام است
نیاساید زکارِ آفرینش — کہ خواب و خستگی بر وے حرام است [1]

اسی سلسلہ میں آگے ایک قطعہ ہے جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ دین کا پورا نظام اور اُمت اور اس کے نصب العین کا باہمی ربط اس کے اندر سمٹ کر آگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس اُمت کی کیفیت یہ ہے۔

بپرد در وسعتِ گردوں یگانہ — نگاہِ اُو بہ شاخِ آشیانہ
مہ و انجم گرفتارِ کمندش — بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

پرندے دن بھر فضا کی پہنائیوں میں محو پرواز رہتے ہیں۔ وہ سینکڑوں میل تک دور دور نکل جاتے ہیں لیکن اپنے آشیانے کا تصور ایک ثانیہ کے لئے بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اور وہ دن بھر کی تگ و تاز کے بعد شام کو پلٹ کر اُسی آشیانے میں آجاتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کی بھی یہی کیفیت ہے وہ رزمگاہِ حیات کے ہر گوشے میں مصروفِ تگ و تاز رہتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں منہمکِ سعی و عمل رہتی ہے۔ لیکن اپنا نصب العینِ حیات اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ اور اسی وحدتِ نصب العین سے اس قوم میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ چاند اور ستاروں تک اس کی کمند میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور اقوامِ عالم کی تقدیر اس کے ہاتھ میں۔

وحدتِ نصب العین کی اسی بنیادی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان حسین و بلیغ الفاظ میں مرکوز کر دیا ہے کہ :-

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ؟ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، ہم رسمی طور پر اُمتِ محمدیہ اور ملتِ اسلامیہ جیسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اقبالؒ اس ملت کو (یعنی ہم مسلمانوں کو) وہ ملت ہی نہیں قرار دیتا جسے قرآن کی روشنی میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے متشکل فرمایا تھا۔ وہ ارمغانِ حجاز میں لکھتے ہیں :-

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است — زکارش جبرئیل اندر خروش است

---

[1] یعنی وہ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵) کی خدائی صفت کی علیٰ حدِ بشریت مظہر ہوتی ہے۔

بیا نقشِ دگر ملّت بریزیم — کہ ایں ملّت جہاں را بارِ دوش است

اس نشأۂ جدیدہ کی رُو سے متشکل ہونے والی ملّت کے متعلق اگلے قطعہ میں ہے :-

دگر ملّت کہ کارے پیش گیرد — دگر ملّت کہ نوش از نیش گیرد

نگر و دیا یکے عالم رضا مند — دو عالم را بہ دوشِ خویش گیرد

اقبالؒ، نازی ازم، فاشزم یا کمیونزم کی طرح فرد کو ملّت میں گم کر کے اس کے جداگانہ تشخص کو مٹا نہیں دیتا۔ وہ افراد کا تشخص قائم رکھتا ہے اور اسی کو ملّت کی قوت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ

بانگِ درا میں ہے :-

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے — یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

جماعت کی اہمیت کے بعد اقبالؒ دین کے نقطۂ ماسکہ کی طرف آتا ہے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ اسلامی نظام کی سنٹرل اتھارٹی اس وحدت کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اقبالؒ اسے مرکزِ ملّت کہہ کر

مرکزِ ملّت

پکارتا ہے۔ یہاں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ مرکزِ ملّت سے مراد کوئی ایک فرد نہیں۔ اسلامی نظام میں سنٹرل اتھارٹی یا مرکزی حکومت کی جو شکل بھی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اُمّت کے باہمی مشورہ سے متعین کر لی جائے گی، اسے مرکزِ ملّت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس مرکزی اتھارٹی کے متعلق اقبالؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے۔ وہ اسرارِ و رموز میں کہتے ہیں :-

قوم را ربط و نظام از مرکزے — روزگارش را دوام از مرکزے

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است — خطِ اُو در نقطۂ او مضمر است

اس سلسلے میں وہ مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو دیکھو۔ جب ان کی مرکزیت باقی نہ رہی تو ان کا سارا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ لکھتے ہیں :-

عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر — از مآلِ اُمّتِ موسےٰ بگیر

• داد چوں آں قوم مرکز را ز دست — رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

وہ موجودہ مسلمانوں کی لامرکزیت پہ خون کے آنسو بہاتے ہیں اور ان کے تمام امراض کی علت اسی کو قرار دیتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز کے دو تین قطعات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں :-

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است — ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کارِ بے نظامِ او چہ گویم — تو می دانی کہ ملت بے امام است

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

شبے پیشِ خدا بگریستم زار! — مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد! نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

وہ لامرکز قوم کی تمام جدوجہد کو سعیٔ لاحاصل قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

ازاں فکرِ فلک پیما چہ حاصل — کہ گردِ ثابت و سیارہ گردد
مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد — بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

اسی کو وہ پرندے اور آشیانے کے غیر مرئی ربط کی تشبیہ سے زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے ایک اور قطعہ کا پہلا شعر میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پورا قطعہ اب ملاحظہ فرمائیے :-

چیست ملت؟ اے کہ گوئی لا الٰہ! — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
مردۂ! از یک نگاہی زندہ شو — بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں کہ :-

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی — ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!

میں نے پہلے بتایا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا فکری، اعتقادی اور آئینی مرکز خدا کی کتاب قرآن مجید ہے اور ان کے عمل و کردار کا مرکز اسلامی نظام اور اس کی مرکزی اتھارٹی ہے۔ لیکن محسوسات کا خوگر انسان کوئی محسوس مرکز بھی چاہتا ہے جو اس کے نصب العین کی علامت بن سکے۔ دورِ حاضرہ کی مثال میں یوں سمجھئے کہ جب ہم ماسکو کہتے ہیں تو اس سے مراد ایک شہر نہیں ہوتا بلکہ کمیونزم کا محسوس مرکز یا علامت ہوتا ہے دنیا میں کمیونسٹ کہیں بھی ہوں، ان کی فکر و نظر اس محسوس مرکز کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان

کے اس تقاضا کا بھی احترام کیا اور ان کے لئے ایک محسوس مرکز متعین کر دیا۔ یہ مرکز کوئی شہر نہیں بلکہ کعبہ ہے جسے خدا نے اپنا گھر کہہ کر پکارا ہے۔ تعمیرِ کعبہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ دنیا کے توحید پرستوں کا محسوس مرکز بن سکے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی مملکت قائم کی مدینہ اس کا دارالحکومت تھا۔ عام دنیاوی مملکوں کے منہاج کے مطابق اسی شہر کو اس ملت کا محسوس مرکز قرار پانا چاہیے تھا۔ لیکن مدینہ تشریف رکھتے ہوئے بھی حضورؐ کے دل میں یہ مقدس آرزو مچلتی تھی کہ یہ مرکز محسوس کعبہ ہی ہونا چاہیے، حالانکہ اس وقت کعبہ، اسلام کے مخالفین کے قبضے میں تھا۔ قرآن کریم نے حضورؐ کی اس آرزو کو ان حسین الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔ (۲/۱۴۴) "ہم دیکھ رہے ہیں کہ تیری نگاہیں کس طرح بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہارے پسندیدہ مرکز کو یقیناً تمہاری تولیت میں دے دیں گے"۔ چنانچہ آخر الامر کعبہ کی تولیت اس نظام کی تحویل میں آ گئی اور اسے امتِ مسلمہ کے لیئے قبلہ قرار دے دیا گیا۔ قبلہ کے معنی ہوتے ہیں وہ شے جو ہر وقت کسی کے پیش نظر رہے۔ اسی کو نصب العین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس امت سے کہا گیا۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ۔ (۲/۱۴۴) "تم جہاں کہیں بھی ہو اپنی نگاہیں اسی مرکز کی طرف مرکوز رکھو"۔ اس کے مفہوم کو اور وضاحت سے سمجھنے کے لئے اقبالؒ کے اس شعر کو پھر سے سامنے لائیے۔ جسے میں پہلے بھی پیش کر چکا ہوں کہ:۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ   نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

اقبالؒ نے اسرار و رموز میں، اس مرکز کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔

قوم را ربط و نظام از مرکزے   روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و رازِ ما بیت الحرام   سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام
تو ز پیوندِ حریمے زندۂ   تا طوافِ او کنی، پائندۂ

در جہاں جانِ امم جمعیت است
در نگر، سرِ حرم جمعیت است

اور ارمغانِ حجاز میں قبلہ کی غایت اور امت کے ساتھ اس کے قلبی روابط کو ایسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے

ہے کہ نگۂ بصیرت اس پر غور کرنے سے وجد میں آجاتی ہے۔ کہا:۔

حرم، جز قبلۂ قلب و نظر نیست   طواف او طواف بام و در نیست

میان ما و بیت اللہ، رمزے ست   کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ آج دنیا کی مختلف مملکتوں کے اپنے اپنے محسوس مراکز ہیں۔ ماسکو، پیکنگ واشنگٹن وغیرہ۔ لیکن یہ انسانوں کے وضع کردہ نظاموں کے قومی مراکز ہیں۔ اس کے برعکس کعبہ، نہ انسانوں کے وضع کردہ نظام کا نصب العین ہے اور نہ ہی (آجکل کی اصطلاح میں) کسی قوم کا مرکز؛ وہ ضابطۂ خداوندی کی اطاعت کا محسوس مرکز ہے جسے تمام نوعِ انسان کا مرکز بننے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ دنیا میں رائج سیکولر نظام اس قسم کے مرکز سے محروم ہے۔ اس لئے اس کی رُو سے نوعِ انسان کی عالمگیر برادری متشکل نہیں ہو سکتی جو قرآن کی غایت الغایات ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ کہتا ہے کہ:۔

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے   حرم کا راز توحیدِ اُمم ہے

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب   کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

اقبالؒ کے زمانے میں "لیگ آف نیشنز" قائم ہوئی تھی جس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں تھا۔ اس نظام اور قرآنی نظام کے فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اقبالؒ نے کہا کہ:۔

مکےّ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام

جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ قرآن کریم کی رُو سے دین کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی خدا کی کتاب کو ضابطۂ حیات تسلیم کرنے کی بنا پر اُمّتِ واحدہ کی تشکیل۔ اس اُمت کی ایک مملکت، اس مملکت کی ایک سنٹرل اتھارٹی جسے اقبالؒ نے مرکزِ ملت کہہ کر پکارا ہے۔ اس پورے نظام کو قرآن کریم نے الاسلام کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان اجزاء میں سے کوئی ایک جزو بھی باقی یا اپنی اصل شکل پر قائم نہ رہے تو اسلام، اسلام نہیں رہتا۔ اس آئینہ میں دیکھئے تو قرآنی اسلام دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اسلام، مذہب ہی کی شکل میں موجود ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے بڑی شدت سے محسوس کیا جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک اسلام کا نظام قائم نہیں ہوتا، اُمّت میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اتنا عظیم اور وسیع تھا کہ وہ، بحالاتِ موجودہ ایک ہی

جست میں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس منزل تک بتدریج ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اس پروگرام کی ابتداء کسی ایک خطۂ زمین سے کی جائے۔ انہوں نے، علامہ جمال الدین افغانیؒ کے ناکام تجربہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی قومی مملکتیں قائم ہیں اور کوئی مملکت بھی اپنے اس جداگانہ تشخص کو ملت کی وحدت میں گم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے یہ سوچا کہ اس پروگرام کا آغاز کسی ایسے خطۂ زمین سے ہو سکتا ہے جہاں پہلے سے کوئی مملکت قائم نہ ہو۔ اس کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا اور اس تصور کو قائد اعظمؒ کی مجاہدانہ تگ و دو نے ایک محسوس مملکت کی شکل

مملکتِ پاکستان

میں متشکل کر دیا۔ یہ ایک ایسا عظیم انقلاب تھا جس کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس سے پھر اُسی دین کے احیاء کے امکانات تابندہ اور روشن ہو گئے جسے صدرِ اول میں محمد رسول اللہ والذین معہٗؓ کے مقدس ہاتھوں نے قائم کیا تھا۔ اس سے آپ اس خطۂ زمین کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔

لیکن وائے برحال ما! کہ اقبالؒ کا یہ خواب، خوابِ پریشاں ہو کر رہ گیا۔ پاکستان، مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت ہی نہ بن سکا۔ اور اس میں اسلام، مذہب کی حیثیت ہی سے رائج رہا۔ یہ دین کے نظام کی جولانگاہ نہ بن سکا۔ اس کی وجوہات متعدد قرار دی جا سکتی ہیں لیکن میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ اور اساسی سبب ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے اس بدنصیب ملک میں جماعتِ اسلامی کا وجود۔ مجھے اس کا اچھی طرح سے احساس ہے کہ میرے اس کہنے پر بہت سی بھویں تنیں گی، بہت سی پیشانیوں پر بل پڑیں گے۔ بہت سے چہرے خشمگین اور بہت سے دہن کف آگیں ہوں گے۔ میرے خلاف پروپیگنڈے کے سمندر میں ایک نیا تلاطم برپا ہو گا۔ لیکن عزیزانِ من! میں جس بات کو حقیقت اور صداقت

جماعتِ اسلامی

سمجھتا ہوں، مخالفوں کا ہجوم مجھے اس کے اظہار و اعلان سے باز نہیں رکھ سکتا۔ میں پچیس سال سے ان کے اس پروپیگنڈے کا ہدف بنتا چلا آ رہا ہوں۔ میں جب اس طویل عرصے میں اس حقیقت کے اظہار سے رُک نہیں سکا تو اب، عمر کے اس آخری حصے میں، جبکہ میں جانتا ہوں کہ خدا کی بازپرس کا دن قریب آ رہا ہے، میں اظہارِ صداقت سے کیوں باز رہوں۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری قوم بڑی جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس لئے وہ کسی تحریک پر اُس کے آغاز میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی عادی نہیں رہی۔ اس کی یہی جذباتیت تھی جس سے تحریکِ احمدیت اس

طرح بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ مرزا غلام احمد نے اپنا تعارف ایک مناظر کی حیثیت سے کرایا اور بظاہر اسی مقصد کے لئے اپنی پہلی کتاب "براہین احمدیہ" شائع کی۔ قوم نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی مدح وستائش میں غلغلے بلند کر دیئے۔ اس نے بنظر غائر یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اس تحریک کا رُخ کس منزل کی طرف ہے حالانکہ مرزا صاحب نے بعد میں خود اس امر کا اظہار کیا کہ اس کتاب میں ان کے بعد کے دعاوی بین السطور چھپے ہوئے تھے اور یہ کہ انہوں نے یہ انداز اس لئے اختیار کیا تھا کہ یہاں کے علماء اس "پیچ" میں پھنس جائیں (بحوالہ اربعین نمبر ۲۔ صفحہ ۲۱) مسلمانوں کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب وہ تحریک اپنے برگ و بار لا چکی تھی۔ اس قوم (بالخصوص پنجابی مسلمانوں) کی یہی وہ جذباتیت اور عجلت پسندی ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت کرلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اُترتا ہے بہت جلد

مودودی صاحب جب حیدر آباد (دکن) سے پنجاب آئے ہیں، تو انہوں نے پنجابی مسلمان کی اس طبیعت کا خوب اندازہ لگایا۔ میرے ان کے ساتھ اس سے بہت پہلے سے مراسم تھے۔ لیکن اس وقت تک میرا اُن سے تعارف صرف ان کی تحریروں کے ذریعے تھا۔ (میرے مضامین بھی ان کے رسالہ ترجمان القرآن، میں چھپا کرتے تھے) میں یہاں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی بحثوں میں، ذاتیات کو درمیان میں نہیں لایا کرتا۔ لہٰذا اس مقام پر بھی صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ حیدر آباد سے پنجاب جاتے وقت وہ اپنے مسکن دہلی میں کچھ دنوں کے لئے ٹھہرے تو ان کی اکثر نشستیں میرے مکان (واقعہ نئی دہلی) پر ہوتی رہیں۔ اس وقت مجھے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے ان کی طبیعت میں اس قسم کے جراثیم محسوس کئے اور دبی زبان سے انہیں اس سے متنبہ بھی کیا۔ اُس وقت تک وہ ماڈرن ٹائپ کے نوجوان صحافی تھے۔ دار الاسلام جا کر انہوں نے مذہبی لبادہ اوڑھا۔ اور اس کے بعد پنجاب کے مرکزی مقام لاہور میں اپنی علیحدہ جماعت کی بنیاد رکھی۔ ان کی جماعت کے پہلے اجتماع کی روئیداد ان کے رسالہ۔ ترجمان القرآن کی جون جولائی اگست ۱۹۴۱ء کی مشترکہ اشاعت میں درج ہے، اور ہر صاحب

بصیرت کو آج بھی دعوتِ غور و فکر دیتی ہے۔ اس اجتماع کی افتتاحی تقریر میں مودودی صاحب نے اس کی اہمیت کے سلسلے میں فرمایا کہ:-

"اسلام بغیر جماعت کے نہیں ہے اور جماعت بغیر امارت کے نہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے مطابق ضروری ہے کہ جماعت بننے کے ساتھ ہی آپ اپنے لئے ایک امیر منتخب کر لیں۔" (ترجمان القرآن ص۳۳)

جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (یا بعض روایات کی رُو سے حضرت عمرؓ) نے فرمایا تھا کہ "جماعت کے بغیر اسلام نہیں" تو ظاہر ہے کہ جماعت سے مراد اُمّتِ واحدہ تھی۔ لیکن مودودی صاحب اس اُمّت کے اندر اپنی جماعت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور اس کی سند میں یہ ارشادِ نبویؐ (یا فاروقیؓ) پیش کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مودودی صاحب نے فرمایا کہ اس جماعت کے بغیر، جواب متشکّل کی جارہی ہے، اسلام نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کا نام **اسلامی جماعت** رکھا۔ اب رہی اس کے امیر کی پوزیشن، سو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:-

"اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں، جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا ایک جزء ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل، اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔

(ہدایات نمبر ۴۷)

مودودی صاحب کا مقام

آپ غور کیجئے کہ یہ دعاوی کس قدر خطرناک مستقبل کا پیش خیمہ تھے۔ اسلامی جماعت وہ جماعت جس کے بغیر اسلام نہیں اور اس کے امیر کی اطاعت "خدا اور اس کے رسول کی اطاعت" کے مرادف۔ یا للعجب!

رسولؐ کی اطاعت کے سلسلے میں مودودی صاحب نے کہا کہ یہ اطاعت احادیث کی رُو سے کی جاسکتی ہے لیکن اُنہی احادیث کی رُو سے، جسے "مزاج شناسِ رسول" "صحیح احادیث قرار دیدے۔ اس

جماعت کے نزدیک "مزاج شناس رسول" خود مودودی صاحب ہیں۔ احادیث کے متعلق بعینہٖ یہی مسلک مرزا غلام احمد... کا تھا۔ انہوں نے اس ضمن میں کہا تھا کہ:۔

"جو شخص حکم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرے میں جس انبار کو چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرلے اور جس ڈھیر کو چاہے، خدا سے علم پا کر رد کر دے۔"

(تحفہ گولڑویہ۔ صفحہ ۱۰)

• مزاج شناس رسولؐ کے ساتھ ہی اس جماعت نے مودودی صاحب کے متعلق یہ عقیدہ عام کیا کہ:۔

"مودودی صاحب کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

(ماہنامہ فاران۔ بابت جون ۱۹۵۲ء)

اس جماعت کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اس تمام تفصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ جب کہا کہ:۔

"مولانا مودودی اس زمانے میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور سند ہیں"۔

(جریدہ قاصد۔ کشمیر نمبر۔ بحوالہ ماہنامہ الفرقان۔ مئی جون ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۹)

مودودی صاحب نے جس زمانے میں اپنی جماعت کی تشکیل کی ہے۔ انہی دنوں انہوں نے ترجمان القرآن (بابت دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء) میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ "تجدید و احیائے دین"۔ جسے بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے "مجددین" میں سے ایک ایک کا نام لے کر یہ بتایا کہ یہ حضرات اپنے مشن میں کس طرح ناکام رہ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم سے کہا کہ اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ایک آنے والا آئے گا۔ اور جو کچھ ان اسلاف میں سے کسی سے نہیں ہو سکا وہ کچھ کر کے دکھائے گا۔ انہوں نے اس میں لکھا ہے کہ:۔

مقامِ مہدویت

"میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہو گی۔ زندگی کے سارے مسائل کو بخوبی سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی سیاست، سیاسی تدبر، جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا۔ اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید تر ہوگا۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی اُمید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا۔ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے گا۔۔۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا اور ایک زبردست تحریک اٹھائے گا۔ جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو اُلٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری رُوح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائینٹفک ترقی اوج کمال تک پہنچ جائے گی۔"

(ترجمان القرآن۔ صفحات ۴۵۔۴۴)

آپ نے دیکھا کہ مودودی صاحب کس طرح قدم بقدم میرزا غلام احمد کے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک بیّن فرق ہے۔ مرزا صاحب نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ لیکن مودودی صاحب کا مطمحِ نگاہ، حکمرانی کا اقتدار حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ وہ اسلام کے صدرِ اوّل کی مثال پیش کرنے کے بعد "صالحین" سے کہتے ہیں کہ :-

"تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہذا، آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو۔ اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔" (خطبات، صفحات ص۲۲۱، ص۲۲۳، ص۲۳۵)

ان حضرات کے یہی عزائم تھے جن کے پیشِ نظر قائداعظمؒ، تحریکِ پاکستان کے دوران اس کی وضاحت کرتے رہے کہ پاکستان میں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دی جائے گی۔ اور یہاں پہنچ کر بھی انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ :-

"کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جائی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن پورا کریں۔"

(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ ص۶۵)

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مودودی صاحب قائداعظمؒ کے اسقدر مخالف کیوں تھے اور ان کے متعلق اس قسم کا پروپیگنڈا کیوں کیا کرتے تھے کہ ان کی فکر و کردار میں اسلام کی ایک چھینٹ تک بھی نہیں۔ مودودی صاحب خدا اور رسولؐ کے نام پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے اور قائداعظمؒ اسے بدترین قسم کی آمریت تصور کرتے تھے۔

بہرحال، میں کہہ رہا تھا کہ مودودی صاحب، مہدویت کے مقام تک پہنچنے کے لئے کس طرح زمین ہموار کرتے جا رہے تھے۔ اصل یہ ہے کہ انہوں نے اس مقام کے لئے بہت پہلے سے روا رکھ دیا تھا۔ مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی خلافت کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے...... پیشگوئی کی تھی کہ تین سال کے بعد میرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ جو اسلام کے استحکام اور فروغ کا باعث بنے گا۔ مودودی صاحب نے بھی اپنی پیدائش کے

اپنی پیدائش کے متعلق

سلسلے میں کہا ہے۔

"میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (۲۵ دسمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔
میری پیدائش سے ۳ سال پہلے ایک بزرگ، والد مرحوم کے پاس آئے تھے۔
انہوں نے میری پیدائش کی پیشگوئی کی تھی اور والد صاحب سے فرمایا تھا
کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا"

(کتاب تصوف اور تعمیر سیرت۔ صفحہ ۱۵۔ مرتبہ عاصم نعمانی)
شائع کردہ۔ اسلامک پبلیکیشنز۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

مودودی صاحب انہی عزائم کو لے کر پاکستان آئے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب انہوں نے ۱۹۵۳ء کے ختم نبوت کے سلسلے کے ہنگاموں میں دیکھا کہ اس قسم کے کھلے ہوئے دعاوی کے خلاف مسلمانوں کا آخر الامر رد عمل کیا ہوتا ہے تو انہوں نے اس کے متعین اعلان سے اپنے آپ کو روک لیا۔ لیکن اپنی کوشش کو بدستور جاری رکھا۔ انہوں نے اس کی گنجائش بھی پہلے سے رکھ لی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ آنے والا مہدی خود اس کا اعلان نہیں کرے گا۔ لیکن :۔

"اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج

النبوت پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا"۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۴۵-۴۴)

ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اپنی جماعت کے دل میں شمع امید کو روشن رکھنے کے لئے بڑی کارگر ہے۔ اور اب جو کہا جاتا ہے کہ مودودی صاحب کی روزمرہ کی زندگی کی جزئیات تک کا تصویری سوانح تیار کیا جا رہا ہے۔ وہ غالباً اسی موعودہ ظہور کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ (ہفت روزہ سنگرام لاہور۔ بابت ۲۷ تا ۴ فروری ۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۱۳)

یہ تھے عزیزانِ من! وہ عزائم جنہیں لے کر مودودی صاحب پاکستان تشریف لائے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ یہاں کے سادہ لوح مسلمان نے اسے قطعاً نہیں بھانپا، اور تحریک احمدیت کے ابتدائی دور کی طرح اس تحریک کو بھی اسلامی نظام کے قیام اور دین کے احیاء کا ذریعہ سمجھا جاتا آرہا ہے۔ جیسا کہ میں۔۔۔۔ کہہ چکا ہوں، میں نے ان عزائم کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور یہی وجہ ہے جو میں اس جماعت کے یوم تاسیس کے وقت سے بالعموم اور قیام پاکستان کے بعد بالخصوص اس کی التزاماً مخالفت کرتا چلا آرہا ہوں۔ (میں نے تحریک احمدیت کی بھی بہت پہلے سے مخالفت شروع کی تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۳۵ء میں بہاولپور کے مشہور مقدمہ کے فیصلے میں "احمدیوں" کو خارج از اسلام قرار دیا گیا تھا تو اس کی بنیاد میرے ہی ایک مقالہ پر تھی) اور یہی وجہ ہے کہ اس جماعت نے، اور سب کو چھوڑ کر مجھے اپنے پروپیگنڈے کا ہدف بنا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہیں مجھے منکر حدیث قرار دیتے ہیں کہیں منکر اتباع سنت! اور چونکہ اپنی مصلحتوں کے لئے جھوٹ بولنا ان کے نزدیک شرعاً واجب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ میرے خلاف اس قسم کے افترا باندھنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے، بلکہ اسے کار ثواب خیال کرتے ہیں۔

مودودی صاحب اپنے ان عزائم میں اس قدر آگے بڑھتے گئے کہ خود ان کی جماعت کے بعض سربرآوردہ حضرات نے بھی انہیں بھانپ لیا اور انہیں اس پر متنبہ کیا۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی روش سے باز نہ آئے تو ان حضرات نے ان کی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان علیحدگی اختیار کرنے والوں میں (مولانا) امین احسن اصلاحی کا نام سرفہرست تھا۔ جماعت اسلامی میں مولانا صاحب کا مقام، مودودی صاحب سے دوسرے درجہ پر تھا۔ وہ ان کی عدم موجودگی میں، جماعت کے امیر مقرر ہوتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا تعارف ان الفاظ میں کرایا جاتا تھا:۔

"عالم، بلند نظر اور متبحر عالم، جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے، اور مہ و انجم کی گذرگاہوں کا بھی پتہ کرتی ہے۔ دس بیس نہیں، ہزاروں راتیں صرف قرآن کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں۔ جن کی ذات قرآنی علوم کے لئے قابلِ وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسر اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلّم۔"

(ماہنامہ فاران۔ بابت جون ۱۹۵۳ء)

انہی اصلاحی صاحب نے جماعت سے علیحدہ ہونے کے وقت، مودودی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ :-

"آپ اپنے آپ کو نہ صرف جماعت اسلامی کا قائم مقام سمجھتے ہیں بلکہ خود اسلام کا بھی قائم مقام سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر آپ کی کسی حرکت پر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جماعت پر اعتراض ہے۔ اور جب یہ جماعت پر اعتراض ہے تو اسلام پر اعتراض ہے۔ اسی طرح آپ اپنا یہ ذہن بنا بیٹھے ہیں کہ آپ کی ذات اگر کبھی زیر بحث آتی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس ملک میں اقامتِ دین کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا اور لادینی طاقتیں غالب ہو جائینگی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچنے کے اس انداز کو بدلیں۔ خدا نے اسلام کو نہ آپ کے ساتھ باندھا ہے نہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ۔ اگر آپ اسلام کا کام کرنے اُٹھے ہیں۔ تو خدارا اس کی یہ قیمت نہ مانگئے کہ اگر آپ اسلام پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگ جائیں تو بھی لوگ اس کو جاننے کے باوجود چُپ رہیں، کیونکہ اس سے اقامتِ دین کے جہاد کو نقصان پہنچ جائے گا۔"

لیکن مودودی صاحب (روپے کے بل بوتے پر) ایسی پوزیشن حاصل کر چکے تھے کہ ان حضرات کی جماعت سے علیحدگی انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔ اور وہ اپنے عزائم میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

علامہ اقبالؒ نے اسلامی نظام اور اس میں مرکزِ ملت کا تصور شعر کی زبان میں پیش کیا تھا، جو بہرحال، اشاراتی اور تلمیحاتی ہوتی ہے۔ میں نے ان اشارات کی تفصیل اپنے مقالات اور تصنیفات میں شرح و بسط سے پیش کی۔ اس نظام کے قیام سے اس جماعت کے حصولِ اقتدار اور مودودی صاحب

کے آمرِ مطلق ہونے کی سب اُمیدیں خاک میں مل جاتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس تصوّر کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ میں نے پہلے دن سے یہ التزام رکھا ہے کہ جہاں بھی مرکزِ ملّت کی اصطلاح استعمال ہے اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد اس اسلامی مملکت کی سنٹرل اتھارٹی ہے جو علےٰ منہاج نبوت قائم کی جائیگی۔ میں نے اس نظام کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کے بمنزلہ قرار دیا تھا۔ نظامِ ربوبیّت (قرآن کے معاشی نظام) کے سلسلہ میں بھی میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمّہ داری اس نظام (خلافت علیٰ المنہاج نبوّت) کے سر پر ہوگی۔ اور اس کے اس عظیم ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائع پیداوار اس نظام کی تحویل میں رہیں۔ میں شروع سے آخر تک، سیکولر نظام، اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی شدّت سے مخالفت کرتا چلا آرہا ہوں۔ میری ہزارہا صفحات پر مشتمل تحریریں اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہمارے برسرِ اقتدار طبقہ کی عیاشیوں اور فحاشیوں کا چرچا کرتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی پرویزؔ) کو دیکھئے کہ وہ ایسے لوگوں کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف قرار دیتا ہے، اور ان کے سپرد ذرائع پیداوار کرنے کو اسلام کا معاشی نظام کہتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال ملاحظہ فرمایئے۔ ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۷۶ء کے اشارات میں تحریر ہے:۔

"اسی طرح آپ "نظامِ ربوبیّت" پر غور کریں۔ یہ اصطلاح اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دینی اصطلاح ہے۔ اور اسے سُن کر کسی سلیم الفطرت انسان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقش ہی اُجاگر ہوتا ہے۔ کیونکہ کائنات کے خالق نے انسان کی ساری احتیاجات کا بطریقِ احسن انتظام کر رکھا ہے۔ اس ذات نے ایک طرف اگر انسان کی مادی احتیاجات کی تسکین کے لئے ذرائع و وسائل مہیا کئے اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں تو دوسری طرف انسان کی روحانی پیاس بجھانے اور اس کے اخلاقی احساسات کو زندہ رکھنے کا بھی پورا پورا التزام کیا ہے۔ لیکن مادی فلسفہ حیات خصوصاً اشتراکیت کے زیرِ اثر اس مقدس اصطلاح کو اس طرح بگاڑا گیا ہے کہ اُسے سُنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسے نظام کا تصوّر آتا ہے جس میں انسانوں کا ایک محدود سا گروہ مرکزِ ملّت کے نام پر نہ صرف کسی

ملک کے وسائلِ رزق پر قابض ہو، بلکہ اس کے سیاہ و سفید کا بھی پوری طرح مالک ہو۔ اور پھر وہ اپنی صوابدید کے مطابق عوام کو روٹی کے نوالے تقسیم کرے۔ کیا اس اصطلاح کے پردے میں اشتمالیت کا پرچار نہیں کیا جا رہا؟ یہ اصطلاح جب جدید مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً وضع ہی اس غرض کے لئے کیا گیا ہے کہ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ کسی ملک کے وسائلِ معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری صرف اشتراکیت کا ہی طرۂ امتیاز نہیں بلکہ اسلام بھی اس قسم کے جابرانہ نظام کا علمبردار ہے۔"

اس سے ہمارے سادہ لوح عوام کے دلوں میں میرے خلاف جس قسم کے جذبات نفرت اور خود مرکزِ ملّت کی اصطلاح کے خلاف جس قسم کا باغیانہ تصوّر اُبھرے گا وہ ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے یہ حضرات ایک طرف علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ اور میرے وضاحت کردہ اسلامی نظام کا اس قدر بھیانک اور نفرت انگیز تصوّر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ مودودی صاحب کی شخصیت کو اُبھارتے چلے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلے سال انہوں نے ان کو "اللہ کے شاہکار" کے لقب سے بھی نوازا تھا۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! مختصر سی تفصیل اس نکتہ کی، جسے میں نے پہلے پیش کیا کہ اگر مودودی صاحب کے عزائم کی علمبردار اسلامی جماعت یہاں نہ اُٹھتی تو اس خطۂ زمین میں اسلامی نظام، یعنی مملکت علیٰ منہاج النبوّت" کے قیام کے امکانات بڑے روشن تھے۔ اگر علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اس جماعت کی بھی اسی طرح مخالفت کرتے جس طرح انہوں نے "احمدیوں" کی تحریک کی مخالفت کی تھی، اس لئے کہ وہ اس خطۂ زمین میں اسلامی نظام کے احیاء کی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ ان کے ایمان کا تقاضا اور عشق کا منتہیٰ تھا۔ اور یہی کیفیت عزیزانِ من! اس ذرّۂ ناچیز کی بھی ہے۔ صدیوں کے بعد یہ حسین اور تابناک تصوّر ہمارے سامنے آیا تھا۔ کوئی شخص جس کی نگاہوں میں قرآنی بصیرت اور سینے میں دردِ اسلام سے لبریز دل ہے، اس تصوّر کو یوں برباد ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔

کے توانم دید زاہد جامِ صہبا بشکند
می پرد در چشم حبابے گر بدریا بشکند

آخر میں، میں پھر اس امر کی وضاحت کر دوں کہ اسلامی نظام کے احیاء اور قیام کے لئے جب بھی کہیں کوششیں شروع ہوں گی تو اس کا قیام ایک دن میں عمل میں نہیں آسکے گا۔ یہ بتدریج رفتہ رفتہ متشکل ہو سکے گا۔ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں یہی نقشہ تھا اور میں بھی اسی کی وضاحت کرتا چلا آرہا ہوں کہ ابتداءً مسلمانوں کی مختلف موجودہ مملکتوں کے وجود اور تشخص کو برقرار رہنے دیا جائیگا لیکن ان میں ایک ایسا مرکزی وفاق قائم کیا جائیگا جس کی بنیادی شرط یہ ہو گی کہ یہ مملکتیں باہمدگر کبھی آمادہ بہ جنگ نہیں ہوں گی۔ ان کے اختلافی امور کے فیصلے اس آفاقی مرکز کی رُو سے ہوں گے، اور جہاں تک ان کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، ان میں سے کسی ایک کا دشمن، ان سب کا دشمن قرار پائے گا۔ ان کے آئین اور قوانین کی سند اور حجت خدا کی کتاب قرآن کریم ہو گی۔ اسی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کریں گے۔ ایسا کرنے میں ظاہر ہے کہ اس وقت جتنے قوانین، شریعت کے نام سے رائج ہیں، تدوین قوانین کے سلسلہ میں وہ ان سے استفادہ کریں گے۔ ان کے اس طرح مدون اور نافذ کردہ قوانین کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت کی اتھارٹی ختم ہو جائے گی۔ اور اگلی شرط یہ کہ ان مملکتوں کے ارباب اقتدار کی سیرت اسوۂ محمدیؐ کے رنگ میں رنگی ہو گی۔ اس طرح آغازِ کار ہو گا تو پھر رفتہ رفتہ ایک دن یہ اُمت، اُمتِ واحدہ بن جائے گی۔ ان کا ایک ہی ضابطۂ قوانین ہو گا۔ ایک ہی مملکت اور اس مملکت کی ایک ہی سنٹرل اتھارٹی۔ جس کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے بمنزلہ قرار پائے گی اور یہی وہ وحدت ہو گی جو آخر الامر وحدتِ انسانیہ کے اجتماعی نظام پر منتج ہو گی۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ جب تک ایسا نہ ہو، مذہبی ارکان کی ادائیگی (نماز، روزہ وغیرہ) کے سلسلہ میں اُمت جن طریقوں پر چلی آرہی ہے۔ ان میں کسی قسم کا ردوبدل یا حک و اضافہ نہ کیا جائے۔ البتہ ان میں جو امور قرآن کے خلاف ہوں، ان کی نشاندہی کی جائے۔ اور آخری بات یہ کہ یہ اُمت، بُری بھلی جیسی بھی ہے، اس کے ساتھ وابستہ رہا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کہیں ان دلدوز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

کہن شاخے کہ زیرِ سایہ اُو پر برآوردی!
چو برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

اور کہیں ان حسین اور سادہ الفاظ میں کہ:-

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رُخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملّت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

(بانگِ درا)

لیکن اس کے ساتھ، یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اس پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں کہ یہ زندگی، اسلامی زندگی ہے۔ ایسا سمجھنا فریبِ نفس ہوگا۔ سمجھا یہی جانا چاہئے کہ یہ ہماری اضطراری حالت ہے۔ جس سے نکل کر، دین کے نظام کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہمارا فریضۂ حیات ہے۔ یاد رکھئے۔ جن کوششوں کو اس وقت "اسلامی خدمات" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ سب "مذہبِ اسلام" کی تقویت اور فروغ کی کوششیں ہیں نہ کہ دینِ اسلام کی۔ اور اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کیجئے کہ مذہب جس قدر آگے بڑھتا جائے گا، دین اُسی قدر پیچھے ہٹتا چلا جائے گا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے، خدا آپ کو توفیق دے تو آپ (ارمغانِ حجاز میں) اقبالؒ کی مایۂ ناز نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔ اس میں ابلیسؒ نے اپنے مشیروں سے کہا یہ ہے کہ :-

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمّت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس اُمّت کو بدستور سلائے رکھنے کی تدبیر یہ ہے کہ :-

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس وقت، اسلام کے فروغ کے نام سے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ اس اُمّت کو مزاج عجمی ہی میں پختہ تر کرنے کا ذریعہ ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! ذکرِ اقبالؒ کے سلسلہ میں میرا آج کا پیغام۔ والسّلام!

تتمّہ خطاب

اس خطاب کے سلسلے میں بعض حضرات نے کچھ سوالات دریافت کئے اور بعض نے اس کے چند ایک نکات کی وضاحت چاہی۔ میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ لہٰذا اس وضاحت کو اس تتمّہ کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔

سوال: آپ نے کہا ہے کہ تھیاکریسی کی بدترین شکل انفرادی آمریت ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے مرزا غلام احمد اور مودودی صاحب کو ایک ہی پلڑے میں رکھا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔

جواب: میں نے مرزا صاحب اور مودودی صاحب کو ایک ہی پلڑے میں نہیں رکھا۔ جہاں تک ان کے دعاوی کا تعلق ہے ان کا پلڑا بے شک ایک ہی ہے۔ لیکن جہاں تک ان کی تحریکوں کا تعلق ہے، مودودی صاحب کی تحریک، تحریکِ "احمدیت" سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

آپ پہلے انفرادی آمریت کو لیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رُشد و ہدایت کا سلسلہ اس طرح رہا ہے کہ ایک رسول آتا، لوگوں تک دینِ خداوندی پہنچاتا اور اپنے دائرے کے اندر اسے قائم بھی کر دیتا۔ ازاں بعد جب وہ دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تو پھر ایک اور نبی آ جاتا، اور وہ اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے مذہب کو دین میں بدل دیتا۔ یہ سلسلہ انفرادی تھا۔ یعنی یہ فریضہ ایک فرد سرانجام دیتا تھا، جسے نبی یا رسول کہا جاتا تھا۔ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس پر پہنچنے کے بعد مشیّتِ خداوندی نے اپنے اس پروگرام میں تبدیلی کی۔ افراد کا سلسلہ ختم کر دیا اور اس کی جگہ نظام نے لے لی۔ یہی ختمِ نبوّت کی اصل و اساس اور علم اور غایت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تبدیلی خود نوعِ انسان کی تاریخ میں ایک بہت بڑے انقلاب کا آغاز تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دنیا سے تشریف براری کے بعد یہ نظام بدستور قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دستِ مبارک سے رکھوا دی گئی تھی۔ جہاں تک وحیٔ خداوندی کا تعلق تھا اس میں نہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی فکر کا کوئی دخل تھا، اور نہ ہی کسی سے کوئی مشورہ لینے کا

سوال۔ لیکن جہاں تک وحیٔ خداوندی کی رو سے عملی نظام کا تعلق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۸) "تم، معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو" اسی حکم کی پابندی جانشینانِ رسولؐ کے لئے بھی لازم قرار دی گئی اور ان کے متعلق کہا گیا، وَ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے" لہٰذا اس نظام میں، جہاں تک وحی کا تعلق تھا، وہ قرآن کریم کی شکل میں موجود تھی اور جہاں تک نظام کے عملی مسائل کا تعلق تھا اس کے لئے اُمت کے باہمی مشورہ کا حکم تھا۔ لہٰذا اس نظام میں، فرد کی دینی حیثیت کچھ نہیں تھی۔ خود خلیفۃ الرسولؐ کی طرف سے جو احکام و قوانین نافذ ہوتے تھے وہ بھی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی حیثیت سے ہوتے تھے۔ اس فرد کی ذاتی حیثیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ نہ وہ مامور من اللہ ہوتا تھا اور نہ ہی دین میں سند قرار پاتا تھا۔

جب اس نظام کا سلسلہ منتشر ہوا تو دین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اس مذہب میں اگرچہ مختلف فرقوں کی نسبت مختلف آئمہ (افراد) کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن ان آئمہ میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ دین میں سند میری ذات ہے۔ یہ دعویٰ مرزا غلام احمد نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام وہی اسلام ہے جسے میں اسلام قرار دے دوں۔ جو لوگ اس اسلام کو، اسلام مانیں، وہ مسلمان ہیں۔ جو ایسا نہ مانیں وہ مسلمان نہیں، خواہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتے رہیں۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب ــ ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت میں ملے گی) مرزا صاحب نے کہا کہ اتباعِ محمدیہ سے میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں روحِ محمدی میرے اندر حلول کر چکی ہے۔ اس لئے میں رسول اللہ کا ظل اور بروز ہوں۔ چنانچہ (جیسا کہ میں نے خطاب میں کہا ہے) انہوں نے کہا کہ رسول اللہ کی احادیث میں سے جسے میں صحیح قرار دوں اُسے صحیح سمجھا جائے، جسے میں مسترد کر دوں اسے مسترد کر دیا جائے۔ بعینہٖ یہی پوزیشن مودودی صاحب نے اختیار کی اور احادیث کے سلسلے میں کہا:۔

مرزا غلام احمد اور مودودی صاحب

"جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ

ان میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سُنّتِ نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنّت سے کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی رُوح، روحِ محمّدیؐ میں گم، اور اس کی بصیرت، بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔

(تفہیمات حصہ اوّل)

آپ غور کیجئے کہ کیا مرزا صاحب کے دعویٰ اور مودودی صاحب کی اس حیثیت میں کوئی فرق ہے؟ فرق اتنا ہی ہے کہ مرزا صاحب نے کھلے الفاظ میں دعویٰ کر دیا اور مودودی صاحب نے اس کی احتیاط برتی۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ کھلے طور پر دعویٰ کا اعلان کرنے کے خلاف جمہور مسلمانوں کا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے۔

جس طرح مرزا صاحب نے موجودہ مسلمانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک وہ، جو ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیں اور دوسرے وہ، جو اُن کے اس دعویٰ کا انکار کر دیں۔ انہیں وہ دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ مودودی صاحب نے بھی مسلمانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی موجودہ مسلمانوں کو انہوں نے "پیدائشی مسلمان" قرار دیا اور کھلے بندوں کہہ دیا کہ:-

"ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟"

(ترجمان القرآن۔ ذوالحج ۱۳۵۹ھ صفحہ ۲۱۵)

ان کے برعکس، کھرے، سچے اور سکہ بند مسلمان انہیں قرار دیا جو ان "پیدائشی مسلمانوں" میں سے تجدیدِ ایمان کے بعد ان کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔

جماعتِ اسلامی میں داخلہ کی شرط

ہم نے اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ انہوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں اپنی جماعت کی بنیاد رکھی۔ وضاحت کے طور پر یہ سُن لیجئے کہ انہوں نے اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے شرط کیا قرار دی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا:-

"جماعت اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہو گا۔۔۔۔۔۔ اس دائرے میں آنے کے لئے شرطِ لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو[1]۔۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد اشہدان لاالٰہ الا اللہ واشہدان محمد رسول اللہ ﷺ کہنے کی جرأت کرے۔ صرف وہی جماعت اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے خواہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔"

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ ۸۴)

مرزا غلام احمد نے بھی کوئی نیا کلمہ وضع نہیں کیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے نماز، روزہ یا پرسنل لاز میں کوئی تبدیلی کی تھی۔ لیکن مسلمان وہ انہی کو سمجھتے تھے جو ان کی جماعت میں داخل ہوں۔ بعینہٖ یہی پوزیشن مودودی صاحب نے اختیار کی اور اپنی جماعت کا نام "جماعت اسلامی" رکھا۔ اس جماعت میں داخل ہونے والوں کے متعلق اتنا ہی نہیں کہا کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہیں، یہ بھی کہا کہ ملک میں جتنے قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگ ہیں انہیں اس جماعت میں منظم کر لیا گیا ہے۔ (بحوالہ اعتصام بابت ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء) اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا:

"اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم)

سوال[2]: آپ نے کہا ہے کہ جب مودودی صاحب حیدر آباد (دکن) سے پنجاب کی طرف آئے ہیں تو آپ نے اِن کے دماغ میں ان جراثیم کو بھانپ لیا تھا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ انہوں نے اسے

---

[1] واضح رہے کہ جو لوگ اس طرح اس جماعت میں داخل ہوئے تھے وہ پڑھے لکھے تھے اور کلمہ شہادت کے معنی اچھی طرح سمجھتے تھے (ان میں بعض دین کے عالم بھی تھے)، ان سے بھی تجدیدِ ایمان کرائی گئی تھی۔

(طلوعِ اسلام)

عملی شکل کب دی تھی ؟

جواب :- وہ جب ۱۹۳۷ء کے اواخر یا شاید ۱۹۳۸ء کے شروع میں، پٹھانکوٹ گئے ہیں تو اس وقت حضرت علامہ اقبالؒ حیات تھے۔ اُن کی زندگی میں مودودی صاحب اس قسم کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس

جماعت سازی ممنوع ہے

انہوں نے اُس وقت اعلان کیا تھا کہ اسلام کی رُو سے اُمت کے اندر کوئی الگ جماعت بنانا جائز نہیں۔ انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء میں، ماہنامہ "پیغامِ حق" میں اپنا ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ جس میں یہ لکھا تھا کہ :-

"یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آسکتیں"۔

ضمناً اس زمانے میں خاکساروں کی تنظیم ایک مؤثر جمعیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ مودودی صاحب کے مقالہ میں "وردی" یا ظاہری علامت" سے خاکساروں کی طرف اشارہ تھا۔ علامہ مشرقی (مرحوم) کو آپ جانتے ہیں، وہ کسی کو بخشنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار "الاصلاح" میں مودودی صاحب کو سخت ڈانٹ پلائی، جس کا عنوان تھا :-

"پٹھان کوٹ میں مذہبی بدمعاشی کا نیا اڈہ" !

بہرحال، مودودی صاحب نے اقبالؒ کی زندگی میں تو اس کی جرأت نہ کی، لیکن (ان کی خوش قسمتی اور قوم کی بدنصیبی کہ) حضرت علامہ کا انتقال دو ہی ماہ بعد (اپریل ۱۹۳۸ء میں) ہو گیا اور اس کے بعد انہوں نے اپنے پروگرام کی طرح ڈالنی شروع کر دی۔ میں نے اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ قائدِاعظمؒ جہاں یہ کہتے تھے کہ مطالبۂ پاکستان کا مقصد ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول ہے جس میں قرآنی نظام قائم کیا جائے، اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت

تھیا کریسی کے خلاف

بھی کئے جاتے تھے کہ اس مملکت میں تھیاکریسی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ (مثلاً، جب وہ ۱۹۴۱ء میں) حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے تو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے اس سوال کے جواب میں (کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں) فرمایا:۔

"جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصوّر نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملاّ۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے"۔

اس کے بعد طلباء کی طرف سے پوچھا گیا:۔

"جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہ وہاں اپنے ذہنی میلانات، اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور بروئے ترقی لا سکیں تو پھر اس میں کون سا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے"۔

سوال آپ نے سن لیا۔ اب قائداعظمؒ کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے کہا:۔

"وقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بلا اس بات کے سمجھے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے

باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ انہیں میں، ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔"

اسی حقیقت کی انہوں نے، قیام پاکستان کے بعد، اہل امریکہ کے نام اپنے ایک براڈکاسٹ میں (فروری ۱۹۴۸ء میں) ان الفاظ میں وضاحت کر دی کہ :-

"کچھ بھی ہو۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیا کریسی رائج نہیں ہو گی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل ص ۶۵)

یہی وہ وارننگ، جس سے مودودی صاحب نے سمجھ لیا کہ مجوزہ پاکستان میں، اقتدار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے انہوں نے قائداعظم اور تحریک پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سلسلے میں طلوع اسلام میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ دو ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مودودی صاحب نے لکھا کہ :-

" افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو...... ان کے خیالات، نظریات اور طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔"

تحریک پاکستان کے متعلق کہا کہ :-

" جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔"

یہ تمام عبارتیں ان کی کتاب ۔ سیاسی کشمکش حصہ سوم ۔ میں موجود ہیں۔

اس تحریک کے ماحصل کو کافرانہ اور اس کی قیادت کو فاسقانہ اور فاجرانہ کیوں قرار دیا جا رہا تھا ؟

محض اس لئے کہ نہ یہ تحریک ان کی جماعت کی پیدا کردہ تھی اور نہ ہی اس کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے وہ کہتے تھے کہ :-

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ سوال میرے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرا دیا جائے۔۔۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسلئے میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔۔۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔" (ایضاً)

انہیں مجوزہ پاکستان میں دلچسپی اس لئے نہیں تھی کہ اس میں زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی۔

سوال (۳) :- مودودی صاحب نے تحریک پاکستان کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب یہ واضح نہیں تھا کہ پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم ہو گی، چنانچہ انہوں نے "سیاسی کش مکش، حصہ سوم میں کہا تھا کہ :-

"اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اُن کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔"

مودودی صاحب کو سب کچھ معلوم تھا

اسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ "میرے نزدیک جو سوال سب سے اہم اور اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق، عوام کی حاکمیت پر"۔ اگر یہ بات واضح ہوتی تو وہ کبھی اس کی مخالفت نہ کرتے۔

جواب :- جماعت اسلامی کی طرف سے یہ بات اکثر دہرائی جاتی ہے اور یہ، کذب بافی اور مغالطہ آفرینی کی بدترین مثال ہے۔ یہ شوشہ بھی مودودی صاحب ہی کا چھوڑا ہوا ہے۔ جنوری ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ مسٹر بھٹو نے کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران، مودودی صاحب کی کتاب "مسلمان اور سیاسی کش مکش، حصہ سوم" کے وہ اقتباسات پڑھ کر سنائے جن میں پاکستان کی مخالفت اور قائداعظمؒ کی شان میں گستاخیاں کی گئی تھیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے

بیان دیا جس میں کہا کہ:

"اس کتاب کے مضامین ۴۰-۱۹۳۹ء میں لکھے گئے تھے جب ہنوز قرار دادِ پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کو ایک قومی ریاست کی بجائے اسلامی ریاست کے نصب العین کی طرف موڑ دیا جائے۔"

(روزنامہ امروز و مشرق - مورخہ ۱۰ رجنوری ۱۹۷۰ء)

آپ دیکھئے کہ اس میں کس چابکدستی سے مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کی کوشش کی گئی ہے۔ "سیاسی کشمکش" کے موضوع پر مقالات کا یہ سلسلہ بے شک ۴۰-۱۹۳۹ء سے شروع ہوا ہوگا۔ لیکن تحریک پاکستان اور قائد اعظمؒ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" کی فروری ۱۹۴۱ء و مارچ ۱۹۴۱ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ یعنی قرار دادِ پاکستان کے منظور ہونے کے ایک سال بعد۔ بعد میں یہ مضامین کتابی شکل میں بھی شائع کئے گئے اور قائد اعظمؒ اور تحریک پاکستان کے خلاف مقالات اس کی تیسری جلد میں شائع کئے گئے..... اس جلد پر یہ تو نہیں لکھا گیا کہ وہ کب شائع ہوئی تھی لیکن اس میں جماعت اسلامی کے پہلے اجتماع کا ذکر موجود ہے۔ جو اگست ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس شہادت سے واضح ہے کہ یہ کتاب، کم از کم اگست ۱۹۴۱ء کے بعد شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن کسی میں ان باتوں کی تردید نہیں کی گئی جو تحریک پاکستان اور قائد اعظمؒ کی مخالفت میں کہی گئی تھیں۔

لیکن یہ بات، کہ مودودی صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطالبۂ پاکستان ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول ہے جس میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا، اس سے بھی بہت پہلے کی بات ہے۔ ذرا غور سے سنیے۔ جماعت اسلامی کے ترجمان۔ ایشیا۔ کے ۲۵ اگست ۱۹۶۸ء کے اداریہ میں غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی مختلف تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

"۱۹۳۶ء تک یہی حالت رہی۔ لیکن فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ کی پکار کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ان سب نصب العینوں سے مایوس ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی نجات اسلام میں ہے..... مسلم لیگ نے اس نصب العین کو اپنا لیا ہے۔ اس کے لیڈروں نے ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کی اور دیکھتے دیکھتے پوری مسلمان قوم اس کے علم تلے جمع ہو گئی۔"

اس سے واضح ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے مسلمانانِ ہند نے ایک اسلامی مملکت کا نصب العین اپنے سامنے

رکھ لیا تھا اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے اسے اپنا کر ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کر دی تھی۔"

یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب نے ۱۹۷۰ء میں لاہور میں منعقد اقبال ڈے میں شرکت کی۔ (جہاں تک مجھے معلوم ہے انہوں نے تشکیل پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا اور یہ شاید اس لئے کہ اس وقت الیکشن قریب آرہے تھے) بہرحال، اس تقریب میں انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:-

"اقبالؒ نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔ اقبالؒ نے آپ کو نظریہ دیا۔ اور قائداعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔"

(ایشیا۔ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء)

علامہ اقبالؒ کی وفات اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ لہٰذا ان کی مذکورہ بالا وضاحت بہرحال اس سے پہلے کی بات ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کو کم از کم ابتدا ۱۹۳۸ء میں اس کا علم تھا کہ مطالبہ پاکستان سے کیا مقصود تھا۔ اور "سیاسی کش مکش" کا سلسلہ مضامین (بقول مودودی صاحب) اس کے بعد شروع کیا گیا تھا۔ اور آگے بڑھئے۔ نوائے وقت کی گیارہ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں، ایک رنگین چوکھٹے میں، مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

"قائداعظمؒ کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت، بقاء اور نشوونما کا اصل سرچشمہ اسلام ہے۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں، اسلامی جمہوری نظام قائم کیا جائے گا۔"

ایشیا کی ۱۷ اگست ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا، جس میں انہوں نے کہا کہ

"اگر تحریک پاکستان کے آغاز میں، یہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کے لئے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی یہ ملک وجود میں آتا۔"

خود، مودودی صاحب کے رسالہ۔ ترجمان القرآن۔ کی جون ۱۹۶۵ء کی اشاعت کے "اشارات" ان الفاظ سے شروع ہوتے ہیں:-

"برعظیم ہند کے سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں باشندے اور پوری دنیا کا پریس اس حقیقت پر گواہ ہے کہ تحریک پاکستان کے پیچھے نہ کوئی سیاسی غرض کارفرما تھی اور نہ معاشی مصلحت۔ اس کا محرک صرف ایک ہی جذبہ تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا الگ خطۂ ارض مل جائے جس میں وہ بڑی آزادی کے ساتھ اسلامی نظام حیات نافذ کر سکیں۔"

ذرا آگے چل کر لکھا ہے۔

"یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ نظریۂ پاکستان کے بانی اور تحریک پاکستان کے قائد ہر موقع پر مسلمانوں کو یہی کہتے رہے کہ اس ملک کے قیام کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ یہاں اسلام کی ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کی جائے جس سے مادی تہذیب سے ستائی ہوئی انسانیت آرام اور سکون حاصل کر سکے۔"

آپ مودودی صاحب کے ان بیانات کو دیکھئے جن میں کہا گیا ہے کہ تحریک پاکستان کے آغاز سے آخر تک اس کے قائدین واضح الفاظ میں یہ کہتے رہے اور بار بار کہتے رہے کہ اس تحریک اور مطالبہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس قطعۂ زمین میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکے۔ اور اس کے مقابلے میں مودودی صاحب ہی کا ۱۹۴۱ء کا یہ بیان دیکھئے کہ "لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں یہ بات آج تک واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔" اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب کا یہ بیان کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب ہنوز لیگ کی ۱۹۴۰ء کی قرارداد منظور نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس قرارداد کے پاس ہونے کے بعد انہوں نے اسے غیر اسلامی تحریک کہہ کر اس کی مخالفت نہیں کی تھی لیکن اس کا کیا جواب کہ ان کی مخالفت کا یہ سلسلہ تشکیل پاکستان تک جاری رہا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو (یعنی قیام پاکستان سے کوئی چار مہینے پہلے اور اعلان پاکستان سے صرف دو مہینے پہلے) ٹونک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مودودی صاحب سے مسلم لیگ کے بارے میں سوالات پوچھے گئے۔ انہوں نے جواب میں کہا:-

"اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے۔ . . . جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں

کہ وہ اس کا ساتھ دے"۔

(ترجمان القرآن۔ جلد ۳۰ - عدد ۶ - بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر صہ ۳۳)

سوال (۴)۔ جب مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کے آغاز سے لے کر اس کے آخری مرحلے تک اُسے غیر اسلامی قرار دیتے رہے تو پاکستان آنے کے بعد وہ بار بار کیوں کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اس کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی نظام قائم ہو؟

اب اسلام، اسلام کیوں؟

جواب:۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے۔ مودودی صاحب کی اس زمانے میں ساری کوشش یہ تھی کہ لوگ قائدِ اعظمؒ سے منحرف ہو کر انہیں اپنا قائد تسلیم کر لیں اور مسلم لیگ کی بجائے ان کی جماعت کا ساتھ دیں۔ اس کے لئے یہ کہا گیا کہ مسلم لیگ کی تحریک غیر اسلامی ہے اور اس کی قیادت میں اسلامی ذہنیت کا چھینٹا تک نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس اسلام کے واحد اجارہ دار ہم ہیں۔ جب یہ اس مقصد میں ناکام رہے اور پاکستان بن گیا تو انہوں نے یہاں آتے ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور تم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اسلامی نظام کی الف۔ ب سے بھی واقف ہو۔ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے، یہ ہم جانتے ہیں۔ اس لئے زمامِ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو تاکہ ہم وہ مقصد پورا کر دکھائیں جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۴۸-۴۹ء سے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ:۔

"کسی قوم کی اور ملک کی انتہائی بدقسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے۔۔۔۔ ایسے حالات میں غیر صالح قیادت کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا کرنا خلافِ مصلحت ہے۔ ایک غلط قیادت کی بقاء کے لئے اس طرح کی کوشش کرنا ملک اور قوم کے ساتھ، سب سے بڑی غداری، اور غلط قیادت سے نجات دلانے کی فکر کرنا، اس کی سب سے بڑی خیر خواہی ہے"۔

(ترجمان القرآن۔ جون، جولائی ۱۹۴۹ء)

یہ ہے مقصد مودودی صاحب کے سامنے پاکستان بننے کے بعد۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے انہوں نے اس بدنصیب ملک میں ایک دن بھی ایسا نہیں آنے دیا کہ لوگ اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اور یہ یہی کچھ کرتے رہیں گے جب تک اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ آجائے۔ جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے گا تو "پیدائشی

مسلمانوں" کا حشر کیا ہوگا - اس کے لئے ان کا کتابچہ - مرتد کی سزا - ملاحظہ کیجئے جس میں واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا اور اگر وہ اس دوران میں ان کا مقرر کردہ اسلام قبول نہیں کریں گے تو انہیں قتل کر دیا جائیگا۔

سوال (۵): آپ نے کہا ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے مودودی صاحب کو لکھا کہ وہ "خود مرکزیت" کے خناس کو اپنے دماغ سے نکال دیں۔ مودودی صاحب کی طرف سے اس کا کوئی جواب دیا گیا۔۔۔۔

گالیاں

جواب:- جی ہاں! جواب دیا گیا۔ یعنی حسبِ معمول گالیوں کی بوچھاڑ۔ مودودی صاحب کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو خود گالیاں نہیں دیتے[1] خود تو خاموش رہتے ہیں اور اپنے مصاحبوں سے انہیں گالیاں دلواتے رہتے ہیں۔ اس سے (حقیقت سے بے خبر) لوگ یہ تأثر لیتے ہیں کہ دیکھئے! مودودی صاحب کس قدر بلند ظرف کے انسان ہیں کہ مخالفین ہزار کچھ کہیں، یہ کبھی زبان درازی نہیں کرتے۔ ان کی جماعت سے جو حضرات ۱۹۵۶ء میں الگ ہوئے تھے اور جن کے سرخیل مولانا اصلاحی تھے۔ ان کی شان میں، اس جماعت کے لٹریچر میں جو کچھ کہا گیا وہ درکنار رہا۔ (مولانا) عبدالرحیم اشرف نے اپنے جریدہ "المنبر" کی اشاعت بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ خود مودودی صاحب ان اختلاف کرنے والوں کو یہ کچھ ثابت کرتے رہے۔

"نجوی کے مرتکب، ضعفِ ارادہ ونفرت کے مریض۔ یک رُخے۔ تحریک اسلامی کے نادان دوست۔ جماعت کے غدار۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کے روڑے۔ خدا کے خوف سے عاری۔ خائن۔ انتشار پسند۔"

سوال (۶): آپ نے کہا ہے کہ جماعتِ اسلامی والے، مودودی صاحب کو اسلام میں سند سمجھتے ہیں۔ اس کی کوئی عملی مثال دیں گے۔

جواب:- اس کی عملی مثال تو اس جماعت کی ساری تاریخ ہے۔ آپ اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے کہ مودودی صاحب نے کسی مسئلہ کے متعلق یہ کہا ہو کہ وہ اسلام کے مطابق یا اس

---

[1] اگر یہ حضور (اوقات) مغلوب الغضب ہو کر یہ بھی احتیاط نہیں کرتے لیکن بالعموم یہ خود خاموش رہتے ہیں۔

کے خلاف ہے اور ان کی جماعت کے کسی رکن نے اس سے اختلاف کیا ہو۔ مودودی صاحب نے کہا کہ انتخابات میں حصہ لینا اسلام کی رُو سے قطعاً جائز نہیں، تو ان کے متبعین نے کہا کہ آمنّا وصدّقنا۔

دین میں سند

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ انتخابات میں حصہ لینا عین مطابق اسلام ہے اور جماعت والوں نے کہا کہ بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ مودودی صاحب نے کہا کہ اسلام کی رُو سے عورت کو ووٹ دینے تک کا بھی حق حاصل نہیں اور ان کے معتقدین نے کہا کہ بالکل درست۔ پھر انہوں نے کہا محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) منصب صدارت کی اُمیدوار ہیں۔ ان کی مدد کرنا عین تقاضائے اسلام ہے۔ جماعت نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ مودودی صاحب نے کہا کہ زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی قطعاً اسلام کے خلاف ہے۔ جماعت نے کہا۔ بالکل بجا ارشاد ہوا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ملکیت اراضی کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہونی چاہیئے اور جماعت نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ "نیشنلائزیشن" کا نظریہ ابلیس کی ایجاد ہے۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ جماعت نے کہا، بالکل بجا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ کلیدی صنعتیں قومیائی جا سکتی ہیں۔ جماعت نے کہا بالکل درست۔

غرضیکہ کہاں تک مثالیں پیش کی جائیں۔ اس جماعت کے نزدیک اسلام ہے ہی وہی، جسے مودودی صاحب، اسلام قرار دے دیں۔

سوال (۶): جب رسول اللہ کی احادیث کے مجموعے مرتب کر لئے گئے تو پھر ان کی رُو سے اطاعت رسول اللہ کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اس میں کیا حرج واقع ہوتا ہے۔

احادیث کی اطاعت

جواب: حرج تو بالکل واضح ہے۔ اُمت میں جس قدر فرقے پائے جاتے ہیں وہ سب اپنے اپنے مسلک کی تائید میں احادیث رسول اللہ پیش کرتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جو یہ فیصلہ کر سکے کہ کون سا مسلک سنت رسول اللہ کے مطابق ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں ارشادات رسول اللہ موجود تھے۔ (اگرچہ وہ مرتب شکل میں نہیں تھے) اس وقت ان ارشادات (احادیث) کی بنا پر کوئی فرقہ وجود میں نہیں آیا تھا کیونکہ زندہ سنٹرل اتھارٹی موجود تھی۔ جب یہ نہ رہی تو مختلف گروہ اپنے اپنے طور پر فیصلے کرنے لگ گئے۔ اس طرح اُمت فرقوں

میں بٹ گئی۔ اُمت کا یہ تفرقہ مٹ نہیں سکتا جب تک اس سنٹرل اتھارٹی (خلافت علی منہاج نبوت) کے نظام) کو پھر سے قائم نہ کر لیا جائے۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ خدا کی کتاب کے ساتھ رسولؐ کی بعثت کی ضرورت یہ تھی کہ تنہا کتاب کی اطاعت ممکن نہیں تھی۔ آپ سوچئے کہ جب زندہ اتھارٹی کے بغیر خدا کی کتاب پر عمل ممکن نہیں تھا تو اس اتھارٹی کے بغیر احادیث کی کتابوں پر عمل کس طرح ممکن ہے؟ اس اتھارٹی کے نہ ہونے سے کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ کے باوجود اُمت کی وحدت ختم ہو گئی اور جب اُمت کی وحدت ختم ہو گئی تو دین باقی نہ رہا۔

خلافت راشدہ کا احیاء

سوال (۸):- کیا آپ کے نزدیک خلافت راشدہ کے نہج کا اسلامی نظام پھر سے قائم ہو سکتا ہے؟

جواب:- اگر اس نظام یعنی دین کا قیام ممکن نہ ہوتا تو قرآن مجید کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا فائدہ کیا تھا؟ علاوہ بریں خدا کا فیصلہ ہے کہ دینِ خداوندی تمام نظام ہائے عالم پر غالب آکر رہے گا۔ (لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹:۳۳)) اس نظام کا احیاء ممکن نہیں تو پھر خدا کا یہ وعدہ پورا کس طرح ہو گا؟ یہ نظام قائم ہو گا اور تمام نظام ہائے عالم پر غالب آکر رہے گا کہ:- اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳:۹) " خدا کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا "۔

سوال (۹):- جب آپ بھی یہ کہتے ہیں کہ اس وقت اسلام دین نہیں، مذہب ہے اور مسلمان دین پر کاربند نہیں۔ اور مودودی صاحب بھی یہی کہتے ہیں تو پھر آپ دونوں میں فرق کیا ہے؟ اور آپ ان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

جواب:- مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ موجودہ اسلام دین نہیں مذہب ہے۔ دین اس اسلام کو سمجھا جائیگا۔ جسے وہ اسلام کہہ دیں۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ ختم نبوت کے بعد کسی فرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ اسلام میں سندبن بیٹھے، میرا اپنا کوئی دعویٰ نہیں۔ نہ میری کوئی پارٹی، جماعت یا فرقہ ہے۔ نہ میں کسی جماعت کا امیر یا فرقے کا امام ہوں۔ میری حیثیت قرآن کریم کے ایک طالب علم اور مبلغ کی ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ اس فکر کو عام کرتے جائیں کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ نظام حیات ہے، جس کے لئے ایک مملکت کی ضرورت ہے۔ اس مملکت کا جملہ کاروبار، قوانین واحکام خداوندی کی چاردیواری میں رہتے ہوئے سرانجام پائے گا۔ اس میں ارباب اقتدار وہ ہوں گے جن کی سیرت، سیرت محمدیہ ؐ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہوگی، قرآن، حدیث، فقہ، سب ان کے سامنے ہوں گے۔ اس

مملکت کی سنٹرل اتھارٹی یا مرکزِ ملت کی وساطت سے اس کے فیصلے قانونی حیثیت سے نافذ ہوں گے اور ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ یہ سارا نظام اُمت کے مشورے سے طے پائے گا اور اس میں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اسلام میں سند بن بیٹھے اور اس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام بن جائے۔ میں اس قسم کے نظام کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالتؐ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہوں۔ باقی رہے اس وقت کے مسلمان، تو جیسے کچھ وہ ہیں، ویسے ہی ہم ہیں۔ جو حالت ان کی، وہی ہماری۔ یہ حق تو ایک رسولؐ کو ہی پہنچتا ہے کہ وہ اگر کہے کہ تم سب دین سے منحرف ہو۔ دین لے کر میں آیا ہوں۔ جو میری بات مانے گا وہ دین کا پیرو کہلائے گا۔ جو اسے تسلیم نہیں کرے گا، اسے دین سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا کہنے والا ختمِ نبوت کی مہر کو توڑ دیتا ہے خواہ وہ "مرزا غلام احمد" ہو یا "سید ابوالاعلیٰ مودودی" جنہیں ان کے متبعین "اللہ کا شاہکار" قرار دیتے ہیں۔ میں تو اس کے تصور تک سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے جسے سادہ لوح مسلمان پہچانتا نہیں۔

سوال (۱۰):۔ جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام، حال ہی میں، ملک بھر کے ماہرینِ قانون و وکلاء صاحبان کا ایک بہت بڑا کنونشن بدیں غرض منعقد ہوا ہے کہ ملک میں قانونِ شریعت کا نفاذ ہو۔ ان سے کہا گیا ہے کہ وہ قانونِ شریعت مدوّن کریں اور یہ بتائیں کہ اس کے نفاذ کی عملی شکل کیا ہونی چاہئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جماعت (یعنی مودودی صاحب) قانونِ شریعت کی تدوین اور نفاذ کے خواہشمند بھی ہیں اور اس کے لئے کوشاں بھی۔

جواب:۔ میں نے اس کنونشن کی کارروائی اخبارات میں پڑھی ہے اور اس سے مجھے بےحد افسوس ہوا ہے۔ افسوس جماعتِ اسلامی پر نہیں کیونکہ یہ تو ان کے پروپیگنڈہ کی ایک کڑی ہے۔ افسوس وکلا حضرات پر ہے جو کنونشن میں شریک ہوئے۔ ہماری قوم کے عوام سادہ لوح بھی ہیں اور جذباتی بھی۔ لیکن قوم کے دانشور طبقہ سے کم از کم یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ معاملات پر جذبات سے الگ ہٹ کر حقائق و لبصائر کی روشنی میں غور و فکر کریں۔ ان میں وکلاء حضرات کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ کیونکہ ان کا اوڑھنا بچھونا قانون ہوتا ہے اور قانون میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر یہ طبقہ بھی عوام کی سطح پر اتر آئے تو اس سے بڑھ کر مقامِ تاسف اور کون سا ہو سکتا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ کنونشن اس جماعت کی طرف سے منعقد کیا گیا جس کا بانی، وکالت کے پیشہ ہی کو حرام قرار دیتا ہے۔ مودودی صاحب نے ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں کہا تھا:-

"وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہر حال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے..... وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے..... وکلاء کے ہاں کے کھانا کھانے میں بھی پرہیز اولیٰ ہے۔"

(ترجمان القرآن۔ جنوری فروری ۱۹۴۴ء)

مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ وکلاء حضرات کے اس جم غفیر میں سے کسی ایک کی حمیت نے بھی مودودی صاحب سے استفسار کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ جن لوگوں کے پیشے کو آپ قانونِ خداوندی کے خلاف "کھلی بغاوت" اور جن کی روزی کو آپ حرام قرار دیتے ہیں انہیں آپ قانونِ شریعت کی تدوین و تنفیذ کے لئے دعوت کس طرح دے رہے ہیں؟ ان میں سے کسی نے بھی ان سے یہ نہیں پوچھا!

۲- اب آگے بڑھیئے۔ کنونشن کے مقررین میں سے ہر ایک نے، اور خود مودودی صاحب نے، تدوینِ قوانینِ شریعت کے ضمن میں "کتاب و سنت" کے الفاظ دہرائے اور کہا کہ یہی قانونِ شریعت کی اساس و بنیاد ہیں۔ بہت اچھا! لیکن مودودی صاحب تو خود اعلان کر چکے ہیں کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا، جو پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہو اور ان پر اس کا اطلاق یکساں طور پر کیا جا سکے۔ ان وکلاء حضرات میں سے کسی نے مودودی صاحب سے یہ نہ پوچھا کہ جب "کتاب و سنت" کی رو سے ایسا ضابطہ شریعت مرتب نہیں ہو سکتا تو جس ضابطہ کے مرتب کرنے کے لئے آپ نے ہمیں دعوت دی ہے، اس کی بنیاد کیا ہو گی۔ کتاب و سنت تو خود مودودی صاحب کے الفاظ میں، اس کی بنیاد ہو نہیں سکتے۔ پھر اس کی اور کون سی بنیاد ہو گی۔

ان میں سے کسی نے اتنا نہ پوچھا اور کتاب و سنت کے الفاظ دہراتے چلے گئے۔ اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حضرات اور انہیں دعوت دینے والی جماعت اسلامی، نظام شریعت کے مسئلہ میں کس قدر (SERIOUS) ہیں۔

۳۔ اب آئیے ٹیپ کے اس بند کی طرف، اور یہ دیکھئے کہ اس کونشن کے انعقاد کی غرض و غایت کیا تھی اور مودودی صاحب کے نزدیک نفاذِ شریعت کا عملی طریق کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا:۔

"اسلامی قانون کے نفاذ کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اختدار ہے انہیں اقتدار سے ہٹا دیا جائے اور ان لوگوں کو اقتدار سونپا جائے جو اسلام جانتے اور مانتے ہوں اور اسے دل سے نافذ کرنا چاہتے ہوں"۔

(نوائے وقت، ۳ مئی ۱۹۷۶ء)

فرمائیے! جو کچھ میں کہتا چلا آرہا ہوں، اس کے لئے اس سے بڑھ کر کسی اور مہرِ تصدیق کی ضرورت رہ جاتی ہے؟

سوال ۱۱۱: آپ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب آج ایک بات کو مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد اس کے خلاف بات کو اسلام کہہ کر پیش کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب فکر انسان، مزید غور و فکر کے بعد اپنی سابقہ رائے بدل سکتا ہے۔ اس میں کیا ہرج ہے؟

جواب:۔ ایسا کرنے میں کوئی ہرج کی بات نہیں۔ لیکن ایسے "صاحبِ فکر" کے لئے یہ تو ضروری ہے کہ وہ اپنی رائے بدلنے پر اعلان کرے کہ میری رائے غلط اور خلافِ اسلام تھی۔ میں نے اب اس سے رجوع کر لیا ہے۔ (جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے) آپ مودودی صاحب کے ہاں اس قسم کے اعتراف کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے حالانکہ بعض مقامات ایسے تھے جن میں ایسا کرنا نہایت ضروری تھا۔ مثلاً مودودی صاحب نے انتخابات (الیکشن) کے سلسلہ میں فیصلہ دیا کہ:۔

"ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک اُمیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ (یاد رکھئے) اُمیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب اور جہاں سامنے

آئے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اس پران کے خلاف یہ اعتراض ہوا کہ اگر کسی منصب کے لئے اُمیدوار بن کر اُٹھنا خلافِ اسلام ہے، اور یہ اس شخص کے غیر صالح ہونے کی دلیل، تو حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو منصب خلافت کے لئے بطور اُمیدوار کیوں پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ حضرت علیؓ کا یہ عمل خلافِ اسلام تھا:۔

"اور آخری فیصلہ کُن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ، بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسولؐ سے مختلف ہو، وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حُجت۔"

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اسی کے چند ہی سال بعد، مودودی صاحب کی مصلحتوں کا تقاضا ہوا کہ انتخاب میں حصہ لیا جائے تو انہوں نے فیصلہ فرما دیا کہ ایسا کرنا عین مطابقِ اسلام ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:۔

"ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔" (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب نے یہ نہیں کہا کہ ان کی پہلی رائے غلط اور خلافِ اسلام تھی، اور اب یہ رائے اسلام کے مطابق ہے، لیکن بات اس سے بھی آگے چلتی ہے۔ انہوں نے اپنی رائے کی بناء پر حضرت علیؓ کی شان میں جو گستاخی کی تھی، اس حقیقت کے انکشاف کے بعد کہ حضرت علیؓ کا وہ عمل، خدا اور رسولؐ کے ارشادات کے خلاف لغزش نہیں تھا، انہوں نے اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی کہ خدا سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لیتے۔ لیکن غلطی کی معافی تو وہ مانگے جو یہ سمجھے کہ اس سے غلطی کا امکان ہے۔ مودودی صاحب اپنے آپ کو اس سے بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ (بقول ان کے برادرِ کلاں سید ابوالخیر مودودی صاحب) وہ اپنے آپ کو "بعد از خدا بزرگ" کے مقام پر قائم تصور کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ)

سوال (۱۴):۔ مودودی صاحب جب اس قسم کا ہر آن بدلنے والا اسلام پیش کرتے ہیں تو علماء حضرات کی طرف سے اس کی مخالفت کیوں نہیں ہوتی؟

جواب:۔ آپ یہ سوال تو ان علماء حضرات سے پوچھئے۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ہیں، جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت۔ مودودی صاحب جب دارالاسلام پٹھانکوٹ، گئے ہیں تو ان

کے پاس کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے علامہ اقبالؒ کی وفات پر لکھا تھا کہ ان کا وہی ایک مادی سہارا تھا جو ترہا۔۔۔ اور آج اس جماعت کی یہ حالت ہے کہ سیم وزر کا سیلاب امڈے چلا آرہا ہے۔ اس وقت پاکستان ہی میں نہیں، دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں میں اس کی شاخیں اور مراکز ہیں جن پر ظاہر ہے کہ لاکھوں روپے صرف آرہے ہیں۔ مجھے انگلینڈ سے ایک دوست نے، وہاں سے شائع ہونے والے روزنامہ ملت کی ۲۳ فروری ۱۹۷۶ء کی اشاعت کا ایک تراشا بھیجا ہے جس میں ملتان روڈ لاہور پر مرکزی جماعت کے زیر تعمیر مرکز (منصورہ) کی تفاصیل درج ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ۱۶۲ کنال اراضی پر زیر تعمیر، اس مرکز پر ابھی تک چالیس لاکھ روپیہ صرف آچکا ہے۔ اس ایک مثال سے ان کی دولت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دولت کے بل بوتے پر بہت سی مخالفتوں کا منہ بند کیا جا سکتا ہے۔ (مولانا) عبدالرحیم اشرف نے لکھا تھا کہ ۱۹۵۶ء میں اس جماعت کے کل ارکان کی تعداد (۳۰۰) کے قریب تھی اور ان میں (۱۲۰) تنخواہ دار ملازم تھے۔ (المنبر، اکتوبر ۱۹۶۶ء) آج کا حال خدا جانے۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ ان کی پراپیگنڈہ مشینری مخالفت کرنے والوں کا جو حشر کرتی ہے، اس سے ڈر کر بھی لوگ اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان سے الجھا نہ جائے۔ حتیٰ کہ جو لوگ ۱۹۶۵ء میں ان سے الگ ہوئے تھے، انہیں بھی کھل کر ان کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب یوم اقبال
اپریل ۱۹۷۷ء

اسلامی مملکت کا تصوّر

اقبالؒ کے نزدیک

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را — بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند — کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم، بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے۔ جب کہا کہ:-
وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۲/۵۲) "اے رسولؐ! تجھ سے پیشتر کوئی صاحبِ وحی ایسا نہیں ہوا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔ اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحبِ حکمت ہے"۔ رسول... ...کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و اقدارِ خداوندی کو معاشرہ میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق تھا۔ جو بندگی، پرستش، یا مختلف رسوم کی رُو سے انفرادی طور قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابتدا میں دین ہی تھے۔ (قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں رسولؑ بھیجے تھے) مفاد پرست گروہوں نے جن کے سرکردہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ،

يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ .... (۲/۷۹)

"یہ خود شریعت وضع کرتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے اور ایسا کچھ پیسے کمانے کے لئے کرتے تھے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا"۔ خدا نے رسول اللہ کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہہ دیا کہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ .... (۶/۱۱۵)

"خدا نے اس وحی کی رُو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا"۔

اس لئے کہ:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

"ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے"۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختمِ نبوت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ اس کا یہی کلام (قرآن مجید) ہوگا۔

لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟ کیا اس میں بھی آمیزش ہو گئی؟ اگر ایسا ہو گیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لی تھی؟ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیر و تبدل ہوا، نہ کسی قسم کی آمیزش ——— لیکن ہوا ------ یہ کہ خارج از قرآن متعدد عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔

اسلام مذہب بن گیا

اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دین نہیں بلکہ یہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ اُمت میں وحدت نہیں رہتی۔ وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری

سند (خدا کے بجائے) کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پا جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۳۰/۳۱)

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے)، جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد، نبیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہ کے بعد، خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہو سکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبی کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی منزہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآنی الفاظ میں) "محکم" کیا جائے۔ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهِ (۲۲/۵۲) آیات قرآنی کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق و باطل، جائز و ناجائز۔ صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ فریضہ انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ اُمت کا اجتماعی فریضہ تھا جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک مملکت قائم کی جائے، جس کا کاروبار قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ کتب سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ... ۵ (۲/۲۱۳) کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ رسول

استحکام آیات اللہ کا عملی طریق

اللہ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ... (۵/۴۸) تم لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اس اُمت سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰)

"اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رو سے کر لیا کرو"۔

حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

"اور جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے"۔

لہٰذا آیات اللہ کو محکم کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے)، اس فریضہ کو اُمت نے خود سرانجام دینا تھا۔ یعنی خارج از قرآن عناصر کو شریعت خداوندی قرار دینے کے بجائے، کتاب اللہ کو مملکت کا ضابطۂ نظام قرار دینا، اُمت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ

کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا کی طرف سے جس نے آنا تھا وہ آخری مرتبہ آکر اور خدا کی مکمل و محفوظ کتاب دے کر چلا گیا تھا۔ (علیہ التحیۃ و السلام)

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلام، صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ امت کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو، وہ دینِ خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں الدین کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جس نے اس فراموش کردہ عظیم حقیقت کو امت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الامت، علامہ اقبالؒ جن کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اقبالؒ نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مامور من اللہ ہیں، یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعویٰ ختمِ نبوت کے منافی اور یکسر باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآن کریم پر غور و تدبر اور اسوۂ رسول اللہؐ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھ لیجئے، اس میں روشن روشن پر آپ کو عظمتِ قرآنی کے پھول کھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیام، قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاء کرامؑ دین کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کرتے تھے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائداعظم نے اس تصور کی عملی تشکیل کے لئے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیشِ نظر تو اسلام کا وہی تصور تھا جس میں اعتقادات، عبادات اور شخصی قوانین کی آزادی ہو اور پبلک لاز، مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے متعلق یہی تصور تھا جس پر، جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانینِ مملکت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کئے جائیں اور یہ، اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصور، امت کی نگاہوں سے صدیوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است   رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

قرآن کا نصب العین۔ اس کی منزل۔ اس کا منتہیٰ۔ اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصور، ان کے رسوم و مناسک، ان کا شعارِ زندگی، ان کا آئینِ حیات کچھ اور۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ؎

بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد   در ایاغ او نہ مے دیدم، نہ دُرد

اصل یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ نے قرآن کریم کے نخلِ حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساغرِ زندگی میں، قرآن کی شرابِ طہور تو ایک طرف، اس کا تہ جرعہ تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت انتہائی تعجب انگیز اور حیرت افزا نہیں کہ: ؎

خود طلسمِ قیصری و کسریٰ شکست   خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

وہ قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کو نیست و نابود کر دیا۔ اس کے بعد، وہ خود تختِ ملوکیت بچھا کر اس پر مسند نشین ہو گئی اور پھر: ؎

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت   دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

جب نظامِ ملوکیت محکم ہو گیا تو دین، تمام تر اسی کے رنگ میں رنگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ——— افرنگی شرع و آئینے دگر ——— اسلام کی جگہ ایک مذہب، ایک نئی شریعت وجود میں آ گئے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ ——— اندکے با نورِ قرآں در نگر۔

یہی نہادہ "نورِ قرآن" جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات نہایت واضح الفاظ میں پیش کئے۔ آج کی نشست میں۔ میں اس کے مختصر سے خط و خال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس ضمن میں۔ ان کے سات لیکچروں کے مجموعہ میں سے چھٹا خطبہ، اور ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت، خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں، میری یہ تصریحات بیشتر انہی کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔

آپ نے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت

"آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے

اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشائی دے گا جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے۔ نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفسِ اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے۔"

اس تمہید کے بعد انہوں نے، مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا :۔

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پا بگِل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔"

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا :۔

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا"۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

"تنہا ایک ملک میں سات کروڑ[1] فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا"۔

اُن کی بصیرت نے یہاں تک کہ دیا کہ:۔

"مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے"۔

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ:۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ:۔

پاکستان کا ہیولیٰ

"میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔۔۔۔۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے"۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ:۔

"اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے

---

[1] اس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

سے اب تک اس پہ قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے"۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیل جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:-

"اندریں حالات ہمارے لئے کشادکار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پہ غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو"۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبال ؒ نے مملکت پاکستان کا جو نظریہ اور تصور پیش کیا تھا اس کی غرض و غایت اور منتہا و مقصود کیا تھا؟ انہوں نے یہ تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔ (اگرچہ خطبات تشکیل جدید اس سے بھی دو سال پہلے دیئے گئے تھے) حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال ؒ کا سارا کلام اور پیام انہی تصورات کی توضیح و تشریح ہے۔

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک، واحد اور غیر منقسم اُمّت ہوتی ہے جو دین کے اشتراک کی بناء پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے ہوتے ہیں، نہ سیاسی پارٹیاں۔ اس مملکت یا اُمّت کا ایک ضابطۂ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز و تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی گروہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ فقہ کی پیروی کرے گا۔ ایک مملکت کے اندر الگ الگ ضوابطِ قوانین کی پیروی تو مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہوتی ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

واحد ضابطۂ قوانین

لیکن جب مملکت کی تشکیل کا نظریہ علامہ اقبال ؒ نے پیش کیا تھا، تو ظاہر ہے (اور انہیں اس کا علم تھا) کہ اس میں مسلمانوں کے متعدد

فرقے ہوں گے۔ سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کس طرح ہو سکے گا، جس کا اتباع تمام مسلمان یکساں طور پر کریں۔ سیکولر حکومت میں تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذاہب یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے پیروؤں کو، اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوتی ہے اور مملکت کے پبلک لاز کے وضع کرنے میں کسی مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت تو سیکولر نہیں ہوتی۔ اس میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بنظرِ غائر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کے سرخیل (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ کے درمیان مشہور معرکہ، مملکت کے اسی (دو) جداگانہ تصورات کا پیدا کردہ تھا۔ نیشنلسٹ علماء سیکولر حکومت کے مؤید تھے اور علامہ اقبالؒ اسے اسلام کے یکسر خلاف قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو خلافِ اسلام سمجھتے تھے۔ ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آ گئی ہو گی کہ علامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا تو ان کے سامنے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب ہو گا جس میں پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق نہیں ہو گی اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں اس نہایت اہم اور نازک ترین مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اس خطبہ کے ضروری اقتباسات پیشِ خدمتِ ناظرین کرنا چاہتا ہوں۔

—— ·×· ——

لیکن کسی مملکت میں قرآنی قوانین و احکام کو میکانکی طور پر نافذ کر دینے سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ مملکت کے اسلامی بننے کی اوّلین شرط یہ ہے کہ اس کے افراد میں حکمتِ قرآنی کے مطابق نفسیاتی تبدیلی واقع ہو۔ ان کے قلب و دماغ میں قرآنی خطوط پر تغیر رونما ہو۔ یہ شرط خود قرآنِ مجید کی عاید کردہ ہے جب وہ کہتا ہے کہ: إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)

نفسیاتی تغیر شرطِ اوّل

"کسی قوم کی حالت کو، کوئی اور تو ایک طرف، خود خدا بھی نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تغیر نہ پیدا کر لے"۔ علامہ اقبالؒ کا سارا پیغام، اسی تغیرِ نفس کی شرح ہے جسے وہ تعمیر و استحکامِ خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ وہ (جاوید نامہ میں) کہتے ہیں کہ:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ——— ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود ——— جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

چوں بجاں در رفت" سے مراد، قرآنی حکمت کے مطابق نفسیاتی تبدیلی ہے۔ خارجی تبدیلی اسی داخلی تبدیلی کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ اسی کو وہ فاش تر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ :—

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب ——— گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

(بالِ جبریل)

انسانی ضمیر پہ "نزولِ کتاب" سے مراد بھی، قرآن کے مطابق تغیرِ نفس ہے۔ یہ مقصد، قرآنی حقائق کو اس طرح تعلیم و تربیت کی بنیاد بنا دینے سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اس سے افرادِ ملت کا قلب و دماغ قرآنی سانچے میں ڈھل جائے۔ اسی لئے وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ :

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

وہ تجھے ویسا انسان بنا دیتا ہے جیسا انسان خدا چاہتا ہے۔ اور یہ مقصد احکامِ قرآنیہ کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ :

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

یہ بات قانون سازوں کے بس کی نہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ مقصد قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضورِ نبی اکرمؐ کا فریضہ ——— یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (۲/۱۲۹) قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ، کتاب و حکمت کی تعلیم سے ان کی تعمیرِ خودی کرتے تھے۔ تشکیلِ مملکت کا مرحلہ تو اس سے کہیں بعد جا کر آیا تھا۔ اور قرآنی مملکت قائم بھی انہی افراد کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جن میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا ہو چکا ہو۔ حضورؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔

لیکن مملکت کا کاروبار تو بہرحال قوانین کی رُو ہی سے چلتا ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور علامہ اقبالؒ نے بڑی شرح و بسط سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اصولی طور پر وہ باصرار و تکرار اس حقیقت کو دہراتے جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگا۔ وہ اپنی پہلی مثنوی (اسرار و رموز) میں کہتے ہیں کہ :—

ہیچ می دانی کہ آئینِ تو چیست ——— زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست

اں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لایزال است و قدیم

قرآن کا انداز

لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں اور جزوی اور تفصیلی قوانین خود ہی مقرر نہیں کر دیئے۔ اسے اس کتاب کی وارث اُمّت (یعنی ان کی مملکت) پر چھوڑا ہے کہ وہ ان حدود کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے، تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود و اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق، تبدیلی کی جا سکے گی۔

جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لئے ابدی اور غیر متبدل ضابطۂ راہ نمائی قرار پانا ہو، اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے بڑی شدومد سے دُہرایا ہے۔ وہ خطبات تشکیل جدید (کے چھٹے خطبے میں) کہتے ہیں۔

ثبات و تغیر کا امتزاج

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلّب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصول حرکت کار فرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ (اس خطبہ میں) مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی

اصول قرار دیتے ہیں ۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کُلی اختیار ۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"سُنی حضرات ، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے ۔ لیکن آئمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے ۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے ، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے ۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں ، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے ۔ اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے ۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا"

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے ۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا ۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں :-

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

"آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں ۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے ۔ اس کے برعکس ، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے ۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہائے نے ، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے ۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا ۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ :-

"رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو"

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مذاہب اربعہ اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں کبھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب ہے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّیٰ سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کا مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔"

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:-

"قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہوسکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:-

" تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔"

تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔"

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

" اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس " افترا " کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :-

اگر اس افترا کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا۔) "

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں ازبس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ :-

" بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔ "

لیکن انہوں نے کہا کہ :-

" بایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔

سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قرن اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔"

علامہ اقبالؒ کی یہی جسارت تھی جس کی وجہ سے وہ ارباب دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم دتحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں :۔

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی   اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبدار فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہ اقبالؒ کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں :۔

احادیث کی قانونی حیثیت

"احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ اُن کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص

طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، مَیں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا۔

جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔"

احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکمِ خداوندی تھا کہ :-

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) "ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔"

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ :-

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔"

یہ طریقِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔

احادیث رسول اللہ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا ——— اس مسلک پر امام ابوحنیفہؒ نے کڑی تنقید کی اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رُو سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا ——— علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :-

"انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہد رسالتمآبؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لیے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔

اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رح کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ (تشریع) کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :۔

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابو حنیفہ رح اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابو حنیفہ رح پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالت مآب اور صحابہ رض میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔"

ان تصریحات سے، عزیزانِ من! یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال رح کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل، قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ:۔

"وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمر رض کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔

روحِ عمری رض

وہ عمر رض جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:۔

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے "

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :-

"اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی"۔

ان کے نزدیک اس سوال کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ انہوں نے اپنے خطبات سے بھی پہلے، امرتسر کے حلقۂ اہلِ قرآن کے متعلق ذکر کرتے ہوئے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ :-

"ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخرالذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت

سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاؤ اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں بھی اس اہمیت کو دھراتے ہوئے لکھا کہ :-

"قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیات انسانیہ کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔"

(طلوع اسلام۔ اپریل ۱۹۷۰ء، صہ)

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسی پیغام کو عام کرتے رہے۔ اور ان کی وفات کے بعد، اس پیغام خداوندی کی نشر و اشاعت کی سعادت اس بیچ میرز کے حصہ میں آئی۔ اقبالؒ کی زندگی میں اس مسئلہ کی حیثیت ہنوز نظری تھی۔ یعنی انہوں نے اس مملکت کا یہ نظریہ تو پیش کر دیا تھا لیکن اس مملکت کے وجود میں آنے کا (بظاہر) کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا، اس لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے ان خیالات و تصورات کو نہ کوئی خاص اہمیت دی گئی اور نہ ہی ان کی خصوصیت سے مخالفت کی گئی۔ لیکن اب جب کہ یہ مملکت وجود میں آچکی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قانون سازی کے اس تصور کی بڑی شدت سے مخالفت ہو رہی ہے۔ میرے خلاف "ایک ہزار علماء" کا کفر کا فتویٰ اس مخالفت کی زندہ شہادت ہے۔ لیکن قرآن مجید تو ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس کا سر رشتہ نہ علامہ اقبالؒ کی طبیعی عمر سے وابستہ تھا، جو ان کی وفات سے یہ ٹوٹ جاتا۔ نہ ہی یہ میری زندگی تک محدود ہے۔ اور نہ ہی اسے مخالفین کی کاوشیں اور کوششیں ناکام بنا سکتی ہیں۔ اسے دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر رہنا ہے کہ : لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۔ اس خدا کا فیصلہ ہے جس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ لہٰذا ایسا بالآخر ہو کر رہے گا۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹/۳۳) اور قوانین خداوندی کے ساتھ

دیگر قوانین ملانے والوں کی تمام کوششوں کے علی الرغم ایسا ہوگا۔

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، مناسب سمجھتا ہوں کہ آخر میں اُسے مختصر الفاظ میں سمٹا کر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

۱۔ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ قوانین و آئین عطا ہوتا تھا۔ جو قوم اس ضابطہ کی صداقت کو تسلیم کر لیتی تھی اس کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اسے عملاً نافذ کرے۔ چونکہ یہ پوری قوم ایک ضابطہ کے تابع زندگی بسر کرتی تھی اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف اور تفرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ رسولؐ کے چلے جانے کے بعد، وہ قوم اس ضابطہ میں آمیزشیں کر دیتی تھی اور اس طرح ان میں اختلافات نمودار ہو جاتے تھے۔ اس طرح وہ دین مذہب بن جاتا تھا۔ یہ جو دنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ یہ دین میں پیدا شدہ مختلف فرقے ہیں کیونکہ دین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ دین کی اطاعت کرنے والوں میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

۳۔ یہ دین آخری مرتبہ، مکمل اور غیر متبدل شکل میں نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملا۔ جن سعادت مند افراد نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا وہ ایک قوم (یا اُمّت) بن گئے۔ اس اُمّت نے، اس دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کی تشکیل کی جس کا ضابطۂ آئین قرآن کریم تھا۔ اس مملکت کی مرکزی اتھارٹی اُمّت کے مشورہ سے اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرتی اور انہیں قوانین مملکت کی حیثیت سے نافذ کرتی۔ ان کا اطلاق تمام اُمّت پر یکساں طور پر ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں، اُمّت میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مختلف فرقوں کے معنی تو یہ تھے کہ مختلف گروہ، مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بجائے، اپنے اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے۔ ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس قسم کا طرزِ عمل تو مملکت سے بغاوت کے مرادف ہوتا ہے یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۲) یعنی ایک اتھارٹی (حکومتِ قرآنی) کی اطاعت کرنے کے بجائے مختلف اتھارٹیز کی اطاعت کرنا۔ رسول اللہؐ سے فرمایا کہ جو لوگ فرقے پیدا کر لیں تیرا اُن سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ (۶/۱۶۰) یعنی جو مملکتِ اسلامیہ کی مرکزی حیثیت ہی کو تسلیم نہ کریں، ان کا اس مرکز سے تعلق کیا؟ وہ تو اس کے باغی قرار پاتے ہیں۔ چونکہ مرکزِ ملت کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے تھے، اور

فرقوں میں فیصلے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں، اس لئے کہہ دیا کہ جو لوگ ـــــ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ ـــــ (قرآن مجید) کی رُو سے فیصلے نہیں کرتے انہیں مومن نہیں کہا جا سکتا۔ (۵/۴۴)

۴۔ ہمارے ساتھ ہؤا یہ ہے کہ اُمت کی مرکزی اتھارٹی (حکومت خداوندی یا خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کے باقی نہ رہنے سے دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے، اس لئے اس میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان فرقوں کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی نظام (یعنی دین خداوندی) قائم ہو سکتا ہے تو وہ یا تو دین اور مذہب میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یا پھر اُمت کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرقوں کی موجودگی میں دین کا نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ دین کا نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں آئے جو قرآنی اصولوں کو مملکت کا آئین قرار دے، اُمت کے مشورہ سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرے۔ انہیں قوانینِ حکومت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ کرے ـــــ اس میں نہ اِس فرقے یا اُس فرقے کی کوئی تمیز ہو اور نہ ہی پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ـــــ اس طرح ایک خدا ـــــ ایک ضابطہ قوانین اور ایک اُمت کی تشکیل سے، دین کا نظام قائم ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو احیاءِ اسلام کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔

یہ تھی خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کے قیام کی وہ ممکن العمل شکل جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کے مطابق ایک خطۂ زمین کے حصول کے لئے قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان کو وجود میں لائے۔ وہ علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ بنیادی اصول کو کس طرح واضح طور پر سمجھ چکے تھے، اس کی تفاصیل میں اپنے اس خطاب میں پیش کر چکا ہوں جسے میں نے سابقہ یومِ پاکستان (مارچ ۱۹۷۷ء) کی تقریب پر پیش کیا تھا۔ (وہ الگ شائع ہو چکا ہے) انہوں نے ان تمام تفاصیل کو ان چار لفظوں میں جامع طور پر سمیٹ کر رکھ دیا تھا کہ:-

"قرآنِ کریم کے احکام ہی ہماری سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔"

یہ وہ حدود ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ملتِ اسلامیہ اپنی مملکت کے لئے قوانین و ضوابط وضع کرتی ہے۔ جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی مملکت وجود میں نہیں آ سکتی، اور اگر وجود میں آجائے تو مستحکم نہیں رہ سکتی، جب تک اس میں ایک (واحد) ضابطۂ قوانین نافذ نہ ہو۔ جس مملکت میں مختلف گروہ اپنے لئے الگ الگ قوانین وضوابط وضع کرلیں، اس میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ سیکولر سٹیٹ میں قانون سازی کا مسئلہ آسان ہوتا ہے اس میں مختلف مذہبی گروہوں کو ان کے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی آزادی دے دی جاتی ہے اور پبلک لاز کا ضابطہ، بلاتمیز مذاہب، آزادانہ وضع کرلیا جاتا ہے جس کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے لیکن اسلام میں نہ تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پبلک لاز بلاحدود و قیود جس طرح جی چاہے وضع کئے جاسکتے ہیں۔ یہ سب قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کئے جاتے ہیں۔

لیکن اس وقت صورت یہ ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ پہ شدت سے جما بیٹھا ہے۔ ان کی فقہ کا دائرہ، شخصی قوانین تک محدود ہے۔ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں انہیں شخصی قوانین کی آزادی تھی اور پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوتے تھے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت اس میں مطمئن تھی۔ جسے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کہا جاتا ہے، اس سے مراد انگریزوں کی جگہ، اہلِ ہندوستان کی اپنی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس تحریک میں، وہاں کی اکثریت، ہندوؤں نے، اس امر کی ضمانت دے دی تھی کہ حصولِ آزادی کے بعد، قوانینِ مملکت کی شکل وہی رہے گی جو انگریزی عملداری میں رائج تھی —— یعنی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے شخصی قوانین اپنے اپنے ہوں گے، اور ملک کے پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوں گے۔

وہاں کے علماء کی اکثریت کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے تھا۔ وہ جس طرح انگریزی عملداری میں اس نہجِ حکومت سے مطمئن تھے اور اسے قطعاً اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے، اسی طرح وہ ہندوؤں کے پیش کردہ نہجِ حکومت کو اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ اس تحریک میں بہ ہیئتِ مجموعی شامل تھے۔ اصل یہ ہے کہ فرقہ وارانہ گروہ بندی میں، ہر فرقہ کے نزدیک اس کے اپنے معتقدات، مسالک، رسوم، اور شخصی قوانین کا نام اسلام ہوتا ہے۔ اگر اسے ان کا تحفظ حاصل ہو جائے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلام محفوظ ہے۔ اور اگر ان پر کوئی زد پڑتی ہو تو وہ چلا اٹھتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کا کوئی تصور ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ یہ شکل سیکولر نظامِ حکومت ہی میں قائم رہ سکتی ہے۔ اس کے برعکس، اسلامی نظامِ مملکت میں فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس میں (واحد) اُمتِ مسلمہ ہوتی ہے جو ایک ہی ضابطۂ قوانین کے تابع زندگی بسر کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کو اسلام قرار دینے اور اس پر مطمئن ہو جانے والے علماء، سیکولر اندازِ حکومت ہی کے مؤید ہو سکتے

ہیں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ ہندوستان کے نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۷ر اپریل ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد (دیوبندی) کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:-

"یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔"

انہی علماء کے سرخیل، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے جن کا مسلک یہ تھا کہ:-

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔"

(زمزم۔ مورخہ ۷، جولائی ۱۹۳۸ء)

اس کے برعکس، قائداعظم، علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے مصروف جدوجہد تھے۔ ظاہر ہے کہ "علماء" کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت فطری امر تھی۔ یہ ان کے "تصورِ اسلام" کے خلاف تھی۔ یہ تھی ہندوستان میں، تحریک پاکستان اور علماء کے درمیان کھلی ہوئی جنگ کی حقیقی وجہ۔ پاکستان وجود میں آگیا اور علماء کا یہ گروہ ادھر آگیا۔

_____ یہاں بھی ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی حکومت قائم نہ ہونے پائے کیونکہ اس سے ان کے فرقہ وارانہ اسلام کی اجارہ داری باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ حضرات ہر فرقہ کے پرسنل لاز کی آزادی کا چرچا تو ہر جگہ کرتے ہیں لیکن پبلک لاز کے ضابطہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ یہ یہاں اسی انداز کی سیکولر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے داعی (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے ہمنوا حضرات تھے۔ اس قسم کی حکومت میں اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، تو یہ اسے اسلامی حکومت قرار دیں گے۔ اگر اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو وہ غیر اسلامی حکومت ہوگی۔

ان کے علاوہ تحریک پاکستان _____ کے خلاف ایک اور عنصر بھی کارفرما تھا۔

یعنی جماعت اسلامی۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پہ تھی۔ ایک یہ کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پہ، غیر مسلموں سے ایک الگ قوم ہیں۔ اور (۲) ہمارے دین کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس میں اسلام ایک زندہ حقیقت بن سکے۔

اس جماعت کے بانی، ابوالاعلیٰ، مودودی صاحب کی کوشش تھی کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ دونوں دعاوی باطل ہیں، انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، محض پیدائشی مسلمان ہیں، حقیقی مسلمان نہیں۔ لہٰذا ان کا، اسلام کی بنیاد پہ جداگانہ قومیت کا دعویٰ ہی باطل ہے۔ دوسرے مطالبہ کے متعلق انہوں نے کہا کہ یہ لوگ جس حکومت کے قیام کے لئے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ اسلامی حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔ لہٰذا، اس بنا پہ بھی ان کا دعویٰ باطل ہے اور یکسر غیر اسلامی۔

ان کی اس جد و جہد کے باوجود پاکستان وجود میں آ گیا تو یہاں انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ "اسلام ایک چلا ہوا کارتوس" ہے۔ اس زمانے میں اسلامی حکومت کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلامی مملکت کے قیام کی شرطِ اولین یہ ہے کہ اس میں پبلک لاز کا ایسا ضابطہ وضع کیا جائے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پہ یکساں طور پہ ہو سکے۔ اسے ناممکن کرنے کے لئے مودودی صاحب نے ایک خاص انداز اختیار کیا۔ بیس پچیس سال تک وہ یہ کہتے رہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد "کتاب و سنت" پہ ہے۔ یہ بڑا معصوم اور مقدس نعرہ تھا جس کی لم کو سادہ لوح مسلمان سمجھ نہ سکا۔ جب وہ کتاب و سنت" کی اہمیت اس طرح ثبت کر چکے تو اس کے بعد فرمایا کہ "کتاب و سنت" کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ کھلے الفاظ میں اس کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ اب دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ان کے پیش کردہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل، اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے۔ ان نوجوانوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی تو پھر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی ضرورت کیا تھی! ہماری نئی نسل کے دلوں میں ان خیالات نے پرورش پانا شروع کر دیا ہے۔ یہ خیالات ذرا پروان چڑھے تو یہاں یہ تحریک اُبھرے گی کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ مل جانا چاہئیے تاکہ روز روز کے دردِ سر سے چھٹکارا حاصل ہو۔ مودودی صاحب ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے ایک حصہ میں مملکتِ پاکستان قائم کرنے کے خلاف تھے اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہا کرتے تھے کہ:-

"یہ لوگ ہندوستان کے ایک دور کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔"

(روئداد جماعت اسلامی۔ حصہ پنجم۔ صـ ۶۵)

صرف ایک سوال

آپ ان حضرات سے صرف ایک سوال پوچھئے۔ اور وہ یہ کہ:۔

"کیا کتاب وسنت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکتا ہے جسے یہاں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں"؟

مودودی صاحب تو واضح الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ ایسا کیا جانا ناممکن ہے۔ لیکن اگر دیگر علماء حضرات اسے ممکن سمجھتے ہوں تو ان سے کہئے کہ ان کا اوّلین دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر دیں۔ اس سے وہ تمام مسائل حل ہو جائیں گے جو گذشتہ تیس برس سے ساری قوم کے لئے سوہانِ روح بن رہے ہیں۔

مرغدین
(ملکِ خداداد)

میں نے اس خطاب کو قانون سازی کے اصولوں تک محدود رکھا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ جس خطۂ ارض میں اسلامی مملکت قائم ہوگی وہاں کے معاشرہ کا نقشہ کیا ہوگا۔ یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن ان تمام تفاصیل کو انہوں نے جاوید نامہ میں، فلکِ مریخ پہ مرغدین کے نام کے مثالی خطہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور وہ یہ ہیں:۔ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش   خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

خوش کلام، خوش گل، نرم طبع، سادہ پوش، تسخیر قوائے فطرت میں اتنی بلندیوں پہ پہنچے ہوئے کہ اپنے کاروبار کے لئے تمام توانائی (ENERGY) سرچشمۂ حرارت (آفتاب) سے براہِ راست حاصل کرنے والے

فکرِ شاں، بے دردو سوزِ اکتساب   رازداں کیمیائے آفتاب
ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور   چوں نمک گیریم ما از آبِ شور

وہاں علم و ہنر کا مقصد، نوعِ انسانی کی خدمت ہوگا نہ کہ حصولِ زر و سیم۔ سکّوں کا اس میں رواج ہی نہ ہوگا ؎

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر   کارہا راکس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست   ایں بتاں را در حرم ما راہ نیست

نہ وہاں ایسی مشینیں ہوں گی جو بھوتوں کی طرح انسان کے سر پر سوار ہوں گی۔ نہ فیکٹریوں کی چمنیاں فضائے آسمانی کو دھوئیں سے دھندلا رہی ہوں گی۔ مشینیں خدمتگار۔ دھوئیں کی جگہ آفتابی حرارت ؎

بر طبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست   آسمانہا از دخانہا تیرہ نیست

وہاں کا کسان نہایت مرفہ الحال اور خوش و خرم ہوگا۔ نہ زمیندار کی سلب و نہب (EXPLOITATION) اس کا خون چوسے گی نہ اس کی محنت کا ماحصل کوئی اور چھین کر لے جائے گا ؎

سخت کوش دہقاں، چراغش روشن است   از نہابِ دہ خدایا ایمن است
کشت و کارش بے نزاع آبجو است   حاصلش بے شرکتِ غیرے از اوست

چونکہ وہاں سلب و نہب (EXPLOITATION) کا تصور ہی نہ ہوگا اس لئے باہمی مفاد کے تصادم (CLASH OF INTERESTS) کا بھی سوال پیدا نہ ہوگا اور جب مفاد کا تصادم نہ ہوگا تو پھر کشت و خون بھی نہ ہوگا۔ ہر طرف امن ہی امن ہوگا اس لئے وہاں بے کار فوجیں (STANDING ARMIES) رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی ؎

اندراں عالم نہ لشکر نے قشون   نے کسے روزی خورد از کشت و خون

وہاں کے اہلِ قلم بھی پروپیگنڈے کی دروغ بافیوں میں مصروف نہ ہوں گے ؎

نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ   از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

نہ وہاں کوئی بیکار ہوگا نہ گداگر ؎

نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش   نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

دو لفظوں میں یہ سمجھئے کہ نہ وہاں کوئی سائل ہوگا نہ محروم۔ نہ کوئی کسی کا آقا نہ کوئی غلام۔ نہ کوئی کسی کا حاکم نہ کوئی کسی کا محکوم ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست   عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس کے بعد حکیم مریخی نے بتایا کہ تمہارے ہاں معاشرہ میں جو اس قدر ناہمواریاں اور فساد انگیزیاں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اشیاء کو افراد کی ملکیت تصوّر کر رکھا ہے۔ ملکیت کا تصوّر تمام فسادات کی جڑ ہے۔ یہاں ہر شے خدا کی ملکیت ہے اور انسانوں کے سپرد بطور امانت کی جاتی ہے ؎

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست مرد ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

زمین خدا کی ہے اور افراد اس کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ یہ قرآن کے حکم کی صریح مخالفت ہے ؎

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو! چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا

لہٰذا صحیح نظام یہ ہے کہ ہر شے "خدا کی ملکیت" میں دے دی جائے ؎

کس امانت را بکارِ خود ۔۔۔۔ نبرد اے خوش آں کو ملک حق با حق سپرد

ملک یزداں را بہ یزداں باز دہ تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ!

یہ تمام محتاجی اور غریبی، افلاس اور زبوں حالی اس لئے ہے کہ خدا کی ملکیت کو انسانوں نے اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے ؎

زیر گردوں فقر و مسکینی چراست آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست

جب تم اپنی نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا کر لوگے تو تمہاری خارجی دنیا خود بخود بدل جائے گی ؎

نوع دیگر بیں، جہاں دیگر شود ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہ تھا اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں معاشرہ کا نقشہ اور اسلامی نظام کا ماحصل۔ یعنی ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبین، ایں است و بس

والسلام

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ

قرآن

(بتقریب یومِ اقبالؒ ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء)

علامہ اقبالؒ کو ان کی زندگی ہی میں جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، شاید ہی کسی اور مفکر یا شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے (یوں کہیے گویا اپنی زندگی کے آخری سانس میں) کہا کہ:۔

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک   ہمہ گفتند با ما آشنا بود

ولیکن کس ندانست ایں مسافر   چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود   (ارمغانِ حجاز۔ ۱۹۹)

اس وقت تو اسے عام طور پر شاعرانہ گلہ طرازی پر محمول کیا گیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور گزرتا جا رہا ہے، یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، شاعری نہیں تھی ایک حقیقت تھی جس کا انہوں نے بصد درد و سوز اظہار کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی فکر اور شعر، ان کے کلام اور پیام کے متعلق ہزاروں مقالات لکھے گئے اور سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں ——— گذشتہ قریب چالیس برس کے طول طویل عرصہ کو تو چھوڑیے، ۱۹۷۶ء کے ایک سال میں، جسے ان کی پیدائش کے صد سالہ جشن کے طور پر منایا گیا۔ ان موضوعات پر جس قدر کہا، لکھا اور شائع کیا گیا وہ اعداد و شمار کے احاطہ میں بمشکل سما سکے گا لیکن اربابِ فکر و نظر اس کی تصدیق کریں گے کہ اس کے باوجود، اقبالؒ نے اپنے آخری وقت میں جو کہا تھا وہ آج بھی اسی قدر مبنی بر حقیقت ہے جس قدر ان کی وفات کے وقت تھا۔ مطالعۂ اقبالؒ کے سلسلہ میں بنیادی طور پر متعین کیا جانا ضروری تھا کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس موضوع پر بھی آپ دیکھیں گے کہ کچھ کم نہیں لکھا گیا ——— اس کے ڈانڈے کہیں "مغرب کے سیاروں" سے ملائے گئے، کہیں "مشرق کے ثوابت" سے ——— لیکن اصل حقیقت کی طرف کسی کی نگاہ نہ اٹھی۔ حالانکہ اسے حضرت علامہؒ نے اپنی سب سے پہلی تصنیف ———

مثنوی اسرار و رموز ـــــــــ میں واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں "عرضِ حال مصنف بحضور رحمۃ اللعٰلمین" کے زیرِ عنوان کہا تھا: ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ۔۔۔ ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم ۔۔۔ اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن ۔۔۔ بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من ۔۔۔ زہر ریز اندر مئے کافورِ من

اور اس کے بعد اپنے لئے وہ بد دعا کہ جس سے زیادہ جگر پاش اور قلب سوز بد دعا، اقبالؒ اپنے حق میں کر نہیں سکتا تھا (اور میں تو اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس بد دعا کی ان میں ہمت کیسے پیدا ہو گئی" اور ان الفاظ کو وہ زبان تک کیسے لے آئے!) کہ: ؎

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ۔۔۔ بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

"بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا" کی درد انگیزی اور جگر دوزی کا اندازہ وہ حضرات بخوبی لگا سکیں گے جنہیں اس کا علم ہے کہ حضورؐ نبی اکرم کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ اقبالؒ کے عشق کی کیفیت کیا تھی۔ اقبالؒ کا بحضور رحمۃ اللعٰلمینؐ یہ عرضداشت پیش کرنا کہ، جو کچھ میں نے کہا ہے اور جو کچھ میں کہوں، اگر اس میں غیرِ قرآن کچھ بھی مضمر ہو تو ـــــــ بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا، اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس منفیانہ انداز کے بعد، انہوں نے مثبت طور پر کہا کہ: ؎

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام ۔۔۔ با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس، کس است ۔۔۔ یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل ۔۔۔ عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ ۔۔۔ بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ

در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم، گُہر گرداں مرا

(رموز و اسرار۔ صـ ۱۹۵-۱۹۶)

اسی حقیقت کو وہ دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:۔

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

از نب و تابم نصیبِ خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام — شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام (مسافر صفحہ ۴۳)

وہ، ارمغانِ حجاز میں، شعرائے عرب کو ایک پیغام دیتے ہیں کہ:۔

بگو از من نواخوانِ عرب را — بہائے کم نہادم لعلِ لب را

ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم — سحر کردم صد و سی سالہ شب را (صفحہ ۱۱۱)

جاوید نامہ میں "نوائے سروش" کے زیر عنوان کہتے ہیں۔

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم — تقدیرِ امم دیدم۔ پنہاں بکتاب اندر (صفحہ ۴۳)

اقبالؒ کے ہاں، کتاب سے مراد، کتابِ خداوندی' قرآن مجید ہی ہوتی ہے۔ بالِ جبریل میں کہتے ہیں:۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا — کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر (صفحہ ۲۸)

وہ بصد حسرت کہتے ہیں کہ:۔

کس نمی داند ز اسرارِ کتاب — شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب (جاوید نامہ صفحہ ۸۶)

وہ انقلابِ روس کے بانیوں سے پہلے پوچھتے ہیں کہ:۔

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے

اور اس کے بعد انہیں کہتے ہیں کہ:۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب (جاوید نامہ صفحہ ۸۸)

عظیم تحفہ

ان کی نگاہوں میں قرآنِ کریم کی عظمت کس قدر تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب وہ شاہِ افغانستان۔ نادر شاہ (مرحوم) کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے تو ان کے لئے ایک ہی تحفہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔ وہ تحفہ کیا تھا، فرماتے ہیں ؎

در حضورِ آں مسلمانِ کریم! — ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم

گفتم ایں سرمایۂ اہلِ حق است — در ضمیرِ او حیاتِ مطلق است

اس کے جواب میں شاہِ مرحوم نے کہا:۔

گفت "نادر در جہاں بے چارہ بود | از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر | از غمانِ بے حسابم بے خبر
غیرِ قرآں غمگسارِ من نہ بود!
قوتش ہر باب را بر من کشود"
(مسافر صد ۱۵-۱۴۰)

وہ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے عازمِ لندن ہوئے تو راستے میں کچھ وقت کے لئے دہلی رُکے۔ اہلِ دہلی نے ان کی خدمت میں بہت سے سپاسنامے پیش کئے۔ آپ نے جامع مسجد دہلی کے امام شمس العلماء مولانا سیّد احمد (مرحوم) کے سپاسنامہ کے جواب میں فرمایا:-

"جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیوٹ سیکرٹری ہے جو میرے لئے ضروری مواد فراہم کرے، نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں۔ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن پاک) ہے جس کی روشنی میں، میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا"۔
(گفتارِ اقبالؒ، از محمد رفیق افضل۔ صد ۱۳۶)

اپنے مسلک کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالے سے بتایا ہے"۔ (اقبال نامہ۔ حصہ اول صد ۱۳۰)

ان چند تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اقبالؒ اپنی فکر اور پیغام کا سرچشمہ قرآن کریم بتاتے ہیں اس کے بعد آپ سوچئے کہ ہمیں ان کی فکر کی اساس کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے انہوں نے اس حقیقت کو ایسے واضح انداز سے واشگاف کیا ہے کہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ نہ شک ہو سکتا ہے نہ ریب۔ یہ صحیح ہے کہ اقبالؒ بالآخر ایک انسان تھے اور اس جہت سے، قرآن کریم کے سمجھنے میں بعض اوقات ان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور سہو بھی۔ انہوں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے قرآنِ مجید کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق خود حضرتِ علامہ سے سیکھا ہے۔ میرے دل میں ان کی جس قدر عظمت اور احترام ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے لیکن اس کے باوجود بعض مقامات پر ان کی فکرِ قرآن سے میں بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ اور، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دیگر قرآنی ذوق رکھنے والے حضرات بھی ان سے اختلاف

کریں۔ لیکن اس کے باوجود، یہ حقیقت اپنے مقام پر محکم ہے کہ انہوں نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآن کریم ہی قرار دیا ہے، اور وہ ساری عمر قرآن ہی کے حقائق اور پیغام عام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ وہ قرآنِ مجید کے حقائق سے متعلق نثر میں کوئی کتاب نہ لکھ سکے۔ وہ مقدمۃ القرآن کے عنوان سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی۔ وہ جب علاج کی غرض سے بھوپال تشریف لے گئے ہیں تو انہوں نے (۲۲، جولائی ۱۹۳۰ء کو) تاثیر (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:۔

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کو سر راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے انہوں نے تاحیات پانچ سو روپیہ ماہوار کی لٹریری پنشن عطا فرمائی ہے۔ آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہوگا۔ اب ذرا صحت اچھی ہو لے تو انشاء اللہ اس کتاب کو لکھنا شروع کروں گا۔"

(انوارِ اقبالؒ۔ بشیر احمد ڈار۔ صـ ۲۰۵)

قوم کی بدقسمتی کہ ان کی صحت نے اجازت نہ دی کہ وہ اپنی اس آرزو کو پورا کر سکے۔ اگر وہ اس کتاب کو لکھ جاتے تو وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایسی متاعِ گرانبہا ہوتی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے زبانِ شعر میں بہت کچھ کہا ہے لیکن اس سے قرآنی حقائق مربوط شکل میں سامنے نہیں آ سکتے۔ دوسرے شاعری میں تضاد بھی واقع ہو جاتا ہے۔ لطائف میں تو اس سے چنداں ہرج نہیں ہوتا لیکن حقائق کی صورت میں تضاد بہت بڑا نقص ہوتا ہے۔ قرآنی حقائق۔ مربوط شکل میں۔ بلاتضاد، نثری تخلیق ہی میں بیان کئے جا سکتے تھے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا اور یہ ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ:۔

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر   اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر   (بانگِ درا)

اس مقام پر اس جرأتِ عرض کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس مُردہ پرست قوم نے جس قدر اقبالؒ کے مزار کی تعمیر اور ان کے جشنِ پیدائش منانے پر صرف کیا ہے۔ اگر اس کا عشرِ عشیر بھی ان کے علاج اور سفرِ یورپ کے لئے مہیا کر دیتی تو نامعلوم وہ کس قدر گہر ہائے تابدار سے اس کی جھولیاں بھر دیتے۔ انہوں نے سچ

کہا تھا کہ :-

مرا سبُوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں	کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(بالِ جبریل - ص ۹۱)

بہر حال، اس سے واضح ہے کہ فکرِ اقبالؒ کماحقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا تا وقتیکہ اس فکر کے سرچشمہ (قرآن مجید) پر گہری نظر نہ ہو۔

تلاوتِ قرآنِ پاک

حضرت علامہؒ، قرآنی حقائق پر غور و فکر میں تو ہر وقت مستغرق رہتے ہی تھے لیکن اس کے ساتھ انہوں نے تلاوتِ قرآنِ پاک کا بھی عمر بھر التزام رکھا۔ فطرت نے انہیں لحنِ داؤدی عطا فرمایا تھا اس لئے ان کی قرأت میں بڑا سوز و گداز ہوتا تھا اور اس سے وہ خود بھی کیف یاب و سرشار ہوتے تھے۔ عمر کے آخری دور میں، ان کا گلا (قریب قریب) بند ہو گیا۔ اس کا انہیں ایک ہی صدمہ تھا اور وہ یہ کہ

در نفس سوزِ جگر باقی نماند	لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

(پس چہ باید کرد ..... ص ۶۸)

لیکن ان کی یہ تلاوت، لفظی نوا خوانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ رموز و غوامضِ قرآن کی گہرائیوں میں اُترتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کیا جو انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہوا یوں کہ انٹر کالجیئٹ مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام (۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو) منعقد ہونے والے، اقبال ڈے کی تقریب میں شرکت کے لئے "احبابین" دہلی کا ایک قافلہ، زیرِ قیادت، علامہ حافظ اسلم جیراج پوریؒ لاہور آیا۔ اس میں میرے علاوہ شیخ سراج الحق صاحب۔ اسد ملتانی (مرحوم)، اور قاضی محمد اشرف (مرحوم) شامل تھے۔ ۱۰ جنوری کی صبح حضرت علامہؒ نے ہمیں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔ اس محفل کی یاد میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ محترمی سید نذیر نیازی نے اس کی روداد، اپنی کتاب "اقبالؒ کے حضور" میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ واقعہ زیرِ نظر کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے :-

"(حضرت علامہ نے فرمایا) میرا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران

میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ والد ماجد حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا۔ مگر وہ، جیسے کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا اشارہ فرماتے ہیں۔ کہنے لگے، تم کیا پڑھا کرتے ہو۔ مجھے ان کے اس سوال پر بہت تعجب ہوا۔ بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہرحال میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ قرآن پاک ۔ ۔ ۔ ۔ کہنے لگے تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو۔ میں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گزر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کا چھٹا روز تھا کہ میں صبح سویرے حسبِ معمول قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا تھا والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے۔ بیٹا! قرآنِ مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے۔ جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالتمآب ﷺ کے بعد قرآنِ پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے۔ تمہیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآنِ مجید کسی پر نازل نہیں ہو گا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے وہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ (اس کے بعد اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے، حضرت علامہؒ کے والد ماجد نے فرمایا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا۔ اتنا ہی قرآنِ مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآنِ مجید اُس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔" (صہ ۶۱-۶۰)

مطلب یہ تھا کہ قرآنِ مجید کو محض ذہنی طور پر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے مقصود و منتہا کو دل کی گہرائیوں میں پیوست کیا جائے۔ اس سے انسانی ذات میں عجیب تغیر واقع ہو گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تغیر کس حد تک پیدا ہو چکا ہے اور اس کی سمت کس طرف کو ہے۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے کس حد تک مطابق

ہے۔ قرآن فہمی کے اسی مقصود کے متعلق حضرت علامہ نے کہا ہے کہ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود (جاوید نامہ صـ۹)

نزولِ کتاب

اسی کو آپ نے "نزولِ کتاب" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ :۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحبِ کشاف (بالِ جبریل صـ۱۱۲)

دوسری جگہ کہا کہ : ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس میں ایک یہ نکتہ بھی پنہاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے، نزولِ قرآن کے سلسلہ میں، قرآن کا مہبط، قلب نبوی قرار دیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ : فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷) "جبریل نے اسے تیرے قلب پر نازل کیا" لہٰذا جب قرآنی حقائق انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں تو اس وقت کہا جا سکے گا کہ قرآن گویا اس پر نازل ہو رہا ہے ـــــ یعنی اس کے ذہن سے اس کے قلب پر اتر رہا ہے اس وقت انسان کے افکار و کردار، قرآن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ وہ "مردِ مسلمان ہے" جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ : ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم، کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
(ضربِ کلیم۔ صـ۵۷)

پھر یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کے ذریعے، خدا اور بندے کے درمیان، عجیب و غریب تعلق پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی، حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے مختص تھی اور اس کا سلسلہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ وحی کو خدا کی طرف سے ہمکلامی کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ جہاں کہا ہے :۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۴/۱۶۴) اور اس نے قرآن مجید کو بھی كَلٰمَ اللّٰهِ (۹/۶) کہا ہے۔

خدا سے ہمکلامی

اب ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ (قرآنِ مجید میں) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بلکہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا بندے سے ہمکلام ہوتا ہے۔ دوسری طرف انسان جب خدا سے کوئی سوال کرتا ہے تو وہ (قرآن مجید کے ذریعے) اسے اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) کا یہی مطلب ہے۔ لہٰذا قرآن کے ذریعے

انسان کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے اور یہ شرف بڑا عظیم ہے۔

واضح رہے کہ ختمِ نبوت کے بعد، خدا، انسان سے صرف قرآنِ کریم کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے اس کے سوا خدا سے ہم کلامی کا کوئی طریق نہیں۔ کشف اور الہام وغیرہ کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔

بہرحال، علامہ اقبالؒ قرآن کی تلاوت اس انداز سے کرتے تھے کہ وہ شعور کے راستے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ بایں ہمہ انہیں کشف والہام کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ چونکہ کائناتی حوادث قوانینِ خداوندی کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور قرآن کریم میں غور و تدبر سے انسان ان قوانین کی کارفرمائی کو سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس لئے اسے قرائن و شواہد سے آنے والے واقعات کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو تدبر فی القرآن سے اسی قسم کی بصیرت حاصل تھی اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ے

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہاں انہوں نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے (یعنی فکر و شعور) کشف والہام یا علم باطنی نہیں کہا۔

اب یہ دیکھیے کہ حضرت علامہ، قرآنِ مجید کا تعارف کس کس انداز سے کراتے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ کارگہِ فکر میں ڈھلے ہوئے الفاظ نہیں جن کی نمود میکانکی طور پر ہو جاتی ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے گہر تابدار ہیں جو جذب و کیف کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، وجہ تابانیٔ قلوب و اذہان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پہلی تصنیف "اسرار و رموز" میں کہتے ہیں:۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟　　زیرِ گردوں، سرِ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم　　حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے　　آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او　　در فتد با سنگ جام از زورِ او
نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ او رحمۃ للعالمین　(صفحہ ۱۲۳)

قرآنی آئین و نظام کے اتباع سے انسان کے اندر جو تبدیلی واقعہ ہوتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

خستہ باشی ! استوارت می کند پختہ مثل کوہسارت می کند

گر زمینی ! آسماں سازد ترا آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

" آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا " ———— اس ایجاز میں جس قدر اطناب پوشیدہ ہیں ، ان کا اندازہ اربابِ نظر ہی لگا سکتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ قرآنی تعلیم کے اثمار و نتائج کے متعلق اس سے بہتر اور برجستہ شاید ہی کچھ اور کہا جا سکے ۔ اس میں ، مشیتِ خداوندی کے مقصود و مطلوب کی پوری دنیا سمٹ کر آگئی ہے (آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا) ۔

گفتار میں ، کردار میں ، اللہ کی برہان

" اسرار و رموز " ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :-

قلبِ مومن را کتابش قوت است حکمتش حبل الورید ملت است (ص۱۱۰)

قرآن ، انفرادی طور پر کس قسم کی قلبی ماہیت پیدا کرتا ہے اور اُمت کی اجتماعی زندگی میں کس قدر محکمیت کا ضامن بنتا ہے ۔ اس ایک شعر میں دونوں خصوصیات سمو کر رکھ دی گئی ہیں ۔

وہ ، مثنوی مسافر میں رقمطراز ہیں :-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

می دہد ما را پیامِ لاتخف می رساند بر مقامِ لاتخف (ص۴۳)

حضرات انبیاء کرامؑ ، عظیم آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے ۔ ان کی انقلابی دعوت کے خلاف ، مفاد پرست قوتیں ہجوم کر کے اُمڈ آتی تھیں ۔ ان کے ساتھ تزاحم و تخاصم کی ہنگامہ آرائیاں بڑی ہمت طلب اور صبر آزما ہوتی تھیں ۔ ان مقامات پر انہیں خدا کی طرف سے سکینت و طمانیت کے اس قسم کے پیغامات موجبِ حوصلہ افزائی ہوتے تھے کہ : لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (۲۰/۶۸) " تم خوف زدہ مت ہو ، آخر الامر تم ہی غالب آؤ گے ۔ " کم و بیش یہی الفاظ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کے لئے کہے ہیں ۔ ان سے کہا ہے کہ ہجوم مشکلات سے گھبراؤ نہیں ۔ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) جب تمہارا قرآن کی صداقتوں پر ایمان ہے تو پھر گھبرانے اور خوف کھانے کی کون سی بات ہے ۔ تم ثابت قدم

رہو۔ آخر الامر تمہیں غالب آؤ گے۔

قرآن کی عظمت

انہوں نے جاوید نامہ میں، قرآنِ کریم کی حقیقت و عظمت کو بڑے وجد آفریں انداز میں بیان کیا ہے:۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ـــــ ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

قرآنِ مجید کے تفصیلی تذکرہ کے لئے اگر ضخیم تصنیفات بھی قلمبند کی جائیں تو جو بات "چیزے دیگر است" میں کہی گئی وہ ان ضخیم مجلدات میں بھی سما نہ سکے۔ اس جامعیت میں تو حقائق و رموز کی ایک دنیا جھلمل جھلمل کر رہی ہے یہ وہ آنکھ کی پتلی (مردم دیدہ) ہے جس میں آسمان سمٹ کر آجاتا ہے۔ امیر خسروؒ نے اپنے محبوب کے متعلق کہا تھا کہ:۔

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام ـــــ بسیار خوبان دیدہ ام، اما تو چیزے دیگری

اقبالؒ نے یہی الفاظ قرآن کے متعلق کہہ کر، بتا دیا کہ اس کا محبوب کون ہے اور کیا ہے؟ اس شعر کو پڑھئے کیونکہ اس کا مفہوم اس شعر کو ساتھ ملانے سے نمایاں ہو سکے گا جو اس کے بعد آیا ہے:۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ـــــ ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است (ص۹۰)

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود ـــــ جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

"جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود" قرآنِ کریم کے ایک عظیم فلسفۂ حیات و لائحہ انقلاب کی تفسیر ہے۔ اس نے قوموں کی زندگی میں انقلاب آفرینی کا راز یہ بتایا ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) یاد رکھو! (تم خود تو کیا) خدا بھی کسی قوم کے احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ قوم کی خارجی دنیا میں انقلاب آ نہیں سکتا جب تک وہ اپنی داخلی دنیا میں ـــــ انقلاب نہ پیدا کرلے۔ جب تک کسی قوم کے قلب و دماغ، اس کی فکر و نظر، اس کے تصورات و تخیلات، اس کی اقدارِ حیات، اس کے نصب العین زندگی میں تبدیلی نہیں پیدا ہو جاتی، اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ قوموں کی خارجی دنیا، ان کی داخلی دنیا کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ جس قسم کی ان کی داخلی دنیا، اسی قسم کی ان کی خارجی دنیا۔ علامہ اقبالؒ پیامِ مشرق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر

میں مشکل نہ ہو"۔ بنابریں جب قرآنی اقدار کسی قوم کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس کی خارجی دنیا میں انقلاب آجاتا ہے۔ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود
اندرو تقدیر ہائے غرب و شرق — سرعت اندیشہ پیدا کن چو برق (صفحہ ۹۱)

قرآن کی بیان کردہ "تقدیرات" کے سمجھنے کے لئے سرعتِ اندیشہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ؎

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

جاوید نامہ ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :۔ ؎

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر، اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دھد قرآں جہانے دیگرش (صفحہ ۷۳-۷۴)

ان آیات میں جس حسنِ کارانہ اور معجزانہ انداز سے قرآن کی ابدیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ جوں جوں انسان اس پر غور کرتا ہے، اس کی رُوح وجد میں آجاتی ہے۔ یہ نکتہ ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کو منزلِ انسانیت تک لے جانے والے راستے کی طرف راہ نمائی اپنے ذمہ لی اور اس کے لئے حضرات انبیاءِ کرامؑ کی وساطت سے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ جب نوعِ انسان عالمِ طفولیت میں تھی تو اس پروگرام کی صورت یہ تھی کہ اس میں اصولی ہدایات کم ہوتی تھیں اور عملی جزئیات زیادہ ——— اس

آسمانی ہدایت کی ابدیت

زمانے میں تو حالت یہ تھی کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا طریق بھی بذریعہ وحی بتانا پڑا۔ جوں جوں نوعِ انسان عمر میں بڑھتی گئی اور اس کا شعور پختہ ہونا شروع ...... ہوا تو اس پروگرام کی جزئیات میں کمی اور اصولوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ تاآنکہ جب وہ عالمِ شباب تک پہنچ گئی اور مشیت نے دیکھ لیا کہ اب انسان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود مرتب کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ تو اس نے ان تمام اصولوں کو جن کی انسانی راہ نمائی کے

لئے ضرورت تھی مکمل شکل میں، وحی کے آخری ضابطہ، قرآن کریم میں محفوظ کر دیا اور سلسلۂ وحی اختتام تک پہنچ گیا۔ (ختم نبوّت کے یہی معنی ہیں)۔ اب انسانوں کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن میں غور کریں کہ اس نے، ان کے حل کے لئے کیا اصول دیا ہے اور اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے خود وضع کریں۔ اس طرح یہ کتاب ہدیٰ قیامت تک انسانی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔ یہ کہیں نہیں کہے گی کہ مجھ میں راہ نمائی دینے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے اس طریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ :- سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳) "ہم انہیں (نوعِ انسان کو خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی زندگی میں اپنی "نشانیاں" دکھاتے جائیں گے۔ تاآنکہ ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے۔" یعنی جوں جوں علم انسانی آگے بڑھتا جائے گا۔ قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ ایسا ہو سکتا ہے (اور ہوتا ہے) کہ عقل و فکر اور تجربہ اور مشاہدہ کی رُو سے جن حقائق کا ادراک ہو۔ انسان انہیں قرآن کے حوالے سے پیش نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہوں گے قرآنی حقائق ہی۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ علم الانفس و آفاق سے کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ قرآن کے خلاف جائے۔ ہماری اس ملاقات میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑے لطیف اور دقیق انداز سے ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ :-

> "قرآنی حقائق کے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں۔ حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا۔ کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری، کبھی جزءً کبھی تماماً۔ اب اگر انسان وہ سب حقائق جو اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کئے ہیں۔ یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اس کی رسائی ہوتی باہم فراہم کر لے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو ان سے قرآن پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہو گی۔"

اس کے بعد قدرے توقف سے فرمایا :-

> حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آ چکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق کسی کی زبان سے ادا ہوں، خواہ لینن

کی، حقائق بہرحال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ مقصد ان کا سمجھنا ہے اور قبول کرنا ہے۔ لہٰذا، انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہوگا۔ اس کی تعلیم سے بہرہ ور ہونا ہوگا۔"
(اقبالؒ کے حضور۔ صہ ۵۸-۵۷)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان عمیق الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :-

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

یہ نورِ مصطفیٰ وہی ہے جو حضورؐ نبی اکرم کی وساطت سے دنیا کو ملا اور اب قندیلِ قرآنی میں محفوظ ہے۔
یَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ ... (۲۴/۳۵)

ان تصریحات کی روشنی میں، جاوید نامہ کے ان اشعار کا مطلب سمجھ میں آجائے گا جنہیں میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے کہ :-

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است

(printed couplet second line reads:) چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

اس طرح قرآن کے اصول و حقائق، ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے اور انسانی زندگی کے ہر مشکل مسئلہ کا حل بتاتے، کاروانِ انسانیت کے راہ نمائی چلے جاتے ہیں۔ یہ کسی مقام پر اس کی راہنمائی سے عاجز نہیں آتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے، گوئٹے نے ایکرمن کو ان الفاظ میں سمجھایا تھا کہ :-

"اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام نہیں رہتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے ساتھ، اس سے آگے نہیں جا سکتے اور اصل تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔"
(خطباتِ اقبالؔ۔ صہ ۸)

یہ ہے قرآن کی ابدیت!

قرآنی انقلاب

یہاں تک تو قرآنی حقائق سے بحث تھی۔ اب یہ سوال ہے کہ ان حقائق، یا قرآنی اصولِ حیات سے نوعِ انسان کو حاصل کیا ہوا؟ ان کے اتباع سے نتیجہ کیا مرتب ہوا، اور کیا مرتب ہوگا؟ اس اہم سوال کا جواب، علامہ اقبالؒ نے دو لفظوں میں نہایت جامعیت سے دیا ہے جہاں کہا کہ :-

چیست قرآں، خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ (جاوید نامہ صـ ۸۹)

"خواجہ را پیغامِ مرگ" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے، انسانوں پر دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی بالادستی کا خاتمہ کر دیا۔ اسی حقیقت کو انہوں نے، "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کی زبان سے اِن الفاظ میں دہرایا ہے کہ:۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

(ارمغانِ حجاز۔ صـ ۲۲۵)

اب آگے بڑھئے۔ حضرت علامہ اس حقیقت کو شرح و بسط سے واضح کرتے ہیں کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے جس قدر قوت و حشمت، دولت و ثروت، شوکت و مملکت، رفعت و عظمت اور ان سب کے ساتھ شرف و مجد انسانیت کے مقاماتِ بلند حاصل کئے، تو وہ سب اتباعِ قرآن کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس قوم نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر "عجمی اسلام" اختیار کر لیا تو اس کی وہ حالت ہو گئی جس کا ہم سب رونا روتے ہیں۔ اقبالؒ کو اُمتِ مرحومہ کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی نکبت و زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر اس قدر شدّت و تکرار سے لکھا ہے کہ اس سے ایک مستقل تصنیف وجود میں آ سکتی ہے۔ لیکن میں اس وقت ان میں سے صرف وہ مقامات پیش کروں گا جن میں انہوں نے براہِ راست قرآن کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ :۔

اُمت کی تاریخ

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (جاوید نامہ صـ ۹

اس کے بعد کیا ہوا، غور سے سنئے۔ پہلے اس حقیقت کو باصد حسرت پیش کرتے ہیں کہ :۔

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ اُو آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰ در سینۂ اُو زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغِ اُو نہ مے دیدم نہ دُرد

اس کے بعد کہتے ہیں کہ کس قدر مقامِ حیرت و تأسف ہے کہ :۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

تانہال سلطنت قوت گرفت دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و راہ گردد دگر (جاوید نامہ صہ۸۷)

اس قوم میں اس محیر العقول تبدیلی کا راز، اس نکتہ میں پنہاں ہے کہ ان کی خلافت ملوکیت میں بدل گئی۔ خلافت نے انہیں، ہر نوعِ غلامی سے رستگاری عطا کر دی تھی۔ ملوکیت نے ان کی آزادی کو سلب کر لیا۔

بچوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت حریت را زہر اندر کام ریخت (اسرار و رموز صہ۱۴)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق مومن و غداری و فکر و نفاق!
با پشیزے دین و ملت را فروخت ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت
لاالٰہ اندر نمازش بود، و نیست نازہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوٰتِ او نماند جلوۂ در کائناتِ او نماند
روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام فرد ناہموار و ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی
ہر کسے بر جادۂ خود تند رو ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ رو

واحسرتاکہ ؎

صاحبِ قرآں و بے ذوقِ طلب العجب، ثم العجب، ثم العجب!
(جاوید نامہ صہ۲۳۵-۳۶)

وہ کہتے ہیں کہ یہ بات کس قدر ناقابل فہم ہے کہ جس قوم کے پاس ایسی کتاب زندہ موجود ہو، وہ قوم مُردہ ہو! وہ بصد حیرت کہتے ہیں کہ ؎

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کُرد یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد؟ (جاوید نامہ صہ۸۴)

وہ مسلمان سے کہتے ہیں۔

زِ قرآں پیشِ خود آئینہ آویز دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را قیامت ہائے پیشیں را برانگیز! (ارمغان حجاز صہ۱۰۲)

تحریکِ پاکستان کے دوران ایک عجیب حیرت افزا، اور دل خراش حقیقت سامنے آئی۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر (مہاتما) گاندھی تھا جس کی تمام تگ و تاز کا مقصد قدیم ہندو دھرم کا احیاء تھا۔ اس کے مقابلے میں، قومیت پرست مسلمان لیڈروں کی حالت یہ تھی کہ وہ اسلام کے ایک ایک بنیادی عنصر کو خیر باد کہتے چلے جاتے تھے۔ کہیں ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی نما لیڈر تھے جو مذہب کو داستانِ پارینہ قرار دیتے تھے کہیں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جیسے ماہرینِ تعلیم تھے جو مہاتما گاندھی کے تجویز کردہ خطوط پر "وار دھا کی تعلیمی اسکیم" مرتب فرما رہے تھے۔ کہیں امام الہند، مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو اسلام کا برہمو سماجی ایڈیشن پیش کر رہے تھے۔ کہیں (شیخ الحدیث، مولانا) حسین احمد مدنی جیسے علماء کرام تھے جو متحدہ قومیت اور سیکولرازم کو عین مطابقِ اسلام قرار دے رہے تھے۔ یہ تھی وہ سینہ سوز حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے باصد نالہ و فغاں کہا تھا کہ : ۔

در صد فتنہ را بر خود کشادی ۔۔۔ دو گامے رفتی و از پا فتادی

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست ۔۔۔ تو قرآں را سرِ طاقے نہادی ۔۔۔ (ارمغانِ حجاز) ص۱۳۶

اور یہ کہ : ۔

نگہ دارد برہمن کارِ خود را ۔۔۔ نمی گوید بکس اسرارِ خود را

بمن گوید کہ از تسبیح بگذر ۔۔۔ بدوشِ خود برد زنارِ خود را ۔۔۔ (ارمغانِ حجاز) ص۱۳۷

مُلّا اور قرآن

میرے نزدیک، حضرت علامہ کا سب سے بڑا اور معرکہ آرا، کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بکمالِ جرأت و جسارت اس حقیقت کو طشت از بام کیا کہ اُمت کو قرآن سے برگشتہ کرنے کی بنیادی ذمہ داری ہماری مذہبی پیشوائیت پر عائد ہوتی ہے جسے وہ مُلّا کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے مُلّا کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کسی خاص مُلّا یا طبقہ علماء کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کی INSTITUTION کے خلاف ہے۔ جس نے اسلام کو کچھ کا کچھ بنا دیا اور اُمت کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ عنوان، ایک مستقل موضوع ہے جسے میں کسی دوسری نشست پر اُٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میں اس کے ان دو ایک ضمنی گوشوں کو سامنے لاؤں گا۔ جن کا تعلق براہِ راست قرآن سے ہے۔ وہ جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتے ہیں : ۔

دینِ حق از کافری رسوا تراست | زانکہ مُلّا مومن کافر گراست!
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است | از نگاہِ او یمِ ما شبنم است!
از شگرفیہائے آں قرآں فروش | دیدہ ام رُوح الامیں را در خروش
زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ | نزدِ اُو اُمّ الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ | آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد | مِلّت از قال و اقولش فرد فرد

حدیہ کہ :-

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب | کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب!

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد (جاوید نامہ صؔ۸۴)

وہ، مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کہتے ہیں :-

مکتب و مُلّا سخنہا ساختند | مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود، از تاویل مُرد | آتشِ اُو در ضمیرِ اُو فسرد
ہر یکے دانائے قرآن و خبر | در شریعت کم سواد و کم نظر
عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس | منبرِ شاں، منبرِ کاک است و بس
اہلِ کلیمان نیست اُمیدِ کشود | آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود (صؔ۴۲-۴۱)

ان کی تاویل کے متعلق کہتے ہیں :-

زمن بر صوفی و ملّا سلامے | کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت | خدا و جبرئیل و مصطفےؐ را (ارمغانِ حجاز صؔ۱۰۲)

اس کی تشریح ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں | ہُوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق (صؔ۱۳)

ان کی ان تاویلات و تعبیرات کا نتیجہ ہے کہ :-

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
"تن بہ تقدیر" ہے آج اُن کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (ضربِ کلیم صـ۸)

پیغام بہ ملت

ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قرآن کے خلاف سازش کا تارپود بکھیرنے کے بعد، وہ مسلمان سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں اور اسے دو ٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ :۔ ؎

اے گرفتارِ رسومِ ایماں تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

قرآنِ کریم نے، کتاب و حکمت - یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کو منزل من اللہ بتایا ہے۔ جو علم و عقل کی رُو سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی قرآن، مجموعہ ہے کتاب و حکمت کا۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے مسافر میں کہا ہے :۔ ؎

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است — ایں دو قوت اعتبارِ ملت است
آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق — ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامِ خدائے لایزال — مومناں را آں جمال است ایں جلال

اس کے بعد وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں :۔ ؎

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دھد ما را پیامِ لاتخف — می رساند بر مقامِ لاتخف (مسافر صـ۴۲)

وہ خصوصیت سے مغرب[1] زدہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :۔ ؎

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو — دامنِ قرآں بگیر، آزاد شو

صـ۱ " اقبالؒ اور تہذیبِ مغرب الگ موضوع ہے۔ جس پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

اب ہم اس موضوع کی طرف آتے ہیں جو فکرِ اقبالؒ میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو اس سے اسلام پر کیا اثر پڑا؟ بظاہر یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی تھی۔ لیکن یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی نہیں تھی۔ اس سے اسلام ہی باقی نہیں رہا۔ اسلام ایک دین ہے (اور دین بھی دین اللہ) ملوکیت سے، یہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب نام ہے، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا جو (مذہب پرست طبقہ کے عقیدہ کے مطابق) پوجا پاٹ، گیان دھیان، بھگتی اور پرستش کی رُو سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے پہچاننے اور ماپنے کا کوئی خارجی اور مخصوص معیار نہیں۔ یہ خالص انفرادی احساس کا نام ہے۔ اس کے برعکس۔ دین اُس نظامِ حیات کا نام ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دین کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جس میں احکام و اصول و اقدارِ قرآنی کو قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا جا سکے۔ اس مملکت کو قرآنی اصطلاح میں "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے (۲۴/۵۵) جس کا مخفف "خلافت" ہے۔ قانون محض الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسے ایک مؤثر حقیقت اور زندہ نظام بنانے کے لئے قوتِ نافذہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قانون

دین و مذہب

کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کتاب کے ساتھ حدید (فولاد یعنی شمشیر) کو بھی منزل من اللہ کہا ہے۔ سورۂ حدید کی آیت ۲۵ بڑی معنی خیز ہے۔ فرمایا، لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ۔ "ہم نے رسولوں کو واضح دلائل و براہین کے ساتھ بھیجا" یعنی ہدایتِ خداوندی کے نافذ العمل کرنے کی پہلی منزل یہ ہے کہ اسے دلیل و برہان کی رُو سے پیش کیا جائے۔ جو لوگ علم و عقل اور غور و تدبر کے بعد اس کی صداقت کو تسلیم کر لیں۔ انہیں ضابطۂ قوانین کے تابع لایا جائے۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ۔ "اور ان رسولوں کے ساتھ ہم نے کتاب (ضابطۂ قوانین) بھی نازل کی۔" اس سے مقصد کیا تھا؟ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے معاملات کو از روئے عدل و انصاف طے کیا جائے۔ لیکن عدل کا قیام اسی صورت میں ممکن ہو گا جب اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی موجود ہو۔ اس کے لئے فرمایا: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔۔۔ (۵۷/۲۵) اور اس مقصد کے لئے ہم نے فولاد (شمشیر)

قرآن اور شمشیر

بھی نازل کی۔ اس میں سختی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت بھی۔ اس کی سختی سے ظالم کو ظلم سے روکا جاتا ہے اور مظلوم کی داد رسی ہوتی ہے۔

جو اس کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے۔

علّامہ اقبالؒ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اُمّتِ مسلمہ کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلائی کہ:۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور دین کے معنی ہیں ایسی آزاد مملکت جو قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کے لئے وجود میں لائی جائے۔ انہوں نے پاکستان کا تصوّر اور مطالبہ اسی مقصد کے لئے پیش کیا تھا۔

مملکت کے لئے دو بنیادی عناصر لاینفک ہیں۔ قوانین اور قوّتِ نافذہ۔ جہاں تک قوّت کا تعلّق ہے اقبالؒ نے اس سلسلہ میں ایسا پیغام دیا ہے جس میں اسلام کی پوری غرض و غایت سمٹ کر آجاتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن اور تلوار ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ تیغ کی اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن کے قوانین کو عملاً نافذ کیا جاسکے۔ اور قرآن کی اس لئے کہ وہ (تیغ) قوّت کو بے باک نہ ہونے دے۔ اسے حدودِ خداوندی کے اندر رکھ کر استعمال کیا جائے۔ ضربِ کلیم کی وہ مشہور نظم، جس کا عنوان ہی "قوّت اور دین" ہے، ان کے اس پیام کی مظہر ہے:۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سَو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ اُمم کا یہ پیام ازلی ہے — صاحب نظراں! نشۂ قوّت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک (ص ۲۳)

دوسرے مقام پر اس شمشیر کے متعلق، جو دین کی حفاظت کے لئے استعمال کی جائے۔ کہتے ہیں کہ:۔

اُس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں — پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار (ص ۲۱)

ان کے اس مشہور شعر:۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(بالِ جبریل ص ۶۲)

میں، سیاست سے مراد، اقتدارِ مملکت ہے اور دین سے مراد، حدودِ خداوندی یا اقدار و اصول۔

لیکن اس قسم کے اشعار کے علاوہ، انہوں نے قرآن اور تیغ کے باہمی رشتے کو جاوید نامہ میں (محترمہ خاتون)... شرف النساء کی زبان سے، جس حسین اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انہوں نے

لکھا ہے کہ شرف النساء قرآن پاک کی تلاوت کرتیں تو تلوار کو اپنی کمر کے ساتھ پیوست رکھتیں۔ یہ اس کا زندگی بھر کا شعار تھا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو:۔

برلبِ او چوں دمِ آخر رسید　　سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر　　سوئے این شمشیر و این قرآں نگر
این دو قوت حافظِ یک دیگر اند　　کائناتِ زندگی را محور اند!
وقتِ رخصت با تو دارم این سخن　　تیغ و قرآں را جدا از من مکن
مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است　　(جاوید نامہ صفحہ ۸۳-۱۸۲)

انہوں نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں، مومن حکمران کے متعلق کہا ہے کہ:۔

حکمرانے بود و سامانے نداشت　　دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت　(صفحہ ۸)

جاوید نامہ میں انہوں نے ملک مظفر کے قصہ کے ضمن میں کہا ہے کہ:۔

مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس　　چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟　(صفحہ ۲۴)

میں اسے دہرادوں کہ قرآن و شمشیر کے باہمی رشتہ کے متعلق یہ کہہ کر کہ "این دو قوت حافظِ یک دیگراند" اسلام کی جامع تفسیر بیان کر دی گئی ہے۔ اسلام اسی کا نام ہے! تلوار، قرآن کی حفاظت کرے اور قرآن، تلوار کی۔

اور اب ہم سورۂ حدید کی متعلقہ آیت (۵۷/۲۵) کے پہلے حصے کی طرف آتے ہیں۔ یعنی کتاب (ضابطہ قوانین)۔ علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو بہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ اس مملکت میں

قانون سازی

سب سے اہم سوال قانون سازی کا ہوگا۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ اس قدر مشکل ہو! جس اُمّت کے پاس خدا کی کتاب اپنی حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود ہو۔ اس کے لئے اپنی (اسلامی) مملکت میں قوانین مرتب کرنے میں کون سی دشواری پیش آسکتی ہے؟ لیکن جاننے والے جانتے ہیں اور پاکستان کی تیس سالہ تاریخ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ، اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا مسئلہ دشوار ترین بلکہ لاینحل ہے۔ یہ اس لئے کہ اُمّت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر فرقہ کا ضابطہ قوانینِ شریعت اپنا اپنا

اور الگ الگ ہے۔ اور کوئی فرقہ، اپنی فقہ کو چھوڑنا تو ایک طرف اس میں ذرا سے ردّ وبدل کے لئے بھی تیار نہیں۔
دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح اور مسلّم ہے کہ ایک مملکت اسی صورت میں مملکت بن سکتی اور قائم رہ سکتی ہے جب اس میں ایک ضابطۂ قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہو۔ سیکولر حکومتوں نے اس کا حل یہ تجویز اور اختیار کیا کہ مختلف فرقوں کو اس کی اجازت دے دی کہ وہ شخصی معاملات کے لئے اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور پبلک لاز (مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) حکومت مرتب کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کو کبھی اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ اوّل اس لئے کہ قرآن کی رو سے، پرسنل اور پبلک لاز میں کسی قسم کی تفریق اور تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ جسے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس لئے کہ پرائیویٹ سیکٹر ہو یا پبلک۔ اسلامی حکومت اس کی مجاز نہیں کہ وہ بلا حدود و قیود (عام اصطلاح میں، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) قوانین مرتب کر سکے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین مرتب کر سکتی ہے۔
علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس اہم ترین (اور بظاہر مشکل ترین مسئلہ) کا حل یہ بتایا کہ اسلامی مملکت میں قوانین کی بنیاد خدا کی کتاب، قرآن مجید قرار پاتی ہے۔ جو قوانین اس بنیاد پر مرتب ہوں گے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ ان میں نہ پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ہوگی، نہ فرقوں کی تخصیص۔ ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اس سوال پر، تصورِ پاکستان پیش کرنے کے بعد ہی غور نہیں فرمایا۔ یہ بہت پہلے سے ان کی فکر وتدبر کا مرکز تھا۔ (مثلاً) امرتسر میں اہلِ قرآن کی ایک جماعت تھی جس کے سربراہ، خواجہ احمد دین (مرحوم) تھے۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے کہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) حضرت علامہ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ قرآنی قوانین مرتب کرنے کے سلسلہ میں خواجہ صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیالات مفید ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں علامہؒ نے صوفی صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، جو (تمہید حذف کرنے کے بعد) درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرمایا:-

"مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں۔ جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ "معاملات" کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدّت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت

کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پہ ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے، اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کر فقۂ اسلامی پہ بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ کر دیا ہے اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے لئے باعثِ برکت ہوگا۔ بایں عبارت بغرض کہ مولوی صاحب موصوف یا ان کے رفقا کو جو اسلامی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پہ عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ میں اور مجھ جیسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت صاحب کے رسالہ۔۔ "اشاعت القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پہ بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پہ ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، ان پہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پہ عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" پہ ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پہ غور و فکر کر رہے ہیں۔ (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت

امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

(اقبالؒ نامہ۔ حصہ اول۔ صـ۵۱-۴۸)

اس خط میں، علاوہ دیگر امور، یہ الفاظ کہ "جس میں صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو"۔ حضرت علامہؒ کے مرکزی فکر کی بین شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ قرآنِ خالص کو قانون سازی کی اساس قرار دیتے تھے۔ محترم محمد حسین عرشیؔ صاحب نے علامہ سے اپنی ایک ملاقات کے سلسلہ میں کہا ہے:-

میں نے پوچھا: اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا مفصّل کہو۔" میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرہ، احادیث و روایات اور کتبِ فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمّل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خدائے تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں صـ۱ (ملفوظات۔ مرتبہ محمود نظامی۔ صـ۴۶-۴۵)

اسی طرح ایک اور نشست میں، گفتگو کے سلسلہ میں (عرشیؔ صاحب نے) فرمایا ہے کہ ایک صاحب نے آمدِ حضرت مسیحؑ کے ضمن میں حضرت علامہ سے کہا کہ آپ لکھ دیجئے کہ آپ حدیث شریف کے مطابق مسیحؑ کی آمدِ ثانی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا "میرا یہ اعتقاد نہیں ہے" انہوں نے کہا۔ "کیا آپ کو حدیث کی صحت سے انکار ہے۔"؟

آپ نے فرمایا۔" میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ یہ کن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے۔" (ملفوظات صـ۵۲-۵۱)

اسی طرح انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ" مجھے اس سے انکار ہے کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے۔" (اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ صـ۱۳۵)

صـ۱: واضح رہے کہ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

اس قسم کی تصریحات، حضرت علامہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں جستہ جستہ مقامات پر بکثرت ملتی ہیں لیکن انہوں نے قانون سازی کے موضوع پر، خطبات تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ چونکہ یہ موضوع بڑا اہم اور بنیادی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ بحث بکمال وتمام آپ حضرات کے سامنے آجائے۔ بنابریں، میں اس خطبہ کے متعلقہ مقامات تفصیلاً پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآن کریم نے انسانی زندگی سے متعلق اصول واقدار عطا کئے ہیں اور اسے اُمتِ مسلمہ پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی جزئیات اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، باہمی مشاورت سے خود مرتب کرے۔ حضرت علامہؒ اس باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے، تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے۔ یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصول حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔"

ثبات و تغیر کا امتزاج

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلۂ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد

کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"سُنی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن آئمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو، جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے۔ اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو بجبر منجمد بنا کر رکھ دیا۔"

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں :-

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

"آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے۔ اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہائے نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے اور تاریخِ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم
ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ
قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں

حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہبِ (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب ہے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام اُن تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں۔۔۔ آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات، ایک ترقی پذیر عملِ ارتقا ہے۔ اس کی مُقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔"

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:۔

"قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنّف نے لکھا کہ:۔

> تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی
> توانائی کھوکر فرسودہ ہوچکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر
> سے توانائی حاصل نہیں کرسکتے جنھوں نے انہیں فرسودہ
> بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا رُجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلّب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا"

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افتراء ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصوّر نے ایک خاص معیّن شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اسقدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکّرین کو انسان سمجھنے کے بجائے، معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متأخرین میں سے بھی بعض نے اس "افترا" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسی رح (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:-

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکّرین و مصنّفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے مقابلہ میں متأخرین کے راستے میں بہت دشواریاں ہیں تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدّمین کے مقابلہ میں متأخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنّت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدّمین کے پاس نہیں تھا)۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبال رح کے نزدیک، مروّجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیّر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں ازبس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ:-

"بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔"

لیکن انہوں نے کہا کہ:-

"بااین ہمہ، میں مسئلہ زیر نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا یسب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرن اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سواء کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔"

علامہ اقبالؒ کی یہی جسارت تھی جس کی وجہ سے وہ ارباب دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں :-

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی　　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاؑ حضرات کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن جب بات اُن ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جائے تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے۔ بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداءِ فیض کی یہ انتہائی گرم گستری تھی کہ اس نے علامہؒ اقبال کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں :-

احادیث کی قانونی حیثیت

"احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آجکل یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ ﷺ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ اُن کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرمادیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور

رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں پیغمبرؐ کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اُن اصولوں پر زور دیتا ہے۔ جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسولؐ کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتّب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، مَیں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنّن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل

کے ہم آہنگ ہو گا۔ جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقنّنین میں ہوتا ہے"۔

احادیث کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضورؐ نبی اکرم کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدّل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقہ بذریعہ وحی متعیّن نہیں ہوتے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ :۔

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) "ان کا تعیّن اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو"۔

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدّل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعت مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ :۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں"۔

یہ طریقِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدّل رکھے جائیں گے۔ یہ تصوّر خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔ احادیث رسول اللہؐ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدّل قرار دینے کا تصوّر امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا۔ اس مسلک پر امام ابو حنیفہؒ نے کڑی تنقید کی۔ اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رُو سے اُس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"انہوں نے اپنے آپ کو ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اِن سے اُن کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے ایک خاص دَور کے ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدّل سمجھ لیا اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذونادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک رنگ میں) بڑی مفید

ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی واقعاتی نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ و تشریح کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں:۔

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابو حنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابو حنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔"

ان تصریحات سے ——— یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنی احکام و اصول حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے۔ ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہو گی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ

"وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے کہ

روحِ عمری

جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ،

حسبنا کتاب اللہ

"ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے"۔

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :-

"اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بناء پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے رستے نئے آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی"۔

یہ ۱۹۲۸ء کی بات تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، فرمایا :-

"تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری۔ مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان کی اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگے"۔ (بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر بابت جنوری - فروری ۱۹۷۸ء)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد حضرت علامہؒ ہم میں موجود ہوتے تو وہ انہی اصولوں کے مطابق مملکتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے لئے آئین و ضوابط مرتب کر دیتے یا کرا دیتے اور وہ ضابطہ پھر مسلمانوں کی ہر اس مملکت کے لئے جو حقیقی معنوں میں "اسلامی" بننا چاہتی، خضرِ راہ ثابت ہوتا۔ اس طرح یہ اُمت ان جکڑ بندیوں سے، آزادی حاصل کر لیتی جن میں یہ صدیوں سے محبوس چلی آ رہی ہے۔

اب میں ایک اعتراض کی طرف آرہا ہوں۔ ظاہر ہے علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصوّر اس لئے دیا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جسے قرآنی نظام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ جب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام برگ و بار لائے گا تو اس کے قابلِ صدر شک و موجبِ ہزار افتخار نتائج کو دیکھ کر مسلمانوں کی دیگر مملکتیں بھی اس نظام کو اپنے ہاں رائج

کیا یہ ممکن العمل بھی ہے؟

کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی اور اس کے بعد اس کا بھی امکان ہے کہ اس نظام کے انسانیت ساز اثمار کو دیکھ کر غیر مسلم ممالک بھی اس کی طرف چلے آئیں۔ یہ تھی علامہ اقبالؒ کی آرزو اور مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ۔ لیکن اس تیس سال کے عرصہ میں، نہ تو پاکستان میں قرآنی نظام رائج ہوا اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی اور مملکت نے اس کی طرف توجہ کی۔ اس سے معترضین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت علامہ کی یہ آرزو محض شاعرانہ تخیل پر مبنی تھی۔ قرآن میں کسی زمانہ میں تو اس کی صلاحیت تھی کہ اس کی بنیادوں پر ایک قابلِ عمل نظامِ حکومت وجود میں آیا۔ لیکن اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ میں نے اس قسم کے اعتراضات کا تفصیلی جواب اپنے اس خطاب میں دیا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے"؟۔ اس مقام پر میں صرف حضرتِ علامہؒ کی تصریحات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن، سلسلۂ رشد و ہدایتِ خداوندی کی آخری کڑی ہے جس میں تمام نوعِ انسان کے لئے ابدی حقائق محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ "تمام نوعِ انسان کے لئے" اور "ابدی طور پر" کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی راہ نمائی نہ کسی خاص قوم کے لئے مختص ہے اور نہ ہی کسی خاص زمانے تک محدود۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳۸/۸۷) کہا ہے۔ یعنی تمام اقوام کے لئے ضابطۂ حیات۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ" اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ (۱۴/۲۴-۲۵) اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق۔ ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا جائے۔ حضرتِ علامہؒ کے الفاظ میں :-

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند   بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ   (ضربِ کلیم)

اس لئے قرآن کی یہ صورت نہیں کہ کوئی خاص قوم اس پر عمل پیرا نہ ہو یا اسے ترک کر دے تو یہ اپنے نتائج پیدا

کرنا چھوڑ دے۔ اگر دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہ رہے جو پانی کی دیگچی کو آگ پر رکھے تو اس سے پانی اپنی اس خاصیت کو کھو نہیں دے گا کہ وہ ایک خاص درجۂ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص اسے آگ پر رکھے گا اس کی مضمر خاصیت مشہود ہو جائے گی۔ قرآنِ مجید ایک عالمگیر ضابطۂ حیات ہے۔ دنیا کی جو قوم جس زمانے میں بھی اسے اپنا ضابطۂ زندگی قرار دے گی اس کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے قرآنی نظام کے قیام کے لئے ہندی مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں اپنی ملت سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ اس شجرِ طیب کے حیات آور پھل سب سے پہلے اس کی جھولی میں گریں۔ مسلمانوں سے ان کی عمر بھر یہی تاکید رہی کہ ہر چند یہ اُمت نکبت و زبوں حالی کا شکار ہے، اس میں بظاہر زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا، اس میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہیں رہی، اس کے باوجود، اس کے ساتھ پیوست رہنا ضروری ہے۔ بانگِ درا کی وہ نظم بڑی مشہور ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:-

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور — خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ (بانگِ درا صفحہ ۲۸۰)

دوسری جگہ بڑی دلسوزی کے ساتھ کہتے ہیں کہ:-

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ او پر برآوردی — چوں برگش ریخت ازوے آشیاں برداشتن ننگ است

اس زوال پذیر اُمت کے ساتھ ان کی یہ محبت تھی جس کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ قرآنی نظام کی نشاۃِ ثانیہ کی آماجگاہ اسی قوم کا صحن ہو لیکن اس کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی یہ تنذیر بھی ان کے سامنے تھی۔ جس میں کہا گیا کہ: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) "اگر تم نے اس قرآن سے اعراض برتا تو خدا تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی" وہ، اپنی قوم کے لئے

دل کے نازک ترین گوشوں میں انتہائی جذباتِ محبت اور دوسری طرف خدا کے اس اٹل قانونِ استبدالِ قومی کو جس انداز سے یک جا پیش کرتے ہیں اس کی مثال کم ملے گی۔ میں اسے بادیدۂ پُرنم پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے گوشِ نصیحت نیوش کے ساتھ سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔ ؎

محفلِ ما، بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است احتیاجِ روم و شام او را کجا است
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند (جاوید نامہ صـ۹۲-۹۱)

عزیزانِ من! میں اس موضوع پر بہت کچھ اور بھی کہہ سکتا تھا لیکن قلتِ وقت کی بنا پر اتنے ہی پہ اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کلام و پیامِ اقبالؒ کا مرکز بھی قرآن ہے اور محور بھی قرآن۔ اس کی تعلیم کا عام کرنا ان کی زندگی کا مشن اور ان کا نصب العین حیات تھا اور اس کو ایک عملی نظام کی شکل میں

پیامِ اقبالؒ

متشکل کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ بلا شائبۂ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں قرآنی پیغام اور حقائق کو حسن کارانہ انداز سے اس جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ:۔ ؎

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

اس لئے کہ:۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
با مسلماناں غمے بخشیدہ ام کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام
عشقِ من از زندگی دارد سراغ عقل از صہبائے من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت؟ با مسلماں حرفِ پُرسوزے کہ گفت؟

ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت | تا مقامِ خویش بر من فاش گشت
حرفِ شوق آموختم و اسوختم | آتشِ افسردہ باز افروختم
با من آہِ صبح گاہے دادہ اند | سطوتِ کوہے، بکاہے دادہ اند
دارم اندر سینہ نورِ لا اِلٰہ | در شرابِ من سرورِ لا اِلٰہ
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست | جوئے، ساحل ناپذیر از فیضِ اوست
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام

(مسافر صہ۴۴-۴۳)

انہیں خود اس کا احساس تھا کہ انہوں نے کس قدر پیامِ حیات بخش قوم کو دیا ہے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ ——— اے خنک مردے کہ در عصرِ من است ——— (مسافر صہ۴۳) ——— اس کے بعد سوچئے کہ ہماری شوریدہ بختی کس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ ہم نے اس نوائے حیات آور کی بھی کوئی قدر نہ کی اور اسے قوالوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ڈھولک کی تھاپ پر گائیں اور اس خوابیدہ قوم پر سکوتِ مرگ طاری کر دیں۔

"ڈھولک والوں" سے آگے بڑھ کر ہم، (نام نہاد) دانشوروں کے کوچے میں آتے ہیں تو وہاں ہمیں اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حضرات کی بارگاہ سے حضرت علامہؒ کو جو سب سے بڑا خطاب عطا ہوا وہ شاعرِ مشرق کا تھا۔ اس خطاب کا اس شدّ و مد سے چرچا کیا گیا کہ وہ اب ساری دنیا میں اسی حیثیت سے متعارف ہیں۔ آپ ذرا سوچئے کہ اگر کوئی مفکر اپنی حاصلِ فکر کا اظہار نثر میں کرے تو ہم اسے نثر نگاروں کی صف میں نہیں کھڑا کر سکتے۔ اسے مفکر ہی کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہی مفکر، اپنی فکر کو زبانِ شعر میں پیش کرتا ہے تو ہم اسے مفکر نہیں کہتے شاعر کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اسی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔ وہ عمر بھر کانوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر پکارتے (بلکہ چلاتے) رہے کہ بابا! میں شاعر نہیں۔ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن ان کے

میں شاعر نہیں

ستائش گر انہیں جھٹلاتے چلے جاتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ تمہیں کچھ علم نہیں۔ تم شاعر ہو۔ اور بہت بڑے شاعر۔ علامہؒ نے اپنے پہلے مجموعۂ نظم (پیامِ مشرق) کے ابتدائیہ میں کہا تھا کہ :-

آشنائے من ز من بیگانہ رفت | از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم | تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

او حدیثِ دلبری خواہد زمن — رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن

کم نظر بے تابیٔ جانم ندید

آشکارم دید و پنہانم نہ دید — (پیامِ مشرق ص۳)

اقبالؒ کے نام لیوا، بالعموم اس کے "آشکار" کے گرد دیدہ رہے۔ اس کے "پنہاں" تک کسی کی نگاہ نہ گئی۔ جن کی نگاہ اس کے "پنہاں" تک پہنچی تھی انہوں نے برملا کہا تھا کہ:-

پردہ تواز نوائے شاعری است — آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

(غنی کاشمیری۔ در۔ جاوید نامہ ص۱۹۵)

حضرت علامہؒ نے خود، سیّد سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا:-

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی —— ہاں —— بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے"۔ (مکتوبات۔ حصہ اوّل۔ ص۱۹۵)

دیکھئے! وہ انہیں شاعر سمجھنے اور کہنے والوں کو کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ زبورِ عجم میں ہے ؎

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم — مثالِ شاعراں افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست — کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست (ص۲۰۴)

اور جب یہ حضرات اس پر بھی باز نہیں آتے، تو وہ اس بارگاہ میں فریاد لے کر پہنچتے ہیں جس سے بلند بارگاہ ان کے نزدیک کوئی نہیں۔ دیکھئے وہ کس درد و سوز سے فریاد کرتے ہیں کہ ؎

بآں رازے کہ گفتم، پے نبردند — ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند

من اے میرِ اُمم! داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند (ارمغانِ حجاز ص۵۷)

اور اس کے بعد کہتے ہیں: ؎

نہ شعر است اینکہ بروے دل نہادم — گرہ از رشتۂ معنی کشادم

بامیدے کہ اکسیرے زند عشق — مسِ ایں مفلساں را تاب دادم

(ص۵۸)

اور پھر یہ فریاد کہ : ـــ

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوے ــــ بگوشِ مُردہ پیغامِ جاں گوے

ولے گویند ایں حق ناشناساں ــــ کہ تاریخِ وفاتِ ایں واں گوے (ص ۵۸)

وہ گفتۂ اقبالؒ کے متعلق کہتے ہیں کہ : ـــ

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است ــــ ایں کتاب از آسمانے دیگر است (جاوید نامہ ص ۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا وہ " از جہانِ دیگر " تھا۔ شاعری نہیں تھا۔ لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انہوں نے شاعری کو بطور ذریعۂ ابلاغ اختیار کیا (خواہ اس کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ تھا) اس سے ان کا پیغام وہ نتائج مرتب نہ کر سکا جو ان کا مدعا تھا۔ اس کے برعکس قوم نے اس کا غلط استعمال بھی کیا اور الٹا اثر بھی لیا۔ یہ اس لئے کہ آپ لاکھ کوشش کیجئے، شاعری "ڈھولک" سے الگ نہیں رہ سکتی اور ان دونوں کا آمیزہ اور عصارہ، افیون بن جاتا ہے۔ یہ وہ آمیزہ ہے جس کے متعلق خود علامہ نے (ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ : ـــ

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی ــــ ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام (ارمغانِ حجاز ص ۲۱۶)

اس کے باوجود، پیغامِ اقبالؒ کو اگر اس کی فکر کے سرچشمہ، قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جاتا تو اس سے ہماری قوم حیاتِ تازہ سے ہمکنار ہو سکتی تھی لیکن قوم نے ایسا نہ کیا اور اس پر سکوتِ مرگ طاری رہا۔ اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر قوم نے ایسا نہیں کیا تو یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی یہ ایک گہری سازش کا نتیجہ تھا جس کا تانا بانا کہیں اور بُنا گیا تھا۔ (جیسا کہ حضرت علامہؒ نے اپنی مشہور نظم " ابلیس کی مجلس شوریٰ " میں کہا ہے) جہانِ ابلیس یعنی مغرب کی استعماری قوتیں خوب سمجھتی تھیں کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو گیا تو وہ ان کے لیے پیغامِ موت ہوگا۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں۔ پاکستان ان قوتوں کو اس نظام کی اولیں آماجگاہ بنتا نظر آتا تھا کیونکہ یہی علامہ اقبالؒ کے پیغام کا اولین مخاطب تھا۔ اور تجربہ گاہ تھا چنانچہ ان قوتوں نے اپنی انتہائی لطیف فریب کاری سے کام لیتے ہوئے ایسا انتظام کیا کہ یہاں قرآن کا نام تو بے شک لیا جائے لیکن اس کا پیغام، عام نہ ہونے پائے اور چونکہ اقبالؒ بھی قرآن کا پیامبر تھا اس لئے یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ اقبالؒ کو بھی اس کا صحیح مقام نہ مل سکے۔ ان کی یہ سازش بڑی کامیاب رہی ہے۔ اقبالؒ یہاں محض ایک شاعر بن کر رہ گیا ہے۔

قرآنی آواز طلوعِ اسلام کے مرکز سے اٹھتی تھی۔ اس کے خلاف اس قسم کا منظم پراپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ وہ الحاد اور بے دینی کے مرادف قرار پا گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں اور قرآن کے پیغام اور اس کی روشنی میں، فکرِ اقبالؒ کو عام کئے جا رہا ہوں۔ میں محض اپنے قیاس کی بناء پر فیصلہ کیوں کر لوں کہ قوم اب زندہ ہو ہی نہیں سکتی اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاؤں۔ یہ بھی تو قرآن کی روشنی میں، اقبالؒ ہی نے کہا تھا کہ:-

مرگ را سامان ز قطعِ آرزو است — زندگانی محکم از لاتقنطوا است

تا امید از آرزوئے پیہم است — ناامیدی زندگانی را سم است

زندگی را یاس خواب آور بود — ایں دلیلِ سستیٔ عنصر بود

از دمش میرد قوائے زندگی — خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

(اسرار و رموز ص ۱۰۸)

قرآن کی یہی نشید جانفزا ہے جو اس طول طویل سفرِ زندگی میں مجھے تھکنے نہیں دیتی اور قدم قدم پہ یہ کہہ کر میرا حوصلہ جوان کر دیتی ہے کہ:-

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

والسلام

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مئی ۱۹۷۹ء

روٹی کا مسئلہ

(اقبالؒ کی نظر میں)

ہمارے نزدیک اقبالؒ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اقبالؒ نے قوم کو پھر سے قرآن سے آشنا کرانے میں مسلسل جدوجہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکتِ پاکستان، جس کا اس نے تصور دیا تھا، بھی ایک گراں بہا نعمت ہے۔ لیکن اقبالؒ کے الفاظ میں، مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العینی اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی۔ یہ آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں رُوبہ عمل لانے کی یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبالؒ نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انہیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کر لی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دَور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دَور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہے، وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دَور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبالؒ جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا، اپنے دَور کے لیے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور قرآن نے اس باب میں جو راہنمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبالؒ کا پہلا دَور ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا

ہے۔ دوسرا دور اُس حل پہ غور و فکر کرنے اور اُسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقلِ انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس دورِ اوّل کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب ان کی نثر میں سب سے پہلی کتاب "علم الاقتصاد" کے عنوان سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا تھا:۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پہ پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی، قوائے انسانی پہ بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی رُوح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اوّل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پہ زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پہ نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔"

یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں خضر سے پوچھتے ہیں:۔

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟ اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اس کے جواب میں خضر کہتا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے!

اس کے بعد پیامِ مشرق میں دیکھیے۔ وہ "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں۔

ٹالسٹائی کہتا ہے ؎

بار کشِ اہرمن لشکریِ شہریار — از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
دارو ئے بیہوشی است تاج، کلیسا، وطن — جانِ خداداد را خواجہ بجامے خرید

کارل مارکس کہتا ہے ؎

راز دانِ جزو و کل از خویش نامحرم شدست — آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شدست

ہیگل اپنا فلسفۂ اضداد پیش کرتا ہے، اور ٹالسٹائی اسے "عقلِ دو رُو" کی چابک دستی قرار دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔

مزدک اعلان کرتا ہے کہ ؎

دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز — نعمتِ گم کردۂ خود را ز خسرو باز گیر

فرانسیسی فلاسفر کومٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ

نباید ز محمود کارِ ایاز

اور مزدور ایک پُرمعنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ ؎

حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پرکار نابردہ رنج

آخر میں "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے کرتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ ؎

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو

نخلے کہ شہ خراج بر و می نہد ز من | باغ بہشت و سدرۂ و طوبیٰ از آن تو
ایں خاک دا آنچہ در شکم اوا ز آن من | د ز خاک تا بہ عرش معلیٰ از آن تو

اور اس کے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ ؎

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگ ساز | مے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم | بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم | بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم

یہی دعوتِ انقلاب ہے جسے ہم "زبورِ عجم" میں اس سے تیز انداز میں دیکھتے ہیں، جہاں اقبالؒ کہتا ہے کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب | از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام | آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب

بالِ جبریل میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظامِ سرمایہ داری کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں کہا گیا ہے:۔

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر | تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست | بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی | اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی کتاب میں لینن کی وہ مشہور درخواست بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں | ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ　　　　دُنیا ہے تیری منتظرِ یومِ مکافات

یہ ہیں نظامِ سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج، جنہیں اقبالؒ کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلبِ حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اُوپر اُبھرے۔ یہی وہ اشعار ہیں جنہیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبالؒ بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اقبالؒ کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لے لے جبکہ غریب اور اس کے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے۔ اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے جو قرآن سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبالؒ بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر وہ اس دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر جس کی رُو سے، خدا۔ وحی۔ رسالت۔ آخرت سب کا انکار ہوتا ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبالؒ مسلمان تھا اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔

۱۹۲۳ء کا ذکر ہے، شمس الدین حسن نامی ایک صاحب نے (جو کمیونزم کے پُرجوش حامی تھے) اخبار زمیندار (مورخہ ۲۳، جون) میں ایک مضمون میں لکھا:-

"بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبالؒ قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالشوزم، کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لُبِّ لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کی نظم - خضرِ راہ - اور ان کے مجموعۂ کلام، پیامِ مشرق، کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں۔"

اس کے جواب میں حضرت علامہؒ کا، ۲۴، جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں، خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ :-

(۱) میرے انکار کو بالشوزم منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل

قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۳) روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل ہے لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔ [۱]

اس کے بعد انہوں نے ۱۹۳۶ء میں، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا۔

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادّی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا ۔ ۔ ۔ ۔ جو روحانیت میرے نزدیک معتقب ہے، یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔" (اقبالؒ نامہ۔ حصہ اوّل صفحہ ۳۱۸)

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تجلّی اور "مسیح" قرار دیتا ہے۔ لیکن بے صلیب حتیٰ کہ وہ جاوید نامہ میں افغانیؒ کی زبان سے یہ کہلاتا ہے۔ ؎

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ اُو مضمر است — قلبِ اُو مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خالص مادّی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت مُردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اشتراکیت ہو، یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔ ؎

---

[۱] بحوالہ ہفتہ وار چٹان لاہور۔ بابت ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ء

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب

زندگی ایں را خروج آں را خراج — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

عرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن

در گِلے تخمِ دلے انداختن

یہی "سوختن باساختن" ہے جسے اقبال لَا اور اِلَّا سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لَا کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی اِلَّا (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کشمکش کے بارے میں کہتا ہے:-

روس را قلب و جگر گردید خون — از ضمیرش حرفِ لَا آمد برون

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ ! — لَا سلاطین لَا کلیسا لَا اِلٰہ

فکرِ او در تندبادِ لَا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دائرہ شروع ہوتا ہے، جہاں اقبالؒ اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل پیش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ:-

نکتہ می گویم از مردانِ حال — اُمتاں را لَا جلال اِلَّا جمال

لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات — لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لَا زاید از اِلَّا سکون

در مقامِ لَا نیاساید حیات — سوئے اِلَّا می خرامد کائنات

لَا و اِلَّا ساز و برگِ اُمتاں — نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں

لَا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور اِلَّا کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام قائم کرنا۔ یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے، اور مستقل اقدار عقل کی رو سے کبھی نہیں مل سکتیں یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اس لئے کہ:-

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر

وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی لئے اقبالؒ نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی　　　　دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردہ کارِ خداوندان تمام　　　　بگذر از لا جانبِ الّا خرام
در گذر از لا اگر جوئندۂ　　　　تا رہِ اثبات گیری زندۂ
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے　　　　جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اقبالؒ کے نزدیک نظامِ عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　　　فکر را روشن کن از امّ الکتاب[۱]

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو　　　　لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ　　　　ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبالؒ کو تخریبی قوت یا تخریبی پروگرام کی ناکامی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ :-

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں　　　　خویش را زیں تُند باد آرد بروں

چنانچہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں جو انہوں نے سر فرانسس ینگ ہز بنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا (اور جو ۳۱ جولائی کے 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں :-

"ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لامذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں، اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ

---

[۱] اس نے ایسا نہ کیا اور اس کا نظام ناکام رہ گیا۔ یہی شکل چین میں رونما ہو رہی ہے۔

باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا پر ایمان اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا، اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو ہضم کر لے یا اسلام روس کو۔

لیکن اقبالؒ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اُٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنے ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اس وقت زمانہ کے تقاضوں سے جو معاشی کشمکش پیدا ہو رہی ہے تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ اس سے قرآن تمہیں ایسی راہنمائی دے گا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوامِ عالم کی قیادت تمہارے حصہ میں آ جائے گی۔ چنانچہ وہ "ضربِ کلیم" میں کہتے ہیں کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ۔۔۔ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور ۔۔۔ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ۔۔۔ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ۔۔۔ اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرف "قُلِ العفو" میں پوشیدہ ہے ابتک ۔۔۔ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبالؒ نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن کریم پہ غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ قرآن کی رُو سے رزق کے فطری سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدائے رب العزت نے سامانِ رزق کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے چشمے زمین سے پھوٹتے ہیں اس لئے زمین کے متعلق اقبالؒ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ؎

حق زمین را جز متاعِ ما نگفت ۔۔۔ ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر ۔۔۔ رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

رزقِ خود را از زمین بردن رواست
ایں "متاع" بندہ و ملک خداست
باطنِ "الارض للہ" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

بالِ جبریل، میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جہاں لکھا ہے ــــ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

علامہ اقبالؒ، پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس نظام کو رائج کیا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا کہ:-

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔۔۔ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔

۔۔۔۔ شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔۔۔۔ اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو، حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔۔۔۔ ان مسائل کے

حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔"

یعنی اقبالؒ کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت اس لئے تھی کہ یہاں قرآن کے معاشی نظام کا نفاذ کیا جا سکے جیسا کہ خود اقبالؒ کو اندیشہ تھا لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا، جس کا خمیازہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔

طلوعِ اسلام، قرآن کی اس انقلابی دعوت کو جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا تھا، آگے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ مفاد پرستانہ مذہبیت کی طرف سے قرآن کی اس آواز کو دبانے کے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے، اس سے کون واقف نہیں۔

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مئی ۱۹۷۹ء

قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ پاکستان میں، اسلامی قانون کی تدوین کے مسئلہ میں دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام کی کوششوں کو سراہا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر ہم اکثر و بیشتر علامہ اقبالؒ کے ایک خطبہ کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ علامہ کے ان خیالات کی اہمیت کے پیش نظر اکثر قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہوئے ہیں کہ ان کا یہ خطبہ پورے کا پورا یکجا کر دیا جائے تاکہ علامہؒ کے خیالات مربوط شکل میں سامنے آجائیں۔ علامہ اقبالؒ کے خطبات کے مجموعہ کا نام ہے:۔

(THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

ان میں چھٹا خطبہ اسلام میں قانون سازی کے اصول سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان ہے:۔

(THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM)

اس کا رواں ترجمہ، "قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء" کے عنوان سے کوئی بیس برس پہلے طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ جن حضرات نے علامہ اقبالؒ کے ان خطبات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی زبان کس قدر فلسفیانہ، ادق اور ایجاز و اختصار کی حامل ہے۔ ایسے مضامین کے ترجمہ میں جو دشواریاں پیش آسکتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ ہم نے یہ رواں ترجمہ ایسے انداز میں کیا ہے جس سے بات بآسانی سمجھ میں آجائے اس کے لئے بعض مشکل مقامات کی وضاحت قوسین اور بعض کی حواشی میں کی گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اس خطبہ کو سرسری نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کے ایک ایک فقرہ کو غور سے پڑھا جائے اس طرح آپ کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ قوانین شریعت کی تدوین و تجدید کے متعلق علامہؒ کا نقطۂ نظر کیا تھا۔ اس کے ساتھ، اس بات کو بھی مدنظر رکھئے کہ یہ خطبات آج سے قریب پچاس سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر علامہ آج زندہ ہوتے تو بعض ایسے مقامات جن میں کچھ ابہام سا محسوس ہوتا ہے، زیادہ واضح ہو جاتے۔ اور پاکستان کے موجودہ حالات کی روشنی میں، وہ اپنے خیالات کے مطابق، ایک جامع قانونِ شریعت مرتب کر دیتے۔ بایں ہمہ، علامہؒ کے خیالات اس باب میں ایسے

واضح ہیں کہ ان کی روشنی میں، قرآنِ کریم کی بنیادوں پر منضابطہ قوانین مرتّب کرنا مشکل نہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے نزدیک، دین میں سند خدا کی کتاب ہے۔ ہم اگر کسی باب میں کسی انسان کا قول پیش کرتے ہیں تو وہ محض تائیداً ہوتا ہے۔ علّامہ اقبالؒ کے اس خطبہ کو بھی ہم اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ جزئیات سے قطع نظر، اس میں اصولی طور پر جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں۔

علّامہ اقبالؒ کا خطبہ

ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے، اسلام نے کائنات کے متعلق قدیم سکونی تصوّر کو ردّ کر کے اس کی جگہ حرکیاتی تصوّر اختیار کیا ہے۔ دوسری طرف، ایک جذباتی نظامِ وحدت کی حیثیت سے وہ فرد کی قدر و منزلت کا پورا پورا اعتراف کرتا ہے اور نوعِ انسانی کی وحدت کی بنیاد خون کے رشتوں پر نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ خون کے رشتے کو انسانی وحدت کی بنیاد قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم مادّی علائق کی زمین گیری سے بلند نہیں ہونا چاہتے۔ وحدتِ انسانی کے لئے (مادّی علائق سے بلند ہو کر) ایک نفسیاتی بنیاد کی تلاش و جستجو اسی صورت میں ممکن ہے جب ہمیں اس کا احساس ہو جائے کہ زندگی کی اصل و بنیاد (مادّی نہیں بلکہ) روحانی[1] ہے۔ اس احساس و تصوّر سے انسانی وفاشعاری و اطاعت پذیری کے نئے مراکز سامنے آتے ہیں جنہیں زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے مادّی قسم کی رسوم پرستی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی وہ احساس و تصوّر ہے جس سے انسان کے لئے مادّی زمین گیری سے رستگاری[2] ممکن ہے۔ شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو، جو ابتداءً ایک خانقاہی نظام کی حیثیت سے منصّۂ شہود پر آئی تھی، وحدتِ انسانی کی بنیاد قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ عیسائیت کی یہی وہ

---

[1]: اس خطبہ میں متعدد مقامات پر روحانی (SPIRITUAL) کا لفظ آئے گا۔ ان مقامات میں SPIRIT کا لفظ مادہ (MATTER) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ خانقاہی روحانیت کے معنوں میں نہیں۔

[2]: مادّہ سے رستگاری سے مراد یہ نہیں کہ مادّی کائنات ایک جیل خانہ ہے جس سے نجات حاصل کرنا مقصودِ زندگی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے سامنے صرف طبیعیاتی زندگی کو نہ رکھے بلکہ انسانی زندگی کو رکھے جو مادّی علائق سے بلند ہو کر (حیاتِ اُخروی کی شکل میں) آگے چلتی ہے۔

ناکامی تھی جس سے مجبور ہو کر شاہنشاہ جولین کو پھر سے قدیم رومی اصنامیات کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس نے اسے فلسفیانہ تعبیرات کا لبادہ اوڑھا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کا ظہور ہوا ہے۔ اس زمانے میں مہذب دنیا کی حالت کیا ہو چکی تھی، اس کا نقشہ ایک مغربی مؤرخ تہذیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی حالت

"اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جو چار ہزار سال میں جا کر تعمیر ہوا تھا، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے اندازِ کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین و دساتیر کو رائج کیا تھا، وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور ہلاکت و بربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وہ وقت آ چکا تھا۔ جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے زریں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھیں۔ اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلۂ حرب و ضرب کے طوفانوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے، اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔"

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کے تہذیب و تمدن کا یہ نقشہ کھینچنے کے بعد یہ مؤرخ سوال اٹھاتا ہے کہ :-

"کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیے تھے۔ اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین و ضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔"

اس کے بعد یہ مؤرخ لکھتا ہے کہ اس وقت دنیا کو ایک ایسے کلچر کی ضرورت تھی جو "تخت و تاج کے کلچر" اور وحدتِ انسانی کے ان تمام نظام ہائے کہن کی جگہ لے لیتا جن کا مدار خون کے رشتوں پر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ امر موجبِ حیرت

استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمینِ عرب سے پیدا ہوا۔ اور عین اس وقت پیدا ہوا جب دنیا کو اس کی اشد ضرورت تھی۔

لیکن اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں۔ حیاتِ کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کا احساس کرلیتی ہے اور نازک ساعتوں میں وہ اپنا رُخ آپ متعیّن کرلیتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے مذہب کی زبان میں وحیٔ نبوّت کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اسلام کا خورشیدِ جہانتاب، ایک ایسی سادہ قوم کے اُفقِ شعور سے طلوع ہوتا جسے کسی قدیم ثقافت کی ہوا تک نہ لگی تھی اور جو ایک ایسی سرزمین میں بستی تھی جہاں تین بڑے بڑے براعظم بغلگیر ہوتے تھے۔ اس جدید ثقافت نے دنیا کو بتایا کہ وحدتِ انسانیّت کی بنیاد صرف اصولِ "توحید" پر رکھی جاسکتی ہے۔ نظامِ سیاست کی حیثیت سے اسلام، اس اصولِ توحید کو، نوعِ انسانی کی جذباتی اور فکری زندگی میں ایک جیتا جاگتا عنصر بنانے کا عملی ذریعہ ہے۔ اس کا مطالبہ تخت و تاج کی اطاعت نہیں۔ صرف خدا کی اطاعت ہے اور چونکہ ذاتِ خداوندی، حیاتِ کلّی کی روحانی اساس و بنیاد ہے، اس لئے خدا کی اطاعت سے مفہوم، انسان کا خود اپنی مثالی فطرت کی اطاعت ہے۔ نہ کسی غیر کی محکومیّت۔

ثبات و تغیّر کا امتزاج

اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی یہ روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکّل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں مستقل اور تغیّر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیّر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیّر کا امکان ہی نہیں۔ ——— وہ تغیّر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔[1] ——— تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے۔ یکسر جامد و متصلّب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کے عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدّل اصولِ حیات نہیں تھے۔

---

[1] اِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ..... لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ (۱۰/۶)

اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حیات کارفرما ہے؟ یہ اصول وہی ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اجتہاد

اجتہاد کے لغوی معنی جدّ وجہد اور پوری پوری کوشش کے ہیں۔ اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں، کسی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے جدّ وجہد کا نام اجتہاد ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تصوّر قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ سے مستنبط ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری متعین کردہ منزل تک پہنچنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اس منزل تک پہنچنے کے راستے دکھا دیتے ہیں، اس کی تشریح نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں ملتی ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت معاذ کو یمن کا گورنر مقرر کیا گیا تو رسول اللہؐ نے ان سے پوچھا کہ وہ معاملات کے فیصلے کس طرح کریں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں تمام امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کر دوں گا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ سے راہ نمائی نہ ملے[1] تو پھر؟ اس کے جواب میں حضرت معاذ نے کہا کہ ایسی صورت میں، میں رسول اللہؐ کے نظائر کی طرف رجوع کروں گا۔ مکرر ارشاد ہوا کہ اگر اس باب میں یہ نظائر بھی خاموش ہوں تو؟ تو میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ دوں گا"۔ یہ تھا حضرت معاذ کا جواب۔

(یہ تھی اس تصوّر کی ابتداء۔ لیکن) تاریخ اسلام کے طالب العلم کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اسلامی مملکت کی توسیع کے ساتھ، ایک منظّم اور باضابطہ قانونی فکر کی ضرورت لاینفک ہوگئی۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے ماتحت، ہمارے قدیم فقہاء۔ عرب اور غیر عرب دونوں۔ اس باب میں برابر محنت کرتے رہے تا آنکہ ان کی اجتماعی فکر، ہماری فقہ کے مسلّمہ مذاہب کے پیکروں میں جلوہ پیرا ہوگئی۔ یہ فقہی مذاہب، اجتہاد کے تین مدارج تسلیم کرتے ہیں۔

اجتہاد کے تین مدارج

(۱) اجتہادِ مطلق۔ یعنی قانون سازی کا اختیارِ کلّی۔ جو ان مذاہب کے آئمہ کی ذات تک محدود ہے۔

---

[1] یعنی اس میں اس کے لئے متعین قانون نہ ہو۔

(۲) اضافی اجتہاد - یعنی کسی ایک مذہب فقہ کے اندر رہتے ہوئے، اجتہاد کی ضرورت

(۳) خصوصی اجتہاد - یعنی ان مسائل میں اجتہاد جنہیں ائمہ فقہ نے غیر معیّن چھوڑ دیا ہو۔

میں اس خطبہ میں صرف شق اوّل (اجتہادِ مطلق) کے متعلق، گفتگو کروں گا۔

سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمۂ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اُن کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظام شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب وعلل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی، جس نے قانون شریعت کو بحیر منجمد بنا کر رکھ دیا۔ بعض مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ اس جمود کا باعث ترکوں کا اثر ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال سطحی سا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے مذاہب فقہ، ترکوں کے اثرات کی آمد سے بہت پہلے اپنی آخری شکل میں مرتّب ومتشکّل ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں اس کے حقیقی اسباب حسب ذیل ہیں۔

جمود کے اسباب

(۱) اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں، اسلام میں معقولیین (معتزلہ) کی ایک تحریک پیدا ہوئی تھی جس کی وجہ سے کئی تند وتلخ بحثیں چھڑ گئی تھیں۔ مثلاً ان دو گروہ (منقولییّن اور معقولییّن) کے درمیان ایک مابہ النزاع مسئلہ یہی تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ معقولییّن (معتزلہ) نے اسکے غیر مخلوق ہونے سے اس بنا پر انکار کیا کہ ان کے نزدیک یہ عیسائیت کے اس عقیدہ کی ایک دوسری شکل تھی جس کی رُو سے وہ "کلمہ" کو قدیم مانتے ہیں۔ اس کے برعکس، قدامت پرست گروہ (محدّثین) نے جنہیں بعد میں عباسی خلفاء

محدّثین کا گروہ

کی تائید اس بنا پر حاصل ہوگئی کہ وہ معتزلہ کے سیاسی اثرات سے خائف تھے۔ معتزلہ کی اس وجہ سے مخالفت کی کہ ان کا خیال تھا کہ قرآن کو مخلوق مان کر وہ اسلامی معاشرہ کی بنیادیں کمزور کر رہے ہیں۔ مثلاً نظّام معتزلی کو لیجئے۔ اس نے احادیث کا قریب قریب انکار کر دیا اور حضرت ابو ہریرہؓ کے متعلق علانیہ کہہ دیا کہ وہ قابل اعتماد راوی نہ تھے۔ چنانچہ کچھ تو اس لئے کہ ان معقولییّن کے حقیقی مسلک کے متعلق لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور کچھ اس لئے کہ ان میں سے بعض کے افکار بے باک سے ہو گئے، قدامت پسند گروہ نے اس تحریک کو اُمت میں انتشار

پیدا کرنے کا موجب سمجھا اور اسلام کے نظامِ تمدن و سیاست کے استحکام کے لئے خطرہ تصوّر کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی معاشرہ کو انتشار سے بچایا جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے، ان کے سامنے ایک ہی طریق کار تھا۔ اور وہ یہ کہ اس کے لئے شریعت کے ڈنڈے کو استعمال کیا جائے اور اپنے ضابطۂ قانون کو شدّت کے ساتھ سخت گیر بنا دیا جائے (یعنی اس میں نہ کوئی لچک رکھی جائے نہ کسی تغیّر و تبدّل کی گنجائش)۔

تصوّف

(۲) اسلامی قانونِ شریعت کے جامد اور متصلّب بن جانے کا یہ پہلا سبب تھا۔ اس کا دوسرا سبب، مسلمانوں میں خانقاہیت کے تصوّف کی نمود اور فروغ تھا۔ اس نے، یکسر غیر اسلامی اثرات کے ماتحت، آہستہ آہستہ، ملّت کو زندگی کے عملی مسائل سے بیگانہ بنا کر، قیاسی اور تفکری تصوّرات میں اُلجھا دیا۔ خالص مذہبی نقطۂ نگاہ سے، تصوّف نے فقہا اور متکلّمین کی لفظی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ مثال کے طور پر حضرت سفیان ثوریؒ کو لیجئے۔ یہ اپنے دور کے بڑے غائر بیں، مقنّنین میں سے تھے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک خاص فقہی مذہب کے بانی، لیکن چونکہ ان کا رجحان شدت سے روحانیت[1] کی طرف تھا۔ اس لیئے انہوں نے فقہا کی خشک بحثوں سے تنگ آ کر تصوّف کی آغوش میں پناہ لے لی۔ جہاں تک تصوّف کے تصوّراتی پہلو کا تعلق ہے (جس نے بعد میں ایک فلسفہ کی شکل اختیار کر لی) یہ آزاد خیالی کا مظہر اور معقولیّین کا ہم رنگ ہے۔ لیکن اس نے ظاہر اور باطن کے امتیاز پر جس قدر زور دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باطن کی اہمیّت بڑھتی گئی اور زندگی کے ظاہری پہلو سے بے اعتنائی اور بے التفاتی کا رجحان راسخ ہو گیا۔ ترکِ دنیا کے اس مسلک نے آگے چل کر مسلمانوں کی نگاہوں سے اسلام کے سیاسی اور تمدّنی گوشے کو، جو اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے، یکسر اوجھل کر دیا۔ دوسری طرف، اس نے عقائد و افکار کی دنیا میں جس قدر آزادی دے رکھی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملّت کے بہترین دماغوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اس طرح کانِ نمک میں جا کر نمک بن گئے۔ جب بہترین دماغ اس طرف چلے گئے تو سیاست لامحالہ کم مایہ اور ادنیٰ اصلاحیتیں رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں آ گئی۔ باقی رہے عوام۔ سو چونکہ قوم میں بلند پایہ مفکّرین کا فقدان ہو گیا جو ان کی صحیح فکری راہ نمائی کر سکتے، اس لئے انہوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ مختلف فقہی مذاہب کی اندھی تقلید کرتے رہیں۔

---

[1] اس سے مراد تصوّف کی روحانیت ہے۔

زوالِ بغداد

(۳) ان سب پر طرّہ یہ کہ تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد پر تباہی آگئی جو مسلمانو کی حیاتِ عقلی کا مرکز بن چکا تھا۔ یہ حادثہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لئے طامۃ الکبریٰ اور ایسا جانکاہ صدمہ تھا کہ اس زمانے کے کم و بیش تمام ہمعصر مؤرخین جب تاتاری حملوں کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہیں تو دبی زبان سے خود اسلام کے مستقبل کے متعلق مایوسی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب اس تباہی نے ملت کا شیرازہ اس طرح بکھیر دیا تو قدامت پرست مفکرین نے، قوم کو مزید انتشار سے بچانے کی خاطر اپنی تمام تر توجہات کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا کہ کسی نہ کسی طرح معاشرتی زندگی کی یکسانیت کو محفوظ رکھ لیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ فقہائے سلف نے جو قوانینِ شریعت مرتب کر دیئے ہیں، ان میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کیا جا سکتا۔ (اس طرح ہر قسم کی ندرتِ فکر، بدعت یعنی ضلالت قرار پا گئی) ان حضرات کے پیشِ نظر صرف ملت کا معاشرتی نظم تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال اور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس اہم حقیقت کو نہ سمجھا۔ اور نہ ہی اسے ہمارے دور کے علماء سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کے سرمایہ کا تو مالک بن جاتا ہے لیکن اس کی

ماضی کا جھوٹا احترام

اپنی روح مُردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنّف نے کہا ہے:-

"تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے۔ جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔"

لہٰذا زوال اور عناصر کی روک تھام کا مؤثر طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم میں خود خریدہ افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیارِ زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ ہم اس میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلّب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔ قدامت پرست

علماء کا یہی وہ رجحان تھا جس کا ردِ عمل امام ابن تیمیہؒ کی صورت میں نمودار ہوا۔

امام ابن تیمیہؒ

ابن تیمیہؒ بغداد کی تباہی کے پانچ سال بعد، ۱۲۶۳ء میں، پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت، حنبلی مذہب کی روایات کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ وہ ایک زبردست اہلِ قلم اور نہایت سرگرم مبلغِ اسلام تھے۔ انہوں نے خود مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اس عقیدہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور جو کچھ مذاہبِ فقہ نے مرتب کر دیا ہے وہ شریعت میں حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح ابتداءً فقہ مرتب ہوئی تھی، ہم بھی انہی اصولوں کے ماتحت اسے از سرِ نو مرتب کر سکتے ہیں۔ فرقۂ ظاہریہ کے امام ابن حزمؒ کی طرح انہوں نے بھی حنفی مذہب کے قیاس اور اجماع کے اس تصور کی تردید کی جو ان کے ہاں شروع سے چلا آرہا تھا۔ اس لئے کہ ان کی یہ رائے تھی کہ اس طرح کا اجماع درحقیقت توہم پرستیوں کی بنیاد ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں جس قسم کی ذہنی ابتری اور اخلاقی کمزوری عام ہو رہی تھی، اس کے پیشِ نظر ان کا یہ مسلک بالکل درست تھا۔

سولھویں صدی میں امام سیوطیؒ نے بھی مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کا بھی اضافہ کیا کہ ہر صدی کے آخر پر ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ابن تیمیہؒ کی تعلیم کی روح کا مکمل مظاہرہ اس تحریک میں جا کر ہوا جو اٹھارہویں صدی میں، ریگ زارِ نجد سے اٹھی۔ اس حصہ سے جسے میکڈانلڈ نے "زوال پذیر اسلامی دنیا کا پاکیزہ ترین خطہ" قرار دیا ہے۔

نجدی تحریک

یہ تحریک عظیم مضمرات و ممکنات کی حامل تھی۔ اس سے اسلام کی حیاتِ تازہ کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ایشیا اور افریقہ کی قریب قریب تمام جدید تحریکوں کا سرچشمۂ زندگی، بالواسطہ یا بلاواسطہ، یہی تحریک نجد ہے۔ مثلاً سنوسی کی تحریک، پین اسلامی (پان اسلامک) تحریک یا ایران کی بابی تحریک، جو درحقیقت عربی پراٹسٹنٹ تحریک کا ایرانی عکس ہے۔ ان سب میں وہی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ اس نجدی تحریک کا بانی، محمد بن عبدالوہابؒ ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدینہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایران کا سفر کیا اور پھر (اپنی مسلسل سعی و عمل سے) انہوں نے اپنی روحِ بے قرار کی حرارت کو تمام عالمِ اسلامی کے رگ و پے میں دوڑا دیا۔ ان کا جوشِ عمل، امام غزالیؒ کے شاگرد، ابن تومارت کے جوش و ولولہ کے مشابہ تھا جو اندلس کی تباہی کے بعد پیدا ہوا اور جس نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس وقت ہم اس (نجدی) تحریک کی سیاسی سرگرمیوں سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ جنہیں محمد علی پاشا نے ختم کر دیا۔ اس تحریک

کے اس اجمالی سے تذکرہ سے مقصود صرف اُس روحِ آزادی کو سامنے لانا ہے جس کی یہ مظہر تھی، اگرچہ اپنی داخلی سرشت میں یہ تحریک بھی قدامت پرستی ہی پر مبنی تھی۔ یعنی یہ ایک تحریک ایک طرف اس عقیدہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی تھی کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں اور اپنے لئے حقِ اجتہاد کی زبردست مدعی تھی لیکن دوسری طرف، ماضی کے متعلق اس کا طرزِ عمل یکسر غیر ناقدانہ تھا اور قوانینِ شریعت کے لئے وہ صرف احادیثِ نبوی پر دارومدار رکھتی تھی[1]

ترکی

اب ترکی کی طرف آیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اجتہاد کا نظریہ، جسے عصرِ حاضر کے فلسفیانہ تصورات نے بڑی تقویت اور وسعت دے دی ہے، ترکوں کی مذہبی اور سیاسی فکر میں ایک عرصے سے کارفرما ہے۔ یہ حقیقت قانونِ شریعت کے متعلق حلیم ثابت کے جدید نظریہ سے بالکل ظاہر ہے کہ جس کی بنیاد جدید عمرانی تصورات پر رکھی گئی ہے۔ اگر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ایک حقیقت ہے اور میرا ایمان ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے تو ترکوں کی طرح ایک دن ہمیں بھی اپنی علمی میراث کا از سرِ نو جائزہ لے کر اس کی صحیح صحیح قیمت متعین کرنی ہوگی۔ اس سے اگر ہم نے عام فکرِ اسلامی میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ بھی کیا، تو ہم کم از کم اتنا تو کر سکیں گے کہ اپنے ماضی پر صحیح تنقید سے، بے راہ روی اور مذہب سے برگشتگی کی اس رَو کو تھام سکیں جو اس وقت عالمِ اسلام میں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

میں اب ترکی کے مذہبی اور سیاسی افکار و رجحانات کا ایک اجمالی سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس ملک کے فکر و عمل کے دوائر میں اجتہاد کی قوت کس درجہ نمایاں ہو رہی ہے[2]۔ اب سے کچھ وقت پہلے، ترکی میں دو مکاتبِ فکر تھے۔ ایک وہ جس کی نمائندگی وہاں کی نیشنلسٹ پارٹی کرتی تھی اور دوسرا وہ جس کی ترجمان مذہبی اصلاح کی علمبردار جماعت تھی۔ نیشنلسٹ پارٹی کے پیشِ نظر سب سے اہم سوال مذہب نہیں بلکہ مملکت کا مفاد ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کا کوئی آزادانہ منصب ہی نہیں۔ قومی زندگی میں مملکت ہی وہ ضروری عنصر ہے جس سے دیگر عناصر کے فرائض و مناصب متعین ہوتے ہیں۔

---

[1] یہی تحریک ہے جو عوام میں وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور جو اب مسلکِ اہلِ حدیث کی شکل میں متعارف ہے۔ یہ حضرات ماضی پرستی میں اہلِ فقہ سے بھی زیادہ متشدد ہیں۔

[2] اسے پیشِ نظر رکھئے کہ یہ بات ۱۹۲۸ء میں کہی گئی تھی۔

انہوں نے چنانچہ، مذہب اور سیاست کے فرائض کے متعلق قدیم خیالات کو یکسر مسترد کر دیا ہے اور اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مذہب کو ریاست سے الگ کر دینا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مذہبی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے اسلام کی ہیئت ترکیبی اس قسم کے تصور کی اجازت دیتی ہے[1] اگرچہ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ مملکت کے تصور کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ یہ تمام دیگر اسلامی تصورات پر غالب اور حاکم ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اسلام میں روح اور مادہ، (دین اور دنیا) دو الگ الگ دوائر حیات نہیں اور اس کا فیصلہ کہ فلاں کام دنیاوی ہے یا دینی، اس کام کے کرنے والے کی نیت سے ہوتا ہے، خواہ

دین اور سیاست کی ثنویت

اس کام کا مقصود، کیسا ہی دنیاوی کیوں نہ ہو۔ (بالفاظ دیگر کسی کام کے دنیاوی یا دینی ہونے کا فیصلہ اس کام کی نوعیت نہیں کرتی" بلکہ وہ ذہنی پس منظر کرتا ہے جو بالکل غیر مرئی (INVISIBLE) ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کام "دنیاوی" اس وقت کہلائے گا جب اسے زندگی کے گوناگوں علائق سے یکسر بے تعلق ہو کر کیا جائے۔ لیکن وہی کام "روحانی" ہو جائے گا۔ اگر اس کا جذبۂ محرکہ حیات کے وہ علائق ہوں، اسلام میں، ایک ہی حقیقت کو اگر ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مذہب (کلیسا) بن کر دکھائی دیتی ہے اور اسے دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مملکت ہو جاتی ہے (یعنی اسلام میں مذہب اور سیاست ایک ہی حقیقت ہے)۔ حتیٰ کہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مذہب اور مملکت ایک شے کے دو رُخ یا دو گوشے ہیں۔ (دو رُخ یا دو گوشے نہیں بلکہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں) اسلام ایک ناقابل تقسیم اور واحد حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے یہ وہی بن جائے گی۔ یہ نقطہ بڑا دُور رس ہے اور اگر اس کی وضاحت شرح و بسط سے کی جائے تو ہم بہت بلند اور دقیق فلسفیانہ بحث میں اُلجھ جائیں گے۔ اس لئے میں اس مقام پر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مذہب اور سیاست کی ثنویت، اس قدیم غلط تصور کی پیدا کردہ ہے جس کی رُو سے انسان کی وحدت کو ان دو جداگانہ حقیقتوں میں تقسیم کر دیا گیا جن کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ ان کا نقطۂ اتصال تو موجود ہے لیکن یہ درحقیقت ایک دوسرے سے یکسر متغائر اور متضاد ہیں۔ (یعنی روح اور مادہ کی مغائرت

---

(۱) ہم اس فقرے کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ اس لئے کہ اس کے بعد حضرت علامہؒ نے شرح و بسط سے واضح کیا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت کی قطعاً گنجائش نہیں۔

کا تصوّر) لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب روح (SPIRIT) کو زمان و مکان کی نسبتوں سے دیکھا جاتے

روح اور مادہ

تو اسے مادہ کہتے ہیں (اس لئے روح اور مادہ الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں) وہ وحدت جسے انسان کہا جاتا ہے، جسم دکھائی دے گی جب ہم اسے خارجی دنیا میں کام کرتا دیکھیں۔ لیکن جب ہم اس مقصد اور غایت پر نگاہ رکھیں جس کے لئے وہ کام کیا جارہا ہے تو یہی وحدت روح (SOUL) یا (MIND) بن جائے گی۔ "توحید" کو جب ایک عملی تصوّر کی حیثیت سے دیکھا جائے تو مساوات، سالمیت SOLIDARITY اور حرّیت اس کے بنیادی خصائص نظر آئیں گے۔ جس ادارہ کو مملکت کہا جاتا ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ "توحید" کے انہی بنیادی خصائص کو مادّی پیکروں میں متشکّل اور کارفرما کرنے کا ذریعہ ہے۔ یا بالفاظِ دیگر، اس نصب العین کو انسانی معاشرہ کے قالب میں ڈھالنے کی آواز۔ اسلام میں مملکت کے "خدائی حکومت" ہونے سے مفہوم صرف اتنا ہی ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اس کا رئیس یا صدر، خدا کا نائب ہے جو اپنے مستبدارادوں اور جابرانہ فیصلوں کو مزعومہ معصومیت کے نقاب میں چھپاکر، خدا کے بندوں پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ جو لوگ اسلامی نظامِ حکومت پر تنقید کرتے ہیں ان کی نگاہوں سے یہ اہم حقیقت اوجھل ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر کی سائنس نے اس حقیقت کو منکشف کر دیا ہے کہ مادہ اپنا ایک الگ وجود نہیں رکھتا۔ اس کی اصل روح (SPIRIT) کے اندر ہے۔ اس انکشاف نے اسلام، بلکہ دنیائے مذاہب کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس نے بتایا یہ ہے کہ مادی دنیا یا محسوس کائنات کوئی نجس اور قابلِ نفرت شے نہیں ہے۔ مادّہ کا یہ عظیم ذخیرہ محض اس لئے وجود میں لایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ انسانی ذات 'PERSONALITY' اپنے اندر استحکام پیدا کر کے اپنے مقام کو پالے۔ لہٰذا مادّی کائنات مقدّس اور پاکیزہ ہے۔ نجس اور خبیث نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین الفاظ میں "یہ تمام دنیا مسجد ہے" لہٰذا اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کارگاہ کا نام ہے جس کے اندر انسانی ذات، معاشرہ کی وساطت سے بیدار اور مستحکم ہو کر اپنے مقام کو پالیتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر وہ مملکت جو تغلب و تسلّط پر مبنی نہ ہو، اور جس کا مقصد ان مثالی اصولوں کا حصول ہو، "حکومتِ خداوندی" ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترک قومیّت پرستوں کے ذہن میں مذہب اور ریاست کی تفریق کا خیال، یورپ کے سیاسی افکار کی تاریخ کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ قدیم عیسائیت ایک سیاسی یا معاشرتی نظام کی صورت میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک "نجس اور خبیث دنیا" میں نظامِ خانقاہیّت کی حیثیت سے وارد

ہوئی تھی۔ جس کا انسان کے عمرانی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان معاملات میں وہ رومی اقتدار کے تابع تھی۔

چرچ اینڈ سٹیٹ

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مملکت نے مذہب عیسائیت اختیار کیا تو سٹیٹ اور چرچ (کلیسا) ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آئے اور ان میں یہ لامتناہی نزاع پیدا ہوگئی کہ ایک کا دائرہ اثر و نفوذ کیا ہے اور دوسرے کے حدودِ اقتدار کون سے ہیں؟ اسلام میں ایسی صورت حالات کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ اسلام شروع ہی سے ایک دوسرے نظام کی حیثیت سے منصۂ شہود پہ آیا تھا جسے قرآن کریم نے لیے سیدھے سادے قانونی اصولوں کا ضابطہ عطا کر دیا تھا جس میں رومیوں کے مشہور بارہ جدولوں کی طرح، اس امر کی صلاحیت تھی کہ وہ (ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق نئی نئی تعبیرات کی رُو سے پھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ بعد کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ قرآن نے جو قانونی اصول دیئے ہیں ان میں فی الحقیقت ان وسعتوں کے امکانات موجود ہیں۔ لہٰذا ترکوں کی نیشنلسٹ پارٹی نے مملکت کے متعلق

قرآن کے قانونی اصول

جو نظریہ قائم کیا ہے وہ یکسر گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ وہ مذہب اور سیاست میں اس ثنویت کے تصور پر مبنی ہے جس کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔

اس کے برعکس، مذہبی اصلاحات کی پارٹی جس کے سرکردہ، سعید حلیم پاشا تھے۔ اس اصل الاصول پہ مُصر تھی کہ اسلام، تصوریت (IDEALISM) اور مرئیت (POSITIVISM) روح اور مادہ) کا حسین مرکب ہے۔ یعنی اس میں بلند آفاقی اصول حیات، مادی پیکروں میں عملاً متشکل ہو جاتے ہیں۔ یہ حریت، مساوات اور سالمیت کی مستقل اقدار اور ابدی صداقتوں کا مجموعہ ہے جسے وطنیت کی چار دیواری میں محدود نہیں کیا جا سکتا، سعید حلیم پاشا، کے الفاظ میں "جس طرح برطانوی ریاضیات، جرمن فلکیات

وطنیت

اور فرانسیسی کیمسٹری (کیمیا) کا تصور غلط ہے اسی طرح ترکی، عربی، ایرانی یا ہندی اسلام کا تصور بھی باطل ہے۔ (یعنی جو حقائق عالمگیر ہوں، وہ وطنی اضافتوں سے ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے) جس طرح سائنس کے حقائق کی عالمگیریت مختلف قوموں میں مختلف سائنٹیفک کلچر پیدا کر دیتی ہے اور ان تمام کلچرز کا مجموعہ انسانی علم کہلاتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی عالمگیر اقدار، مختلف قوموں میں مختلف ملی، اخلاقی اور معاشرتی نصب العین پیدا کر دیتی ہیں (خود غیر متبدل رہتی ہیں)"۔ سعید حلیم پاشا نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ کلچر جس کی بنیاد قومی انانیت پر ہے، وحشت و بربریت ہی کی دوسری شکل ہے۔

قومیت پرستی

یہ عصر سے بڑھتے ہوئے نظامِ کارخانہ داری (INDUSTRIALISM) کی پیداوار ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنے جبلی اور حیوانی تقاضوں اور رجحانات کی تسکین کر لیتا ہے۔ وہ (سعید حلیم پاشا) متأسف ہیں کہ، ہماری تاریخ میں، اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی اصول، مقامی اثرات اور (جو قومیں مسلمان ہوئیں ان کے) زمانۂ قبل از اسلام کے توہم پرستانہ عقائد و مسالک کی وجہ سے، آہستہ آہستہ غیر اسلامی ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ اسلام کے یہ اصول، اسلامی کم اور ایرانی، ترکی اور عربی زیادہ ہیں۔ اسلام کے عالمگیر اور غیر شخصی اخلاقی اصولوں پر مقامی اثرات کا کچھ ایسا زنگ چڑھ گیا ہے کہ اس کی اصلی شکل و صورت اب پہچانی ہی نہیں جاتی۔ حتیٰ کہ اصولِ توحید کی مقدس جبین پر اصنام پرستی تک کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ اندریں حالات، ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام

کشادِ کار کی راہ

پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جن کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ بالکل جامد ہو کر رہ گیا ہے۔ انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے۔ اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو ازسرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

غرض، یہ ہیں ترکی کے جلیل القدر وزیر، سعید حلیم پاشا کے خیالات۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ایسے راستے پر چلتے ہوئے جو روحِ اسلامی سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، یہ مفکر قریب قریب اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جو وہاں کی نیشلسٹ پارٹی کا موقف ہے۔ یعنی اجتہاد کی آزادی تاکہ جدید فکر اور زمانہ کے تجربات کی روشنی میں قانونِ شریعت کو ازسرِ نو مرتب کیا جائے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے بتایا ہے کہ (مثلاً) الغائے خلافت کے مسئلہ پر ترکوں نے کس طرح اُن خطوط پر اجتہاد سے کام لیا ہے جن کی طرح ابنِ خلدون اور قاضی ابوبکر باقلانی جیسے مفکر بہت پہلے ڈال چکے تھے۔ پھر انہوں نے ترکی کے مشہور انقلابی شاعر ضیاء کی بعض نظموں کے اقتباسات سے اس نقطہ کی وضاحت کی ہے کہ ترکی فکر کس طرح اپنے لئے نئی نئی راہیں تراش رہی ہے۔ اس شاعر نے اپنے جوشِ تجدد پسندی میں یہ بھی کہا ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے عورت کو جو مرد سے نصف حصہ ملتا ہے، یہ اصولِ مساوات کے خلاف ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے اس خیال کی تردید آگے چل کر کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا یہ اعتراض قرآن کے

قوانینِ وراثت سے بے خبری کی بناء پہ ہے۔ ان تصریحات کے بعد، علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :۔

"حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ترکی ہی وہ قوم ہے جس نے ملائیت کے خوابِ گراں سے بیدار ہو کر شعورِ ذات حاصل کیا ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو بجا طور پر فکری آزادی کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ یہی ہے جو تصورات کی دنیا سے آگے بڑھ کر حقائق کی دنیا کی طرف آ رہی ہے۔ اس عبوری دور سے گزرنے کے لئے ایک شدید ذہنی اور اخلاقی کشمکش ناگزیر تھی۔ اب، وسعتِ طلب اور حرکت پسند زندگی کی پیچیدگیاں اس کے سامنے نئے نئے مواقع پیش کریں گی۔ جن کے لئے نئے زاویوں سے سوچنے کی ضرورت ہو گی۔ اس کے لئے (اسلام کے غیر متبدل) اصولوں کی جدید تعبیرات ہوں گی ——— یعنی ان اصولوں کی جدید تعبیرات جو ان لوگوں کے لئے جو روحانی کشادگی کی مسرتوں سے ناآشنا ہوں محض نظری حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ قول برطانوی مفکر ہابز کا ہے کہ اگر مسلسل اور متواتر ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات پیدا ہوں، تو سمجھ لیجئے کہ خیالات اور احساسات سرے سے پیدا ہی نہیں ہو رہے (یعنی اگر ندرتِ فکر و احساس نہ رہے تو انسانی قلب و دماغ مردہ ہو جاتے ہیں)۔

مسلم اقوام کی حالت

آج مسلم قوم کی اکثریت کی حالت ایسی ہو چکی ہے۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں، جو محض ایک مشین کی طرح پرانی اقدار کی رٹ لگائے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس، ترک اس راستہ پر گامزن ہو گئے ہیں جس میں نئی نئی قدروں کی تخلیق ہو گی۔ یہ قوم ایسے تلخ تجارب سے گزری ہے کہ اب اس کی عمیق خودی اس پر منکشف ہو رہی ہے۔ اس کی ذات میں روحِ حیات مضطرب و بے قرار نظر آ رہی ہے۔ نئی امنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے سامنے آنے والا ہے ——— اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے ——— سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے

روحِ عمریؓ

ھ۱ واضح رہے کہ اس جوشِ تجدد پسندی میں جہاں جہاں ترکوں کا دامن قرآن سے چھوٹا ہے، نہ علامہ اقبالؒ اس کی تائید کرتے ہیں نہ طلوعِ اسلام۔ جیسا کہ ہم مختلف مقامات پر کہہ چکے ہیں، یہ امر موجبِ بدقسمتی تھا کہ اس ذہنی انقلاب کے وقت ترکوں میں کوئی ایسا صاحبِ بصیرت نہ تھا جو قرآن کی روشنی میں ان کی راہ نمائی کر کے انہیں اعتدال کے راستے پر لے چلتا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اپنی بعد کی تحریروں میں اس پر تنقید بھی کی ہے اور اظہارِ تأسف بھی۔

رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:۔

"حَسبُنَا کِتَابُ اللّٰہ"

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

ہم دنیائے اسلام میں اس قسم کی تحریکِ آزادی کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آزاد خیالی کا یہ رجحان، اسلام کی تاریخ میں بڑا نازک لمحہ ہے۔ آزادیٔ افکار، ملّت میں تشتّت وانتشار پیدا کرنے کا موجب بھی بن سکتی ہے۔

آزاد خیالی کا خطرہ

(اس کے ساتھ ہی، عالمِ اسلام میں نسلی امتیاز کا جو تخیّل آجکل اس زور شور سے اُبھر رہا ہے اس سے یہ خدشہ ہے کہ کہیں عالمگیر انسانیت کا وہ گمراں مایہ تصوّر جسے مسلمانوں نے اپنے دین سے حاصل کیا تھا۔ ان کے اُفقِ ذہنی سے ناپید ہی نہ ہو جائے۔ نیز یہ خطرہ بھی ہے کہ اگر ان کی مناسب روک تھام نہ کی گئی تو ہمارے مذہبی اور سیاسی مصلحین وسیع الخیالی کے جوش میں اصلاح کی حدود سے تجاوز کر جائیں۔ ؎۱ ہم آجکل اسی قسم کے دور سے گزر رہے ہیں۔ جس سے یورپ، پراٹسٹنٹ تحریک کے زمانے میں گزرا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوتھر کی تحریک کے آغاز و نتائج سے جو سبق ہمیں سیکھنا چاہیے وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ تاریخ کے عمیق مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ پروٹسٹنٹ تحریک، دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جس کا لوتھر پر یہ اثر ہوا کہ رفتہ رفتہ عیسائیت کے عالمگیر اخلاق کی جگہ، قومی نظامِ اخلاق نے لے لی۔ اس رجحان کے اثرات ہم نے گزشتہ جنگِ عظیم (پہلی عالمگیر جنگ) میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ اس جنگ نے بجائے اس کے کہ یہ دو متضاد نظام ہائے اخلاق میں ہم آہنگی پیدا کرتی، یورپ کے حالات کو اور بھی ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ لہٰذا دنیائے اسلام کے رہنماؤں کا فریضہ ہے کہ یورپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور اسلام اپنے معاشرتی اور سیاسی نظام کی رُو سے جس نصب العین کی طرف لے جاتا ہے، اسے نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے، اصلاحِ حالات کے لئے قدم اٹھائیں۔

میں نے اجتہاد کی تاریخ اور جس طریق سے وہ آجکل عالمِ اسلام میں عمل پیرا ہو رہا ہے، اس کا ایک اجمالی سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب میں یہ بتاؤں گا کہ اسلامی قوانینِ شریعت کی تاریخ اور ہیئت

؎۱ اصلاح کی صحیح حدود یہ ہیں کہ قرآنِ کریم کی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے اصلاح کی جائے۔ نہ کہ SECULAR بن کر۔

ہیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی جدید تعبیر ممکن ہے یا اس نتیجہ پر کہ ان میں جدید تعبیرات

جدید تعبیرات کا امکان

کا امکان نہیں؟ بالفاظ دیگر، سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے قوانین شریعت میں ارتقاء کی صلاحیت ہے یا نہیں؟ یہی سوال، لندن یونیورسٹی کے السنۂ سامیہ کے پروفیسر، ہارٹن نے، اسلامی فلسفہ اور الٰہیات کے ضمن میں اٹھایا ہے۔ چنانچہ یہ پروفیسر، مسلم متکلمین کی ان کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جو انہوں نے خالص مذہبی فکر کے سلسلہ میں کی ہیں، لکھتا ہے کہ تاریخ اسلام، آرین علم و ثقافت اور سامی مذہب کے متغائر قوتوں میں تدریجی تعامل، ہم آہنگی اور عمق پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ مسلمان ہمیشہ اپنے مذہبی نقطۂ نگاہ کو ان ثقافتی عناصر سے تطبیق دیتے رہے ہیں جو ان کے گرد و پیش کی اقوام سے ان کی طرف آتے رہے۔ چنانچہ ۸۰۰ء سے لے کر ۱۱۰۰ء تک مسلمانوں میں کم از کم ایک سو فقہی مکاتب پیدا ہوئے۔ یہ اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ اسلامی فکر میں کس قدر لچک ہے اور قدیم متکلمین نے اس باب میں کس قدر انتھک کوششیں کی ہیں۔ اس طرح اسلامی فکر اور مسلمانوں کے لٹریچر کے گہرے مطالعہ کے بعد، یہ مغربی مستشرق اس نتیجہ پہ پہنچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ:۔

> "اسلام کی روح (سپرٹ) وسیع ہی نہیں بلکہ قریب قریب لامحدود ہے۔ اس نے دہریت کو چھوڑ کر، اپنے گرد و پیش کی اقوام کے باقی تمام تصورات کو نہ صرف اپنایا بلکہ انہیں اپنی مخصوص راہ نمائی میں شاہراہِ ترقی پر بھی ڈال دیا ہے۔"

اسلام کی یہ "خذ ما صفا" کی سپرٹ قانون کے دائرہ میں خاص طور پہ نمایاں ہے۔ چنانچہ مشہور ولندیزی ناقدِ اسلام، پروفیسر ہرگرونج، اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

> "جب ہم اسلامی فقہ کی نشو و ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف، ہر دور کے علماء چھوٹی چھوٹی جزئیات کے اختلاف سے مشتعل ہو کر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں اور دوسری طرف، وہی علماء اپنے متقدمین کے انہی اختلافات میں موافقت اور مطابقت پیدا کرنے کے لئے باہمد گر متحد و ہم مقصد ہو کر کوشاں رہتے ہیں۔"

روحِ اسلام کی عالمگیریت

عصرِ حاضر کے ان مغربی ناقدین کے ان خیالات کی رُو سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے

وقت روحِ اسلام کی اندرونی عالمگیریت، علماء کی شدید قدامت پرستی کے علی الرغم، کارفرما ہوکر رہے گی اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اگر دورِ حاضر کے ناقدین، فقہِ اسلامی سے متعلق کثیر لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو انہیں اپنا یہ سطحی خیال بدلنا پڑے گا کہ اسلامی قانونِ شریعت جامد اور ناقابل ارتقاء ہے۔ بدقسمتی سے، ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو وہ بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی اور فرقہ وارانہ نزاعات چھڑ جائیں گے۔ بایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔

(۱) سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ قرنِ اول سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک، مسلمانوں میں، قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہ تھا۔

(۲) یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک، مسلمانوں میں قریب اُنیس مکاتبِ فقہ پیدا ہو چکے تھے۔ صرف اس ایک بات سے پتہ چل سکتا ہے کہ ایک بڑھتی ہوئی تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے، ہمارے فقہائے نے کس قدر جدّ وجہد سے کام لیا تھا۔ جوں جوں اسلامی فتوحات کا سلسلہ پھیلتا گیا اور مسلمانوں کا دائرۂ نظر وسیع ہوتا گیا۔ ہمارے ان قدیم فقہائے کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ ان اقوام کے احوال وظروف اور عادات واطوار کا مطالعہ کریں، جو حلقہ بگوشِ اسلام ہوئی تھیں اور اس طرح اپنے ماحول اور اس کے تقاضوں کا وسعتِ نظر سے جائزہ لیں۔ چنانچہ اگر اس زمانہ کی تمدنی اور سیاسی تاریخ کی روشنی میں مختلف مذاہبِ فقہ کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے فقہا تعبیرِ احکام کے سلسلہ میں رفتہ رفتہ استخراجی طریق (DEDUCTIVE) سے استقرائی طریق (INDUCTIVE) کی طرف آتے گئے۔

قانونِ شریعت کے مآخذ اربعہ

(۳) جب ہم شریعتِ اسلامی کے چار مسلّمہ مآخذ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس) اور ان سے پیدا شدہ نزاعات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے مذاہبِ فقہ کے جامد ہونے کا مفروضہ بالکل بے اصل و بے بنیاد ثابت ہوجاتا ہے اور فقہ میں مزید ارتقاء اور نشوونما کا امکان واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

آئیے۔ اب ان چار مآخذِ شریعت کے متعلق مختصر طور پر غور کریں۔

۱۔ قرآن

قرآن اسلام میں قانون کا اصلی سرچشمہ قرآن ہے۔ لیکن قرآن، کوئی تفصیلی ضابطۂ قانون نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس کا بنیادی مقصد، انسان کے دل میں، خدا اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کے بلند شعور کو بیدار کرنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن میں بعض اصول ضوابط قانونی نوعیت کے بھی موجود ہیں۔ بالخصوص انسان کی عائلی زندگی کے متعلق قواعد و ضوابط، جن پہ اس کی معاشرتی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ جس وحی کے پیش نظر انسان کی بلند ترین زندگی ہے، اس میں یہ معاشرتی قواعد و ضوابط وحی کا جزو کیوں بنا دیئے گئے، تو اس سوال کا جواب عیسائیت کی تاریخ میں ملے گا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیت درحقیقت یہودیت کی آئین و رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگی کے خلاف ردعمل تھی۔ اس کے لئے اس نے انسان کے سامنے دنیا چھوڑ عاقبت سنوارنے کا نصب العین رکھا۔ اور اس میں اسے کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن اس نے اس طرح انفرادی زندگی کا جو تصور پیدا کر دیا اس سے اس نے سمجھ لیا کہ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ (جرمن فلاسفر) نومن اپنی کتاب BRIEFF UBER RELIGIO N میں لکھتا ہے کہ:۔

> "ابتدائی مسیحیت نے مملکت، قانون، معاشرہ اور پیداوار کے تحفظ کے مسائل کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے معاشرتی مسائل کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔"

ان تصریحات کے بعد وہ آخر میں لکھتا ہے:۔

> "اب ہمارے لئے دو ہی صورتیں رہ گئی ہیں۔ یا تو ہم اس کا فیصلہ کر لیں کہ ہم بغیر کسی مملکت کے زندگی بسر کریں گے اور اس طرح اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فوضویت اور لاقانونیت کے گرداب میں ڈال دیں گے۔ اور یا ہم، اپنے مذہبی مسلک کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی مسلک کو بھی مقصدِ حیات بنا لیں۔"

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضروری سمجھا ہے کہ مذہب و مملکت اور اخلاقیات و سیاسیات کو ایک ہی وحی کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ جس طرح افلاطون نے اپنی کتاب ریپبلک (جمہوریت) میں انہیں یکجا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل، قرآن کا حرکیاتی نقطۂ نظر ہے۔ میں (اس سے پہلے) اس کے آغاز اور تاریخ کے متعلق تفصیلی طور پر کہہ چکا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کتاب اس نقطۂ نگاہ کی حامل ہو، وہ ارتقاء کے تصور کے مخالف کبھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ زندگی صرف تغیر و تبدل ہی کا نام نہیں۔ اس کے اندر ایسے عناصر ---------- (ELEMENTS OF CONSERVATION) بھی ہیں جو اپنی حالت پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے تخلیقی کارناموں سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اپنی توانائیوں کو زندگی کی نئی نئی شاہراہوں کے انکشاف پر مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن ان تمام کامرانیوں کے باوجود، اسے اپنی ذات کے انکشاف کے وقت کچھ تردد اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ترقی اور پیش قدمی میں اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اور اپنی ذات کی داخلی کشادسے اسے کچھ ڈر سا محسوس ہوتا ہے[1]۔ وہ جب آگے بڑھتا ہے تو ایسی قوتیں جو اس سے متخالف سمت کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہیں، اس کی روح کے سامنے روک بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ زندگی، اپنے ماضی کے پشتارے کو اپنی کمر پر لادے ہوئے آگے بڑھتی ہے اس لئے جب کبھی معاشرہ میں کسی تبدیلی کا سوال سامنے آئے تو قدامت پسندی کی قوتوں کی قیمت اور جس انداز سے وہ عمل پیرا ہوتی ہیں اس کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا ہمارے ہاں کے معقولیت پسند طبقہ کو چاہیئے کہ وہ جب معاشرہ کے مروجہ رسوم و مناسک (INSTITUTIONS) میں اصلاح و تغیر کا خیال کرے تو قرآن کے اس اہم اصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی کو یکسر مسترد نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ ان کی ذات کا تشخص ان کے ماضی کی بناء پر ہوتا ہے[2]۔

---

[1] اپنی ذات کے انکشاف و کشود کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی انفرادیت (INDIVIDUALITY) سے باخبر ہو جاتا ہے اور اس طرح اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بڑے کل (معاشرہ) کا جزو نہیں بلکہ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس کی نشو و نما معاشرہ کے اندر ہوتی ہے وہ اپنے اس احساسِ انفرادیت سے گھبراتا ہے حالانکہ اگر وہ اسے بنظر غائر دیکھے تو یہ چیز اطمینان کا موجب ہونی چاہیئے نہ کہ گھبراہٹ کا سبب۔ وہ اپنی انفرادیت میں معاشرہ سے کٹ نہیں جاتا بلکہ اس کا اہم رفیق بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی یہ گھبراہٹ اس کی کوتاہ نگہی کی دلیل ہے۔

[2] ماضی سے وابستگی اور شے ہے اور ماضی کی پرستش اور چیز۔ ماضی سے وابستگی کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس اسلاف کا جو سرمایہ منتقل ہو کر آئے ہم اس سے مستفید ہوں۔ لیکن ماضی پرستی کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سرمایہ پر کبھی تنقیدی نگاہ نہ ڈالیں۔

پس اسلام جیسے معاشرہ میں، مروجہ شعائر و مناسک (INSTITUTIONS) میں تبدیلی کا سوال بہت نازک اور دشوار بن جاتا ہے جس سے ایک مصلح کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے[1]۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے اسلام، کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ نہیں۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ مختلف نسلوں کے افراد کو (ایمان کے ذریعے) ایک مرکز پر اکٹھا کرے اور پھر ان ذرات کو ایک ایسی مملکت میں متشکل کر دے جسے شعور ذات کی نعمت حاصل ہو۔ اس طرح یہ ملت، تمام دنیا کے لئے ایک نمونہ بنے گی یہ بتانے کے لئے کہ تمام نوع انسانی کس طرح ایک اُمت واحدہ بن سکتی ہے۔ یہ کام کچھ ایسا آسان اور سہل الحصول نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسلام اپنے عدیم النظیر شعائر و ارکان کے ذریعے، تضاد و تخالف کے اس ہجوم (نوع انسانی) میں ایک اجتماعی عزم اور مجموعی ضمیر پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس قسم کے معاشرہ کے ارتقاء میں (اور تو اور) خور و نوش اور پاک پلید جیسے عام معاملات زندگی کے متعلق قوانین و ضوابط کا غیر متبدل ہونا بھی۔۔۔ ایک خاص معنی اور قدر و خویش رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اجب مختلف طبائع اور متضاد اطوار کے افراد ان احکام کی پابندی سے اپنے اندر یکسانیت پیدا کر لیتے ہیں تو) اس سے معاشرہ میں ایک خاص اندرونی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے وہ داخلی اور خارجی وحدت اور ہم آہنگی قائم رہتی ہے جو ان قوتوں کا مقابلہ کرتی ہے جو اس قسم کے مختلف الاوضاع معاشرہ میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کے لئے اندر ہی اندر سرگرم عمل رہتی ہیں۔ لہذا ان شعائر و مناسک پر تنقیدی نگاہ ڈالنے[2] والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس معاشرتی تجربہ کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر لے جس کی تشکیل اسلام کرتا ہے۔ وہ ان شعائر و مناسک پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ نہ دیکھے کہ ان سے فلاں ملک کو کیا کیا معاشرتی فوائد حاصل ہوں گے یا نقصانات پہنچیں گے، وہ ان کا جائزہ اس عظیم مقصد کی روشنی میں لے جو پوری کی پوری انسانیت میں رُوبکار ہوتا جا رہا ہے۔

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے

[1] کسی فرد کو ان تبدیلیوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ تبدیلیاں عند الضرورت صرف اسلامی نظام ہی کر سکتا ہے۔

[2] جن شعائر و مناسک کا تعین خود قرآن نے کر دیا ہے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تنقید سے مراد ان رسوم و مناسک پر تنقید ہے جو خارج از قرآن ہیں۔

سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہانے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:-

"رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اسقدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔"

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی کامل۔ مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

(اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے ترکی کے انقلاب پسند شاعر ضیاء کے ان سوالات کو لیا ہے کہ

طلاق و وراثت وغیرہ کے معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مساوات حاصل ہونا چاہئے اور ان پہ مدلل بحث کی ہے۔ اس کے بعد وہ قانون شریعت کے دوسرے سرچشمہ۔ یعنی حدیث کی طرف آتے ہیں۔

۲۔ حدیث

اسلامی قانون شریعت کا دوسرا سرچشمہ حدیث نبوی ہے۔ احادیث، سابقہ زمانے میں بھی اور دور حاضر میں بھی کافی بحث و نزاع کا موضوع رہی ہیں۔ زمانہ حال کے نقادوں ہیں، گولڈزیہر نے، جدید اصول تنقید کی روشنی میں ان کی کافی جانچ پڑتال کی ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ ذخیرہ بہ ہیئت مجموعی قابل اعتماد نہیں۔ ایک، دوسرا مغربی مصنف ان اصولوں کا جائزہ لینے کے بعد جن کے مطابق مسلمان ائمہ جرح و تعدیل نے احادیث کو پرکھا ہے کہتا ہے کہ نظریاتی طور پر ان میں غلطی کا امکان ہے۔ لیکن اس کے بعد لکھتا ہے کہ:۔

"آخر میں میں کہوں گا کہ جن خیالات کا اظہار اوپر کیا گیا ہے۔ ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اصولوں میں غلطی کا امکان نظری طور پر موجود ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب کہ حدیثوں کو اسطرح پرکھنے میں فی الواقعہ کس حد تک غلطیاں سرزد ہوئیں، اس بات پر منحصر ہے کہ جن حالات میں احادیث کی جانچ پڑتال ہوئی وہ کہاں تک اس کی ترغیب دلاتے تھے کہ غلطی کے امکان سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے حالات بہت کم تھے اور سنن کے ذخیرہ کا بہت کم حصہ ان سے متاثر ہوا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن احادیث کے مجموعوں کو مسلمان قانونی حیثیت دیتے ہیں، ان کا بڑا حصہ، اسلام کے آغاز اور ارتقاء کا صحیح ریکارڈ ہے۔"

لیکن مقصد زیر نظر کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان احادیث کو جن کی حیثیت قانونی ہے، ان احادیث سے جن کی قانونی حیثیت نہیں، الگ کر لیں۔ احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے

احادیث کی قانونی حیثیت

اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے

بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے علیٰ حالہ رکھا۔ اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرمادیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں پیغمبرؐ کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کردے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کرلیں۔ لہٰذا پیغمبرؐ کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطورِ خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائص کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسولؐ کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہوچکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ

اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے بعینہٖ شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو ان کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محدثین نے قانون کے متعلق مجرد فکر و قیاس کے مقابلہ میں ٹھوس واقعات (CONCRETE CASES) کو زیادہ اہمیت دینے سے شرعی قانون کی بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ علاوہ بریں، اگر احادیث کے لٹریچر کے غائر مطالعہ سے اس روح (سپرٹ) کے سمجھنے کا کام لیا جائے۔ جن کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی کی تعبیر فرمائی تھی تو اس سے یہ بھی سمجھ میں آجائیگا کہ قرآن نے قانون سازی کے لئے جو اصول دیئے ہیں، زندگی کے عملی میدان میں ان کی صحیح قدر و قیمت کیا ہے۔ اگر ان اصولوں کی حیاتی قدر (LIFE - VALUE) کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس سے، شرعی قانون سازی کے بنیادی اصولوں کی تعبیر نو میں بڑی مدد ملے گی۔ یہی ایک چیز ہے جو اس باب میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

۳۔ اجماع

قانونِ شریعت کا تیسرا سرچشمہ اجماع[1] ہے جو میرے نزدیک اسلام میں سب سے اہم قانونی تصور ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس اہم قانونی تصور کے متعلق نظری بحثیں تو اس قدر ہوئیں۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال رہا اور مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی ایک مستقل عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفۂ چہارم کے بعد مسلمانوں میں جو ملوکیت آگئی تو اس نے سمجھ لیا کہ اجماع کو ایک قانونی حیثیت دینے سے اس کے سیاسی مفاد پر زد پڑے گی۔ میرا خیال

---

[1] علامہ اقبالؒ نے اس پوری بحث میں اجماع سے مراد اسلام کا مشاورتی نظام لیا ہے نہ کہ فقہا کا مصطلحہ اجماع۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اس بحث کو دیکھنا چاہیئے۔

ہے کہ بنی اُمیہ اور عباسی خلفاء نے اپنا مفاد اسی میں سمجھا کہ بجائے اس کے کہ افرادِ ملت (کے نمائندگان) کی ایک مستقل مجلسِ مشاورت (اسمبلی) متشکل کی جائے، جس سے وہ اتنا اقتدار حاصل کر لے کہ اُن (سلاطین کے لئے) دردِ سر بن جائے، مجتہدین کو انفرادی اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔ لیکن اب یہ دیکھ کر بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ زمانہ کے جدید تقاضوں اور اقوامِ مغرب کے سیاسی تجربے دورِ حاضر کے مسلمانوں کو اجماع کی قدر و قیمت اور امکان کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان ممالک میں روحِ جمہوریت کی بیداری اور رفتہ رفتہ مجالسِ قانون ساز کی تشکیل ایک نیک فال اور ترقی کی جانب صحیح اقدام ہے۔ دورِ حاضر میں جبکہ اُمّت میں متعدد جماعتیں اور پارٹیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اجماع کی ممکن شکل یہی ہے کہ مذاہبِ فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حقِ اجتہاد چھین کر، اُسے مسلمانوں کی مجلسِ قانون ساز کو تفویض کر دیا جائے۔ اس سے، دیگر مفاد کے علاوہ، ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ، قانونی مباحث میں وہ غیر فنی اربابِ بصیرت

اجماع کی صحیح شکل

بھی حصہ لے سکیں گے جنہیں فنی نکات آفرینیوں کے مقابلہ میں، معاملات کی (عملی) سمجھ بوجھ کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظامِ قانون کو جمود و تعطل کے پنجہ سے نجات دلا کر اس میں خونِ زندگی دوڑا سکتے اور اسے پھر سے ایک ارتقائی اندازِ نظر عطا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طریقِ کار کے اختیار کرنے میں، ہندوستان میں دشواریاں پیدا ہونگی۔ اس لئے کہ یہ امر مشتبہ ہے کہ ایک غیر مسلم اسمبلی کو اجتہاد کا اختیار دیا جا سکتا ہے؎

قرآن اور اجماع

اجماع کے ضمن میں ایک دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دیا جانا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا اجماعِ اُمت (جمہور کا فیصلہ) قرآنی احکام کو منسوخ کر سکتا ہے؟ مسلمانوں کے مجمع میں اس سوال کا اُٹھانا یکسر غیر ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس حقیقت سے باخبر ہے کہ قرآنی احکام کو کوئی بھی منسوخ نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اس سوال کو اس لئے سامنے لانا پڑا ہے کہ (MOHAMMEDAN THEORIES OF FINANCE) کے مغربی مصنف نے اپنی اس کتاب میں بڑی گمراہ کن بات لکھ دی ہے۔ اس نے بغیر کسی حوالہ اور سند کے لکھ دیا ہے کہ بعض حنفی اور معتزلہ مصنفین کے نزدیک اجماع، قرآن کو منسوخ کر سکتا ہے۔ سارے اسلامی

؎ تشکیلِ پاکستان کے بعد یہ دشواری خود بخود دور ہو گئی تھی۔

لٹریچر میں اس بات کے جواز و تائید میں کوئی چیز نہیں ملتی ۔ (اجماعِ اُمّت تو ایک طرف، قرآن کو تو رسول اللہ کی کوئی حدیث بھی منسوخ نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اس مغربی مصنّف کو جس بات نے مغالطہ میں ڈالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے متقدّمین نے اپنی تحریروں میں نسخ کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ امام شاطبی نے الموافقات (جلد سوم ۔ ص۶۵) میں لکھا ہے، صحابہؓ کے اجماع کے سلسلہ میں جب نسخ کا لفظ آئے تو اس سے مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآن کے فلاں حکم کو فلاں حد تک نافذ کیا یا اسے فلاں دائرہ تک محدود رکھا (یعنی احکام قرآنی کی تقیید و تعمیم)[1]۔ اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر دیا یا اس کی جگہ کوئی دوسرا حکم نافذ کر دیا۔ اس تحدید و توسیع کے سلسلہ میں بھی بقول آمدی نظریۂ قانون یہ ہے کہ صحابہؓ کے پاس اس کے لئے کوئی نہ کوئی حکم شریعت ضرور ہوگا[2] ۔ (آمدی شافعیؒ امام فقہ ہیں جن کی وفات ساتویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی اور حال ہی میں مصر سے ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں) ۔

صحابہؓ کے فیصلوں کی حیثیت

لیکن فرض کیجئے کہ کسی معاملہ میں صحابہؓ نے بالاتفاق ایک فیصلہ کیا تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنے والی نسلیں بھی اس فیصلہ کی پابند رہیں گی ؟ امام شوکانی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف مذاہب فقہ کے ائمہ کی آرا بھی نقل کی ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ اس باب میں ضروری ہے کہ ان امور میں جن کا تعلق واقعات (FACTS) سے ہے اور اُن میں جن کا تعلق قانون سے ہے ۔ فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ جن امُور کا تعلق (عہد رسالتؐ یا زمانۂ صحابہؓ کے) واقعات و حوادث سے ہے، اُن میں صحابہؓ کا فیصلہ قول فیصل ہوگا۔ اس لئے کہ اس زمانے کے واقعات کا علم صحابہؓ سے زیادہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اس واقعہ کو لیجئے جس میں یہ سوال اٹھا کہ کیا قرآن کی وہ صورتیں جنہیں معوذتین کہا جاتا ہے ، قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں اور صحابہؓ کی متفقہ

---

[1] مثلاً حضرت عمرؓ نے جنگ کے دوران حد نافذ کرنے کو ملتوی کر دیا تھا۔ یا قحط کے زمانے میں ان لوگوں کو چوری کی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک کی وجہ سے غلّہ کی چوری کی تھی ۔

[2] یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ صحابہؓ کے پاس "حکم شرعی" ہونے سے کیا مراد ہے ۔ انہوں نے قرآن کی تعلیم سے ایسا استنباط کیا ہوگا۔ اور ایسا استنباط ہو سکتا ہے ۔ ان کا ایسا فیصلہ (جو قرآن کے اصولوں کے اندر ہو)، خود حکم شرعی کی حیثیت رکھتا تھا ۔

طور پر فیصلہ کیا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں۔ لیکن جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن کی حیثیت قانونی ہے، ان کی بابت میری ناچیز رائے یہ ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں صحابہؓ کے فیصلوں کی پابند نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس میں سوال (قرآن کے کسی اصولی حکم کی) تعبیر کا ہے۔ چنانچہ امام کرخی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سنتِ صحابہؓ صرف ان معاملات میں واجب الاتباع ہے جن کا فیصلہ قیاس سے نہیں کیا جاسکتا۔ جن معاملات کا فیصلہ (اجتہاد) قیاس سے کیا جاسکتا ہے ان میں اُن کی سُنت کی تقلید لازم نہیں۔"

اس ضمن میں ایک اور سوال پوچھا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بحالاتِ موجودہ مسلمانوں کی جو مجالس قوانین ساز بنائی جائیں گی ان میں لامحالہ ایسے لوگ آجائیں گے جو قانونِ شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں گے۔

ہماری مجالس قانون ساز

ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجالس سے قانونِ شریعت کی تعبیرات میں غلطیاں سرزد ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے سدِّ باب، یا ان کے مواقع کو کم کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ (اس سلسلہ میں) ایران نے اپنے ۱۹۰۶ء کے دستورِ مملکت کی رُو سے، ایسے علماء کی "جو امورِ دنیا سے باخبر ہوں" ایک کمیٹی مقرر کی تھی تاکہ وہ مجلسِ قانون ساز کے کام کی نگرانی کرے۔ یہ تدبیر بڑی خطرناک تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے ایران کے نظریۂ دستور کے حالاتِ خصوصی کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ ان کا نظریۂ دستور یہ ہے کہ مملکت درحقیقت امام غائب کی ملک ہے اور بادشاہ صرف اس کا محافظ ہے۔ علمائے مذہب، بہ حیثیت نمائندگانِ امام غائب اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ مِلّت کی زندگی کے ہر گوشے کے محاسب و نگراں ہوں۔ اگرچہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب امام غائب کی جانشینی کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو ان علماء کے حقِ نیابت کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ بہرحال ایران کا نظریۂ دستور کچھ ہی ہو، یہ تدبیر خطرات سے خالی نہیں[1]۔ اگر کوئی سُنی مملکت اس تدبیر کو آزمائشی طور پر اختیار کرنا چاہے۔ تو وہ اسے عارضی طور پر آزما کر دیکھ لے۔ وہ بھی اس طرح کہ علماء کو

---

[1] ہمارے نومسلم مصنف اسد لیوپولڈ نے اپنے مسودۂ دستورِ پاکستان میں اس قسم کی مجلس علماء کی تجویز پیش کی تھی۔ جس کی طلوعِ اسلام نے مخالفت کی تھی۔ نیز پہلی مجلسِ دستور ساز کی کمیٹی نے بھی کچھ اس قسم کی تجویز کی تھی جو منظور نہیں کی گئی تھی بعد کے دساتیرِ پاکستان میں اس قسم کی کوئی شق نہیں رکھی گئی۔

مجلس قانون ساز کا رکن بنا دیا جائے تاکہ وہ قوانینِ شریعت پر آزادانہ بحث و تحقیق[1] میں دوسروں کی معاونت اور راہنمائی کریں۔ احکامِ شریعت میں غلطیوں کے سدِ باب کا مؤثر طریق ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان ممالک میں قانونی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی اصلاح کی جائے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے اور جدید اصول قانون سازی کو طلباء کے درس کا لازمی جزو قرار دیا جائے۔

۴. قیاس

فقہ کا چوتھا بنیادی مأخذ قیاس ہے۔ یعنی کسی ایک حکم یا فیصلہ کو، عقل و بصیرت کی رُو سے، اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ (عہدِ رسالت مآبؐ کے بعد) جو ممالک اسلامی فتوحات کے دائرے میں آئے۔ ان میں معاشرتی اور زرعی حالات عربوں سے، بالکل مختلف تھے۔ ان معاملات کی نزاعات کے تصفیہ کے لئے، اُن نظائر سے کچھ مدد نہیں مل سکتی تھی جو احادیث کے مجموعوں میں مندرج تھے۔ اس دشواری کے پیشِ نظر، مذہبِ حنفی کے لئے اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ وہ قانونی تعبیرات میں قیاس اور رائے سے کام لیں۔ عراق میں جو نئے حالات سامنے آئے ان کے پیشِ نظر انہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر قانون سازی میں ارسطوی منطق سے کام لیا جائے تو کامیابی ہو سکتی ہے۔

ارسطوی منطق

لیکن قانونِ شریعت کی تدوین کے ابتدائی مراحل میں یہ طریقِ کار بہت نقصان رساں تھا۔ ارسطوی منطق کے معنی یہ ہیں کہ عام اصولوں سے، ایسے قواعد و ضوابط مستنبط کئے جائیں جن میں کہیں لوچ اور لچک نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ طرق و اعمالِ حیات کچھ ایسے پیچیدہ واقع ہوئے ہیں کہ اسے اس قسم کے سخت قواعد و ضوابط کے شکنجے میں کسا نہیں جا سکتا۔ لیکن اگر زندگی کو ارسطو کی منطق کی عینک سے دیکھا جائے تو وہ ایک مشین محض دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی داخلی اصولِ حرکت کارفرما نہیں۔ مذہبِ حنفیہ کے آئمہ نے حیات کی تخلیقی آزادی اور خود ارادی کو نظر انداز کر دیا۔ اس سے انہیں اُمید بندھتی تھی کہ خالص منطق کی بنیادوں پر ایک مکمل ضابطۂ قوانین کی تشکیل کی جا سکے گی۔ یہ طریقِ کار فقہائے حجاز کے فطری میلان کے خلاف تھا (عربی فطرت اس قسم کی جامد یا ایسی جکڑ بندیوں کو قبول ہی نہیں کر سکتی تھی)۔ چنانچہ انہوں نے فقہائے عراق کی اس قسم کی قانونی موشگافیوں کے۔ اور ان کے اس رجحان کے خلاف کہ محض قیاسی اور فرضی مقدمات کو سامنے

---

[1] وہ آزادانہ بحث و تحقیق کی اجازت کب دیں گے؟

رکھ کر، قانون بناتے چلے جائیں، صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ سمجھتے تھے اور بجا طور سمجھتے تھے کہ اسطرح اسلام کا قانون ایک بے جان مشین ہو کر رہ جائے گا۔ ان آئمہ فقہ کی اس قسم کی باہمی نزاعات سے یہ بحثیں چھڑ گئیں کہ قیاس کے حدود کیا ہیں۔ کن حالات میں قیاس جائز ہے۔ غلط قیاس کی تصحیح کس طرح کی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان بحثوں کی ضرورت اس لئے بھی لاحق ہو گئی کہ شرع میں قیاس کے متعلق صرف اتنا ہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک مجتہد کی ذاتی رائے کا نام ہے۔ لیکن آخر الامر یہی چیز قانونِ اسلام میں سرچشمہ حیات وعمل بن گئی۔ آریائی ذہنیت ورجحانِ طبع یہ ہے کہ انسان تصورات کی خیالی دنیا میں مگن رہے اور یہ واقعات وممکنات کی دنیا سے کم دلچسپی لے۔ یہ ذہنیت زندگی کے عملی مسائل کے مقابلہ میں نظری مسائل کے متعلق بحث وتحیص سے زیادہ لذت اندوز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، سامی رجحانِ طبع دنیا کے واقعات سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور تصورات کی بجائے ٹھوس حقائق پر قابو پانا چاہتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے اس مسلک پر کہ قیاس، قانون کا مآخذ ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی کڑی تنقید، آریائی ذہنیت پر سامی احتسابؒ ہے۔ بالفاظ دیگر، یہ ایک نزاع تھی قانون کی تحقیق میں، استقرائی اور استخراجی اسلوب کے حامیوں کے درمیان، شرع میں، فقہائے عراق، تصور کی ابدیت پر زیادہ زور دیتے رہے۔ ان کے برعکس حجاز کے فقہار نے اس کے زمانی 'TEMPORAL' پہلو پر زور دیا لیکن انہوں نے اپنی پوزیشن کی اہمیت کا کماحقہٗ احساس نہ کیا۔ وہ چونکہ حجاز کے رہنے والے تھے اس لئے طبعی طور پر وہ حجاز کے قانونی روایات کے طرفدار ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا۔ اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اسی قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے

لہ امام ابوحنیفہؒ کا تعلق آریہ نسل سے تھا اور امام مالکؒ اور شافعیؒ سامی النسل تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس میں افرادِ متعلقہ کے ذاتی رجحان کے بجائے حالات کے تقاضے زیادہ ذمہ دار تھے۔ جیسا کہ خود علامہؒ نے آگے چل کر بیان کیا ہے۔

شاذونادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقید یں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اورنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتب فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا۔ اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ و تشریع کے مقابلے میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح، امام ابوحنیفہؒ کے ناقدین نے، ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

اس مکتب فقہ کا خاص الخاص اصول۔ قیاس۔ بشرطیکہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ امام شافعیؒ کے الفاظ میں اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے جس سے وحی کی چار دیواری کے اندر، پوری پوری آزادی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ایک اصولِ قانون کی حیثیت سے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ۔ جیسا کہ بعض علماء بالخصوص قاضی شوکانی نے لکھا ہے، خود نبی اکرمؐ کی زندگی میں بھی اس کی اجازت تھی۔ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افتریٰ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متأخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتریٰ" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا ذاتی فعل ہے دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا، یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:۔

"اگر اس افتریٰ کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متأخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متأخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے حقیقت

یہ ہے کہ اب قرآن اور سنّت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہ تھا")

مجھے امید ہے کہ ان مختصر تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ہمارے نظامِ قانون کے نہ اساسی اصولوں میں اور نہ ہی ان کے اوپر اٹھی ہوئی موجودہ عمارت میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمارے موجودہ طرزِ عمل کے لئے وجہِ جواز بن سکے (جس کے مطابق سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں) بنا بریں

جرأت کی ضرورت ہے

دنیائے اسلام کو چاہیئے کہ وہ جرأت و بسالت سے کام لے اور فکرِ عمیق اور تجربات جدید کی روشنی میں نظامِ شریعت کی تشکیلِ نو کے اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اس سلسلہ میں اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تشکیل جدید کے معنی صرف اسی قدر نہیں کہ زمانہ کے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کر لی جائے۔ اس کا ایک گوشہ اس سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم (پہلی جنگِ عظیم) اپنے پیچھے دو اہم اثرات چھوڑ گئی ہے۔ ایک ترکی کی بیداری — جس کے متعلق ایک فرانسیسی مصنف نے کہا ہے کہ وہ دنیائے اسلام میں ثبات و استحکام کا عنصر ہے — اور دوسرے وہ معاشی تجربہ جو مسلم ایشیا کے پہلو (روس) میں ہو رہا ہے۔ یہ وہ کوائف ہیں جن سے ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ اسلام کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ اور وہ انسانیت کو کس منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ آج عالم انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

عالمِ انسانیت کے تقاضے

(۱) کائنات کی روحانی تعبیر

(۲) فرد کی روحانی آزادی اور

(۳) عالمگیر اصول اساسی جو انسانیت کو روحانی بنیادوں پر نشو و ارتقاء کے راستے پر ڈال دیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جدید یورپ نے ان بنیادوں پر چند تصوراتی نظام قائم کئے ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جن صداقتوں کو محض عقل کی رو سے دریافت کیا جاتا ہے ان سے (قلبِ انسانیت میں) زندہ و پائندہ ایمان کا وہ شعلہ کبھی بیدار نہیں ہوتا جو وحی نبوت کی رو سے ظہور میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محض عقل، لوگوں کو بہت کم متأثر کر سکی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مذہب نے ہمیشہ افراد کو بھی بلندیاں عطا کی ہیں اور پورے کے پورے

معاشرے میں بھی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یورپ کی تصوریت (جسے اس نے خالص عقل کی رُو سے قائم کیا ہے) اس کی زندگی میں کبھی ایک زندہ عنصر نہیں بن سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں ایک بدنہاد اور مسخ شدہ انانیت (PERVERTED EGO) ان جمہوریتوں کے پیکر میں نمودار ہوگئی ہے جو باہمدگر متصادم ہیں اور جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دولت مندوں کی عیش سامانیوں کی خاطر غریبوں کو لوٹا کھسوٹا جائے۔ یقین مانیئے! انسانیت کی اخلاقی ترقی کے راستے میں آج سب سے بڑی رکاوٹ یورپ ہے۔ اس کے برعکس، مسلمانوں کے پاس وحی کے نصدق، وہ بنیادی تصورات موجود ہیں (جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور جن کی آج انسانیت کو اس قدر ضرورت ہے) وحی کا سرچشمہ اعماقِ حیات ہے۔ اس کے حروف والفاظ کے لباس میں اس کی اہم حقیقتیں مستور ہیں۔ اس میں الفاظ و معانی میں وہی اختلاط ہے۔ ؎

جس طرح اخگر قباپوش اپنی خاکستر سے ہے

زندگی کی روحانی بنیاد مسلمان کا ایمان ہے۔ ایسا ایمان جس کی خاطر، ہم میں سے کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بھی بلا توقف و تامل، اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئیے پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائی قبل از اسلام کی رُوحانی غلامی سے (ابھی ابھی) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہئیے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیل جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

ختم شد

(ختم)

لہ یعنی ہم صرف ان غیر متبدل اصولوں کے پابند ہیں جو خدا نے آخری بار قرآن میں متعین کر دیتے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر طرح سے آزاد ہیں کہ زندگی کے نئے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرہ میں مناسب تغیر و تبدل کرتے رہیں۔ نیز ان معنوں میں آزاد کہ اب کوئی شخص ہم سے آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ خدا نے میری معرفت تمہارے لئے یہ احکام بھیجے ہیں۔ تم ان کی اطاعت کرو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بتقریب یوم اقبالؒ

اپریل ۱۹۸۰ء

اقبالؒ اور کمیونزم

ہمارے ہاں چونکہ نہ تحریک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ہے۔ نہ قائدِ اعظمؒ یا علامہ اقبالؒ کے قابلِ اعتماد سوانح حیات۔ اس لئے فتنہ گروں کے لئے، الزام تراشیوں اور تہمت بافیوں کی فضا بڑی سازگار ہے۔ کبھی کہہ دیا جاتا ہے کہ تقسیم ہند کی اسکیم دراصل انگریز کی تخلیق تھی اور قائدِ اعظمؒ برطانیہ کے آلۂ کار تھے۔ کبھی آواز اٹھتی ہے کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے (اور اب تو خیر سے ایک بزرگوار نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی شائع کردی ہے... یاللعجب) دوسری طرف، علامہ اقبالؒ کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا یہ آواز اٹھی کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا۔ طلوعِ اسلام نے اس کی بھرپور تردید کی تو یہ چنگاری خاموش ہوگئی لیکن معلوم ہوا کہ یہ دب گئی تھی، بجھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ اب جو حادثۂ افغانستان کے سلسلہ میں کمیونسٹوں نے کروٹ لی ہے تو یہی فتنہ پھر بیدار کیا جارہا ہے۔ یعنی یہ افواہ پھیلائی جارہی ہے کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا۔ علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو اس الزام کی تردید خود فرما دیتے۔ لیکن اب اس فریضہ کی ادائیگی طلوعِ اسلام کے ذمہ ہے جو نکہ اقبالؒ کا پیغامبر ہے۔ ان سطور کا محرک بھی جذبہ ہے۔ اقبالؒ کو کمیونسٹ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ اقبالؒ درحقیقت ہندو تھا اور اس کا... اصلی نام اقبالؒ چند تھا! ویسے کسی کو کمیونسٹ کہہ دینا آسان بھی بڑا ہے۔ جہاں کسی نے کہا کہ ملک میں کوئی بھوکا نہیں رہنا چاہیئے۔ مشہور کر دیا کہ وہ کمیونسٹ ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ خود طلوعِ اسلام کے خلاف بھی یہ فتویٰ صادر کیا گیا کہ یہ کمیونسٹ ہے کیونکہ یہ کہتا ہے کہ قرآن کریم نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ بہرحال سرِدست بات اقبالؒ اور کمیونزم کی ہورہی ہے اس لئے ہم اپنے رشحاتِ قلم کو یہیں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ کمیونزم (یا اس کا قدمِ اول، سوشلزم) ایک معاشی نظام ہی نہیں بلکہ ایک فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات ہے۔ جس کی بنیادوں پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اس کا فلسفۂ حیات، اسلام کے نظریۂ زندگی کی ضد ہے۔ اسی طرح جیسے دہریت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کمیونسٹ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فلسفۂ حیات کو تسلیم کیا جائے، اور اسے تسلیم کرنے کے بعد اسلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ یہ وجہ ہے کہ جو ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی مسلمان کمیونسٹ یعنی کوئی شخص بیک وقت مسلمان اور کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔ جو ایسا دعویٰ کرتا ہے (کہ وہ مسلمان بھی ہے اور کمیونسٹ بھی) وہ جاہل ہے یا منافق۔

البتہ جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے وہ قرآنِ حکیم کے معاشی نظام سے ایک حد تک ملتا جلتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جس حد تک کمیونزم یا سوشلزم جا سکی ہے۔ قرآن اس سے کہیں آگے جاتا ہے۔۔۔۔ (پرویز صاحب کے ایک خطاب کا عنوان ہی یہ تھا۔ جہاں مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے!) یہ ہے ان دونوں نظاموں میں وہ جزوی مماثلت جس سے سطح بین مسلمان دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسلام اور کمیونزم کو ایک دوسرے کا حلیف سمجھنے لگتے ہیں۔ یا جس سے فائدہ اٹھا کر، کمیونسٹ، مسلمانوں کو دھوکا دینے میں (بعض اوقات) کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اقبالؒ کو کمیونسٹ ثابت کرنے میں اس حربے سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ جس طرح اسلام کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کمیونزم (یا سوشلزم) کے معاشی نظام کو اس کے نظریۂ زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح مسلمان ہونے کے لئے سب سے پہلے، اسلام کے فلسفۂ حیات پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح کمیونسٹ ہونے کے لئے کمیونزم کے نظریۂ زندگی کا ماننا لاینفک ہے اور جس طرح کوئی شخص محض اسلام کے معاشی نظام کو، صحیح سمجھ کر مسلمان نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی شخص، محض کمیونزم کے معاشی نظام کو تسلیم کرنے سے کمیونسٹ نہیں کہلا سکتا۔ اسلام اور کمیونزم دونوں میں، ان کے معاشی نظام کو ان کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کمیونزم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس کے فلسفۂ حیات کا سمجھنا ضروری ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، کمیونزم کا بانی کارل مارکس تھا۔ وہ محض ایک ماہر معاشیات نہیں تھا، اس کا شمار فلاسفرز کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا اور پھر، اس فلسفہ کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے۔ لہٰذا، کمیونزم یا سوشلزم

سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔ مارکس کے فلسفۂ حیات کی رُو سے انسان کی زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے اور اس سے متعلق مسائل مادی۔ اس تصورِ حیات کے مطابق، نہ خدا کا وجود باقی رہتا ہے نہ وحی کا۔ جب وحی کا وجود باقی نہ رہے تو نہ جنّت کا تصوّر باقی رہتا ہے، نہ اس کی وساطت سے عطا کردہ مستقل اقدار کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد، حیاتِ اخروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے (مسئلہ زیرِ نظر کی حد تک) مارکس کے فلسفۂ حیات کا ملخّص۔

جہاں تک معاشی نظام کا تعلّق ہے۔ مارکس کے نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ :-

۱۔ نظامِ سرمایہ داری کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے گا جو اس نظام (سرمایہ داری) کی ضد ہوگا۔

۲۔ اس (جدید) نظام میں، ذرائع پیداوار، افراد کی ذاتی ملکیّت کے بجائے، محنت کشوں کی مشترکہ ملکیّت (یا تحویل) میں رہیں گے۔

۳۔ فاضلہ دولت، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کسی کے پاس نہیں رہے گی۔

۴۔ جب فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی تو دولت کی بنیاد پر، دوسروں کی محنت کو غصب کر کے، مزید دولت کمانے کا سوال باقی نہیں رہے گا۔ نہ ذاتی جائیدادیں کھڑی کی جاسکیں گی۔ نہ انفرادی کارخانے لگائے جاسکیں گے، نہ سودی کاروبار ہو سکے گا، نہ یہ صورت پیدا ہو سکے گی کہ :-

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد!
دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ مارکس کے پیش کردہ فلسفۂ حیات کا کبھی مؤید نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا فلسفۂ حیات اور مارکسی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اب رہا معاشی نظام۔ سو اگر اسلام کا مفہوم غیر متعیّن رکھا جائے تو پھر مارکسی نظام، خلافِ اسلام بھی ہو سکتا ہے اور مطابقِ اسلام بھی۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کے لئے قرآن کریم کو حرفِ آخر قرار دے لیا جائے تو اس حقیقت کے اثبات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآنِ کریم نظامِ سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے اور اشتراکی نظام کسی حد تک قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔

آیئے، ہم دیکھیں کہ اقبالؒ اس باب میں کیا کہتا ہے؟

اقبالؒ کا قلب درد آگیں

اقبالؒ نے اپنے سینے میں ایک درد آگیں قلب پایا تھا جو مفلسوں اور ناداروں، محنت کشوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بن کر اس کے چشم گریاں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سب سے پہلی (نثری) کتاب "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں، اصول مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرّہ کے تجربہ اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری و باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوئ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدّنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلّم اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدّنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیام تمدّن کے لئے ایک ضروری جزو ہے، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظّارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔

یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ اتنی سی عمر میں، اقبالؒ کے دل میں کس قسم کے سوالات ابھر رہے تھے —— یہ سوالات کہ

۱۔ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ ...... اور

۲۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والا نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے

ان سوالات میں "ہمیشہ کے لئے" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ اقبالؒ کی باقی زندگی (منجملہ دیگر امور) انہی سوالات کے اطمینان بخش جواب کی تلاش میں گذری۔ ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہمارے مروجہ مذہب کے معاشی نظام سے نہیں مل سکتا تھا، جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نظم عالم کے لئے مفلسی ایک جزو لازم ہے۔ کیونکہ اگر مفلسی نہ رہے تو دولتمند لوگ صدقہ و خیرات دے کر ثواب کیسے حاصل کر سکیں گے، اور مفلسی سے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہونی چاہئیں، کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو صدقہ و خیرات سے متعلق احکام شریعت معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

لیکن اقبالؒ نے ان سوالات کا جواب قرآن حکیم کے عالمگیر ابدی ضابطۂ حیات سے پالیا اور انہی جوابات کو وہ امت اور عالمگیر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سب سے پہلے انہیں قرآن کی دفتین سے

اقبالؒ اور نظام سرمایہ داری

یہ جواب ملا کہ مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب، نظام سرمایہ داری ہے۔ اور جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں، کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ ان صداؤں کا علاج، محتاجوں اور مفلسوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں، ان کا علاج، اس نظام کو بدل دینے میں ہے جو انہیں مفلس اور محتاج بناتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر، اقبالؒ نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں ——— جو ۱۹۲۲ء (۹) میں کہی گئی تھی ——— خضر سے سوال کرتے ہیں کہ ———

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور خضر کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ:-

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے!
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اسی زمانہ میں، ان کا فارسی مجموعۂ کلام، پیامِ مشرق، شائع ہوا۔ اس کے آخری باب ــــــ "نقشِ فرنگ" ــــــ کا بیشتر حصہ، محنت اور سرمایہ کے اہم موضوع کے لئے وقف ہے۔ یہ اشعار فارسی زبان میں ہیں۔ طلوعِ اسلام میں جب بھی فارسی کے اشعار درج کئے جاتے ہیں تو اکثر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان کا اُردو ترجمہ کر دیا جایا کرے کیونکہ اب فارسی بہت کم لوگ سمجھتے ہیں (بالخصوص ہماری نئی نسل کا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بے بہرہ ہوتا ہے ــــــ یہ طالبِ علم تو اب اُردو سمجھنے سے بھی قاصر ہوتے جا رہے ہیں) شعر کا ترجمہ نہ صرف اس کی شعریت ختم کر دیتا ہے بلکہ اس سے اس کی اثر انگیزی بھی باقی نہیں رہتی۔ اشعار کا مفہوم تو سمجھا یا جا سکتا ہے، ان کا ترجمہ انہیں بے روح بنا دیتا ہے۔ اس لئے ہم نے ایسے مطالبات کو پورا کرنے سے اکثر معذرت چاہی ہے۔

اور پیامِ مشرق کے یہ اشعار، نہ صرف یہ کہ ان کی زبان فارسی ہے بلکہ ان میں جو فلسفہ پیش کیا گیا ہے وہ بھی بڑا دقیق ہے اس لئے بھی ان کا ترجمہ مفیدِ مطلب نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں ہم انہیں علیٰ حالہٖ پیش کر دینے پر مجبور ہیں۔

اس کی تلافی علامہؒ کے اُردو کے وہ اشعار کر دیں گے جو بعد میں آئیں گے۔

پیامِ مشرق کے آخر میں "صحبتِ رفتگان" کے زیرِ عنوان، حضرت علامہ سب سے پہلے ٹالسٹائے کی زبان سے کہلواتے ہیں:۔

دارُوئے بیہوشی است، تاج، کلیسا، وطن
جانِ خداداد را خواجہ بجامے خرید

اور کارل مارکس کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ:۔

رازدانِ جزو و کل، از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری، قاتلِ آدم شد است

ٹالسٹائے، ہیگل کے فلسفۂ اضداد کو "عقلِ دورُو" کی تخلیق قرار دے کر، اس پر، ان الفاظ میں سخت تنقید

کرنا ہے کہ اس کی رُو سے وہ :-

درسِ رضا می دہد بندۂ مزدور را[1]

ایرانی تحریک کمیونزم کا بانی، مزدک، دورِ حاضر کی اضطراب انگیزیوں کو دیکھ کر، پکار اٹھتا ہے کہ

دانۂ ایران زکشتِ زار و قیصر بردمید   مرگِ نوی رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر

ملّتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل!

تا تہی گردد حرمہایش از خداوندانِ پیر

دورِ پرویزی گذشت، اے کشتۂ پرویز، خیز

نعمتِ گم گشتۂ خود راز خسرو باز گیر[2]

اس کے ساتھ ہی، مزدوروں کا نمائندہ، کوہکن (فرہاد) اس نغرِ قیامت خیز کے ساتھ سامنے آتا ہے :-

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است   ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است

بُرونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم   زبان او ز مسیح و دلش ز چنگیز است

اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد!   ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

زخاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست

قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

اس کے بعد ہمارے سامنے فرانسیسی فلاسفر، آگسٹس کومٹ اور مردِ مزدور کا مکالمہ آتا ہے۔ کومٹ، فلسفۂ مادیت کا علمبردار تھا اور طبقات کی تقسیم کو مطابقِ فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کے جواب میں، مردِ مزدور کہتا ہے :-

فریبی بہ حکمت مرا اے حکیم   کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم

مسِ خام را از زر اندودۂ ؟   مرا خوئے تسلیم فرمودۂ ؟

حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج   بہ پرویز پُرکار و نابردہ رنج ؟

جہاں راست بہروزی از دستِ مُزد   ندانی کہ ایں ہیچ کار است دُزد

---

[1] انسانوں کا خودساختہ مذہب، غریب کو تقدیرِ خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین سے درسِ رضا دیتا ہے۔

[2] ایران کے حالیہ انقلاب کی روشنی میں ان اشعار کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔

پئے جرمِ او بپوزش آوردہ ؟
بایں عقل و دانش فسوں خوردہ ؟

ازاں بعد، سرمایہ دار اور مزدور کا "قسمت نامہ" ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے، سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس میں تمہارا بھی حصّہ ہے اور میرا بھی۔ اس کی تقسیم یوں ہوگی کہ :-

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو !
نخلے کہ شہ خراج برومی نہد ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابہ کہ دردِ سر آرد، از آنِ من — صہبائے پاکِ آدم و حوا از آنِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من
وز خاک تا بعرشِ معلیٰ از آنِ تو

اور پھر مزدور کی یہ دل خراش صدائے دردناک ہمارے کانوں میں آتی ہے :-

ز مزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
ز خوئے فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی — ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستام[1] امیر
ز خونِ من چو زلو[2] فربہی کلیسا را — بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر
خرابہ رشکِ گلستاں ز گریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اور اس کا ردِ عمل :-

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز — مئے کہ شیشہ گداز د بساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم — بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

---

۱ گھوڑے کی زین ۲ زلو۔ جونک

بطوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے

زخویش این ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا اس حقیقت کو سامنے لائیے کہ یہ اشعار ۱۹۲۳ء سے پہلے کہے گئے ہیں۔ اس کے بعد نظام سرمایہ داری اور محنت کشوں میں جو کش مکش ہوئی ہے اور دنیا کے معاشی نظام میں جس قدر انقلابات آئے ہیں، ان اشعار میں ان کی کس طرح پیش گوئی کی گئی ہے۔ اسے کہتے ہیں فراست مردِ مومن! ——— حضرت علامہؒ نے سچ کہا تھا کہ :-

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس میں ایک نکتہ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ انہوں نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے۔ یعنی ان کی فکر ——— کشف و الہام نہیں کہا۔ جس کے دعویدار "مامور من اللہ" بن جاتے ہیں۔

اب آگے چلئے۔ زبورِ عجم میں یہ حشر بداماں پیغامِ انقلاب ہمارے سامنے آتا ہے :-

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب! (زبور صـ ۱۳۴)

——— (o) ———

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت، اسی روحِ انقلاب کا طنزیہ نشتر ہے۔ وہ خدائے کائنات کو مخاطب کر کے شکوہ سنج ہیں کہ :-

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی (صـ ۱۴۸)

اور یہی وہ "عرش کے کنگورے ہلا دینے والا" احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ

اس انسانیت کش نظام کو اُلٹنے کے لئے

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو (ص ۱۴۹)

یہی بات ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ:-

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو (ص ۱۷۶)

اس لئے کہ

کثرتِ نعمت گداز از دل برد — ناز می آرد نیاز از دل برد!

سالہا اندر جہاں گردیدہ ام
نم بچشمِ منعماں کم دیدہ ام (جاوید نامہ)

بالِ جبریل میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ "لینن۔ خدا کے حضور" ! آپ غور کیجئے کہ خدا کا منکر لینن، خدا سے کیا شکایت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

اِک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں — حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

وہ بات کیا ہے جسے گوش گذار کرنے کی اس طرح اجازت مانگی گئی ہے؟ وہ بات وہی ہے جو ہر کمیونسٹ کے دل میں کھٹکتی رہتی ہے کہ:-

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟

اس "آدمِ خاکی" کے تو اور ہی خدا ہیں؟

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!

ان "خداوند سفیدانِ فرنگی" کے نظامِ سرمایہ داری کا یہ عالم ہے کہ:۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ:۔

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر — تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل — بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام — یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

اور اس کے بعد دیکھئے کہ وہ کس حسرت آمیز یا طنز آلود لہجہ میں کہتا ہے کہ:۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات! ص ۱۴۷

عصرِ حاضر کا علم و حکمت، تدبر و حکومت، کس طرح نظامِ سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں۔ اقبالؒ، مختلف مقامات پر، مختلف انداز سے اس کی وضاحت کرتا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ایک بڑی جامع نظم ہے جس کا نام ہے۔ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"۔ اس میں ابلیس کا ایک مشیر، مختلف نظام ہائے حکومت کا تجزیہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ:۔

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے — یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو — ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر (ص ۲۱۷)

دوسری جگہ اس حقیقت کو بڑے انوکھے اور نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک دوزخی خدا سے مناجات کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت — جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد

اور بارگاہِ باری تعالیٰ میں سجدۂ شکرانہ بجا لاتے ہوئے کہتا ہے:۔

اللہ ترا شکر ہے کہ یہ خطۂ پرسوز — سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

(ارمغان ص ۲۴۲)

علامہ دورِ حاضر کے طالب علم سے کہتے ہیں :۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے | قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
(ضربِ کلیم صہ ۸۲)

ارمغانِ حجاز میں وہ اُس سے کہتے ہیں :۔

مرا کافر کند اندیشۂ رزق | ترا کافر کند علم کتابی (صہ ۵۴)

جاوید نامہ میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر | سود خوار و والی و مُلّا و پیر

دوسرے مقام پہ ہے :۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری | اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار، غریبوں اور ناداروں کو جس اسلام کا سبق پڑھاتے ہیں، اقبالؒ اسے ابلیس کا پیدا کردہ فریب قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے :۔

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا | میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

لینن نے خدا سے پوچھا تھا کہ :۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ | دنیا ہے تری منتظرِ یومِ مکافات

اقبالؒ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اس میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مجھے تو نظر آرہا ہے کہ :۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا! | تماشا دکھا کر مداری گیا

لیکن وہ کہتے یہ ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری، کمیونزم یا سوشلزم کے ہاتھوں نہیں ٹوٹے گا، اس لئے کہ ان کا معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ یہ خود ناکام رہ جائے گا۔

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک | مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
(ارمغانِ حجاز صہ ۲۲۳)

اس نظام کا سفینہ، اسلام کے ہاتھوں ڈوبے گا جس کے نظام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ :۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے | نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں (" صہ ۲۲۵)

اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہے جس کے ہاتھوں نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ ہوگا۔

مثبت نظامِ معیشت

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے چاہئیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ نظریہ، قرآنی نظریۂ معیشت کا نقیض ہے اور البلیس ز فکر کی ایجاد، ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض کو) حاصل ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کا نظریہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ جاوید نامہ میں انہوں نے "محکماتِ عالمِ قرآنی" کے جو تین ستون بیان کئے ہیں، ان میں ایک ستون یہ ہے کہ :-

ارض ملکِ خدا است

اس عنوان کے تابع وہ لکھتے ہیں :-

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت   ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتہ از من پذیر   رزق و گور از وے بگیر اور امگیر!

باطن "الارض للہ" ظاہر است

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است   (صہ ۸۰)

آخری شعر میں اقبالؒ ایک عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔ ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ "الارض للہ" (یعنی ارض خدا کی ملکیت ہے)، کا اعتراف کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ محض نظری عقیدہ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ "الارض للہ" عقیدہ کی حد تک تو صحیح ہے۔ عملی نظام ایسا نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ "الارض للہ" کا نظری عقیدہ دیا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس کے مطابق معاشی نظام متشکل کیا جائے۔ اگر اس عقیدہ کو محض نظری طور پر مانا جائے۔ اور عملی نظام اس کے خلاف ہو تو یہ اسلام نہیں، کفر ہے۔

غور فرمائیے۔ اقبالؒ کس طرح مسئلہ ملکیتِ زمین کو کفر و ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں؟

آگے چل کر کہتے ہیں :-

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست   ایں "متاع" بندہ و ملکِ خداست   (صہ ۹)

اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

ایکہ می گوئی متاعِ ما ز ماست — مردِ ناداں ایں ہمہ مالک خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی ، بگو — چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوْا[1]
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد — من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست!
داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست (ص ۱۲۵)

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ :-

ملک یزداں را بہ یزداں باز دہ — تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز) میں ، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے :-

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمین!

"بالِ جبریل" میں اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں . نظم کا عنوان ہے :-

الارضُ لِلّٰہ!

وہ زمیندار کو (جو اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتا ہے) مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ :-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں ، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں . تیری نہیں میری نہیں[2]

جب یہ زمین ، تیرے آباء کی نہیں تھی تو اسے وراثت میں پاکر مالک بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا . اور جب یہ نہ تیری ہے نہ میری ، تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیسے کیا جا سکتا ہے ؟ یہ خدا کی ہے . اور قرآن کی رو سے جس چیز کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے . اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کھلی رہے گی ، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکے گی . جیسے اس نے کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ میرا گھر (بیتی) ہے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ اسے للنّاس بنایا گیا ہے . یعنی تمام نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے . اسی لئے وہ ـــــ

---

[1] وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا ۷/۸۵
[2] یہ اشعار ، قرآنی آیات ۶۳-۷۳/۵۶ کی تفسیر ہیں

سواءن العاکف فیہ والباد ہے۔ یعنی وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں طور پر کھلا۔ یہی حیثیت زمین کی ہے۔ وہ نوعِ انسانی کے لئے متاع (سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے۔ کسی کی ذاتی جائیداد نہیں۔

فاضلہ دولت

زمین سے آگے بڑھیئے تو نظامِ سرمایہ داری کی دوسری بنیاد فاضلہ دولت ..... (SURPLUS MONEY) ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کا فیصلہ صاف اور واضح ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۔ اے رسولؐ! یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت نوعِ انسان کی ربوبیت عامہ کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زائد جس قدر ہے، سب کی سب۔ اس فیصلہ نے فاضلہ دولت کا تصور ہی ختم کر دیا۔ قرآن کریم کے اسی فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ اقبالؒ جاوید نامہ میں کہتے ہیں :-

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ

ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب برپا ہوا تو اقبالؒ کی نگہِ ژرف بیں و دُور رس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمر دیکھا کہ وہ دُور قریب آرہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام وجہِ شادابیٔ عالم بن جائے گا۔ ضربِ کلیم کی یہ نظم (جس کا عنوان اشتراکیت ہے) اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ کہتے ہیں :-

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم

بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور ! فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار !

جب قرآن کی یہ مضمر حقیقت نمودار ہو گی تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ کیا ہو گا۔ اسے اقبالؒ نے جاوید نامہ میں، فلکِ مریخ پر: شہرِ مرغدین (دین کا گلستان) کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس میں :-

سخت کوش دہقاں چراغش روشن است | از نہاب دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاع آبجوست | حاصلش بے شرکت غیرے از اوست (صـ۱۲۱)

اور

نے بہ بازاراں زبیکاراں خروش | نے صداہائے گدایاں در دگوش

اقبالؒ اپنی ۱۹۰۳ء کی آرزو کو (جس کا ذکر شروع میں ہو چکا ہے) قرآنی نظام کی اس آئیڈیل دنیا میں پورا ہوتے دیکھتا ہے جہاں کیفیت یہ ہے کہ:-

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا۔ حاکم و محکوم نیست (صـ۱۲۰)

اسی کو وہ دین کا ماحصل قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ:-

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس!
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس (پس چہ باید کرد صـ۱۳)

اقبالؒ نے جو کچھ نظام سرمایہ داری کے خلاف کہا ہے، مارکسزم کے حامی اسی کی سند سے اسے (اقبالؒ کو) کمیونسٹ ثابت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی غلط نگہی یا فریب انگیزی ہے۔ یہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظام یا پیغام کا آدھا حصہ ہے۔ اس کے ساتھ اس کا باقی نصف حصہ ملانے سے پیغامِ اقبالؒ کا صحیح تصور سامنے آسکتا ہے۔ علامہ نے (جاوید نامہ میں) اس غلط نگہی یا فریب کاری کی بڑے لطیف انداز میں پردہ دری کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کے ادھورے مطالعہ سے ابوجہل نے بھی یہی کہا تھا کہ جو کچھ رسول (نبی اکرمؐ) مساوات کے نام سے پیش کر رہا ہے، یہ درحقیقت مزدکیت سے مستعار لیا ہوا نظریہ ہے جسے سلمانؓ اپنے ساتھ فارس سے لایا ہے۔ اور یہاں اسے اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ:-

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است | خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

(جاوید نامہ۔ نوحۂ ابوجہل۔ صـ۵۹)

اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ علامہ اقبالؒ نے (قرآن کریم کی روشنی میں) کمیونزم یا اشتراکیت کے متعلق کیا کہا ہے۔ اس سے کمیونسٹوں کی مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

کمیونزم کی مخالفت

جب ۱۹۱۷ء میں روس میں کمیونزم کا سیلاب اُمڈا تو اس نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ انقلاب تھا بھی بڑا زلزلہ انگیز۔ سطح بیں نگاہوں نے اسے محض ایک معاشی نظام سمجھا اور نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ جس انقلاب کا دعویٰ ہو کہ وہ ہر نظامِ کہن کی بساط اُلٹ کر ایک جدید نظام دنیا پہ مسلط کرے گا جس سے غریبوں اور محتاجوں کی دردناک صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں گی۔ اس کا گہری نظروں سے جائزہ اقبالؒ نہ لیتا تو اور کون لیتا؟ انہوں نے جب اس فلسفۂ حیات پر نگاہ ڈالی جس کی بنیادوں پر اس عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا مقصود تھا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے اپنے ان تأثرات کو (اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں) ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ	لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ

انہوں نے کہا کہ یہ منفیانہ فلسفۂ انسانی زندگی کی اساس نہیں بن سکتا۔ زندگی مثبت بنیادوں پہ ہی قائم رہ سکتی ہے:-

در مقامِ لا نیاساید حیات	سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا برگ و سازِ اُمتاں	نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں

زندگی خلا میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ خلا کو پر کرنے کے لئے تعمیری اقدار مہیا نہیں کریں گے تو تخریبی قوتیں وہاں اپنا ڈیرہ جما لیں گی۔ مشہور مغربی فلاسفر پیسکالی نے لکھا ہے:-

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دلکش ہو جائے تو برے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطے کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔" (انسان نے کیا سوچا؟ صفحہ ۳۳۹)

اقبالؒ نے کہا کہ لاسلاطین اور لاکلیسا کی حد تک تو بات ٹھیک ہے کہ یہ دونوں قوتیں تخریبی ہیں۔ اور انسانیت کی بلندی کے راستے میں بری طرح حائل۔ اس لئے ان کا مٹانا ضروری ہے۔ لیکن اگر الٰہ حقیقی کا بھی انکار کر دیا جائے تو اس سے مستقل اقدارِ خداوندی کا انکار لازم آجاتا ہے اور جب انسانی زندگی میں اقدار کی کارفرمائی نہ رہے تو پھر انسان حیوانوں کی سطح پر آجاتا ہے جس میں "روٹی" کے سوا کوئی مقصدِ حیات نہیں رہتا۔ اقبالؒ نے اس ضمن میں کہا کہ:-

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس ! بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است بیخِ او در دل، نہ در آب و گل است (جاوید نامہ ۶۹)

طبیعی (یا حیوانی زندگی) کی مساوات کچھ معنی نہیں رکھتی۔ طبیعی زندگی کی ضروریات کا پورا ہونا بے شک لازمی ہے لیکن حقیقی مساوات شرف و تکریمِ انسانیت میں مضمر ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اور احترامِ آدم مستقل اقدارِ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ان اقدار کے انکار سے "حیوانی آدم" تو زندہ رہ سکتا ہے، "انسانی آدم" زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے انہوں نے کہا کہ:-

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

(بالِ جبریل۔ ص ۵۱)

جہاں تک سلاطین کا تعلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کی شکل بدل دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یورپ نے شہنشاہیت کو ختم کر کے جمہوریت کی طرح ڈالی تو اس سے محض حکومت کی شکل بدلی۔ بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا سلسلہ ویسے ہی رہا۔ اگر روس، زار کی شہنشاہیت کو ختم کر کے اس کی جگہ "مزدوروں" کی حکومت قائم کر دے گا تو اس سے انسانیت کُش استبداد میں کمی واقع نہیں ہو جائے گی۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

(بالِ جبریل۔ ص ۶۲)

کمیونزم کے فلسفہ اور اس کا اس طرح گہری نظروں سے تجزیہ کرنے کے بعد اقبالؒ نے ملتِ روسیہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:-

تو کہ طرح دیگرے انداختی | دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردہ کارِ خداوندان تمام | بگذر از لا، جانبِ اِلّا خرام
درگذر از لا اگر جوئیندۂ | تا رہِ اثبات گیری زندۂ

اے کہ مے خواہی نظامِ عالمے
جستۂ اور ا اساسِ محکمے

"اساسِ محکم" کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؒ نے کارل مارکس کی ایک بنیادی معذوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل اسی معاشی نظام میں مضمر ہے۔ جس میں :-

"ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے"۔

مارکس کے رفقاء نے کہا کہ یہ بہت بڑا انقلابی دعویٰ ہے۔ اسے آپ عملاً متشکل کیجئے۔ اس پر مارکس نے کہا کہ میں اس سے معذور ہوں۔ انسانی مشکلات کا حل تو وہی ہے جسے میں نے پیش کیا ہے لیکن میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا جس کی رو سے ایک شخص جان مار کر دن رات محنت کرے اور اس کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا لے جتنے کی اسے ضرورت ہے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ جب تک مجھے اس جذبۂ محرکہ کا علم نہ ہو جائے میں اس کے لئے عملی قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ اس کے بغیر اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ اس کی پارٹی میں کافی عرصہ تک یہ بحث جاری رہی لیکن جب وہ کسی صورت میں بھی عملی اقدام کے لئے تیار نہ ہوا تو اس کی پارٹی کے کئی ممبر دل برداشتہ ہو کر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اس نے ان سے کہا کہ تم اس اختلاف کی وجہ سے مجھ سے الگ ہوتے ہو تو ہو جاؤ۔ لیکن میں تمہاری رضا جوئی کی خاطر ایسا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں جسے میں ممکن العمل نہیں سمجھتا۔ ایسا کرنا منافقت ہوگا۔

یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جسے اقبالؒ نے اس قسم کے نظام کے لئے اساسِ محکم قرار دیا اور اس سلسلے میں روس سے کہا :-

داستانِ کہنہ شستی باب باب | فکر را روشن کن از امّ الکتاب

کیا اس کے بعد کوئی شخص اقبالؒ کو کمیونسٹ کہہ سکتا ہے؟ اقبالؒ نے کمیونزم کے معاشی نظام اور اس کے فلسفۂ زندگی کو الگ الگ کر کے دونوں پر تبصرہ کیا اور اسی لحاظ سے مارکس کے قلب اور دماغ کا بھی الگ الگ تجزیہ کیا۔ اس نے کہا کہ مارکس نے نوعِ انسان کی معاشی مشکلات کا جو حل تجویز کیا ہے وہ مبنی برحقیقت ہے -

قرآن کریم نے یہی حل بتایا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل میں اسے عملاً متشکل کر کے دکھایا گیا تھا۔ لیکن اس کا مارکس کا فلسفۂ حیات جو مستقل اقدار خداوندی کے انکار پر متفرع ہے یکسر باطل ہے۔ چنانچہ وہ مارکس کی زندگی کے گوشۂ اوّل کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ لیکن اس کے دوسرے گوشے کی بناء پر اس کی تردید بھی اسی شدت کے ساتھ کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

صاحبِ سرمایہ، از نسلِ خلیل! یعنی آں پیغمبرے بے جبرئیل

مارکس کی بنیادی کتاب کا نام "سرمایہ" (DAS CAPITAL) ہے اور چونکہ وہ یہودی تھا۔ اس لئے اسے "از نسلِ خلیل" کہا گیا ہے اور "پیغمبر بے جبرئیل" کہہ کر اس کے پیغام کے دونوں گوشوں کو جسطرح منعکس کیا گیا ہے اس کی داد صاحبِ نظر ہی دے سکتے ہیں۔ اسی تجزیہ کو انہوں نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کے مشیر کی زبان سے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

وہ کلیم بے تجلّی، وہ مسیح بے صلیب نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اور ذیل کے شعر میں انہوں نے ان "متشابہات" کو "محکمات" کے پیکر میں پیش کر دیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ :۔

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است قلبِ او مومن دماغش کافر است

کس قدر برجستہ اور بلیغ ہے یہ تجزیہ جس کی رو سے کہا گیا ہے کہ، اس کا قلب دردا گیں مفلسوں، محتاجوں، مزدوروں، محنت کشوں کے مسائل کے احساس سے وقفِ اضطراب تھا۔ اس لئے اس کا قلب مومن تھا لیکن اس نے، وحی کی روشنی سے محروم رہ جانے کی بناء پر جو فلسفۂ حیات پیش کیا وہ یکسر باطل ہے۔ مارکس (یا کمیونزم) کی بے بصری پر اقبالؒ کا دل کڑھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وحی کی اساسِ محکم موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس قدر عظیم انقلاب نہ صرف ناکام رہ جائے گا بلکہ فسادِ انسانیت کا موجب بن جائے گا۔ وہ ہزار جان سے چاہتا تھا کہ اس انقلاب کے داعی اپنے فلسفۂ حیات کے لئے قرآن سے راہ نمائی حاصل کریں تاکہ یہ معاشی انقلاب موجب تعمیر انسانیت ہو جائے۔ اس سے یہ معاشی نظام قرآنی نظام کے مماثل ہو جائے گا۔ اس ضمن میں انہوں نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا :۔

"بالشویزم کے ساتھ اگر خدا کو ملا دیا جائے تو یہ نظام اسلامی نظام کے مماثل ہو سکتا ہے"۔

علامہ اقبال نے اپنی تنقید میں صرف روس کو مخاطب کیا ہے، چین کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ ان کی زندگی میں چین، کمیونسٹ مملکت کی حیثیت سے اُبھرا نہیں تھا۔ لیکن علامہ کی تنقید، کمیونزم کے خلاف ہے۔ وہ کسی ملک میں بھی کارفرما کیوں نہ ہو۔ یہ حیثیت قابل غور ہے کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ کسی محکم بنیاد کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ نظام کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ان کی یہ "پیش گوئی" حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ روس نے تو پھر بھی ناکام ہونے کے لیے کچھ عرصہ لیا، چین کا نظام ماؤزے تنگ کی شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی اس بظاہر فلک بوس عمارت کی اینٹیں ایک ایک کر کے گرنی شروع ہو گئیں اور اب وہ تھوڑے عرصہ کی مہمان نظر آتی ہیں۔ سچ کہا تھا حضرت علامہ نے انسانیت لازکے خلا میں زندہ نہیں رہ سکتی! اے کاش! اس وقت دنیا میں کہیں قرآن کے اِلّا کا نظام قائم ہوتا تو اس کے عالمگیر ہونے کے لئے فضا بڑی سازگار تھی۔ لیکن اس میں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ نظام سرمایہ داری کی ناکامی کے بعد، نظام کمیونزم کا ناکام تجربہ، انسانیت کو قرآن کے اِلّا کی طرف آنے کے لیے مجبور کر دے گا۔ قُلِ الْعَفْوَ کا دور آ کر رہے گا۔

ان تصریحات سے علامہ اقبال کے مسلک کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ مارکسزم کے معاشی نظام کو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل سمجھتے تھے لیکن اس کے فلسفۂ حیات کو بعید کفر۔ اور چونکہ کمیونزم میں اس کے فلسفۂ حیات کو اس کے معاشی نظام سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کمیونزم ان کے نزدیک کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کھلے لفظوں میں اس کی وضاحت بہت پہلے کر دی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ جب انہوں نے بانگ درا اور پیام مشرق میں) نظام سرمایہ داری کے خلاف لکھا تو ایک صاحب، شمس الدین حسن نے، جو کمیونزم کے بہت بڑے حامی (اور ہفتہ وار اخبار، انقلاب اور خاور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔) روزنامہ زمیندار (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۴ جون ۱۹۲۳ء میں ایک مضمون لکھا:-

"بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبالؒ، قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالشوزم، کارل مارکس کے فلسفۂ سیاست کا لب لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کی نظم ـــــ خضر راہ ـــــ اور ان کے مجموعۂ کلام، پیام مشرق، کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ، ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں۔"

اس کے جواب میں حضرت علامہؒ کا ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ:-

۱۔ میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

۲۔ میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

۳۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔

(بحوالہ۔ اقبالؒ اور قرآن جلد ۱ صفحہ ۱۹)

اس کے بعد انہوں نے، ۱۹۳۶ء میں، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا:-

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں۔ اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں۔ مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا ...... جو روحانیت میرے نزدیک مغضب یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم۔ سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

(مکاتیبِ اقبالؒ)

اس سے سوشلزم اور اسلام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم کا فلسفۂ حیات ماننے والا، مسلمان نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے، قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

"شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون

کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔"

ان حقائق سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ سوشلزم کے فلسفۂ حیات کو اسلام کی نقیض قرار دیتے اور اس کے شدید مخالف تھے اور وہ قرآن کے معاشی نظام کو (جو سوشلزم کے معاشی نظام کے مماثل ہے) نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل قرار دیتے تھے۔ لہٰذا اقبالؒ کو کمیونسٹ کہنا بڑی زیادتی ہے۔

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مطالبۂ پاکستان کی اساس

دو قومی نظریہ

(اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی نگاہوں میں)

ذیل کا مقالہ، روزنامہ نوائے وقت کی ۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اسے پرویز صاحب کی نظرثانی کے بعد، نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے:۔

---

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے نوائے وقت میں میرا مبسوط مقالہ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا۔ "کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟" اس میں ضمناً دو قومی نظریہ کا بھی ذکر آ گیا تھا، لیکن چونکہ میرے زیرِ نظر موضوع دوسرا تھا اس لئے میں اسے چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ جس طرح میں نے اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کے فرق کو نکھار اور ابھار کر بیان کیا ہے اور اس باب میں قائداعظمؒ کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح "دو قومی نظریہ" کے متعلق بھی مجھے تفصیل سے لکھنا چاہیئے اور اس باب میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نظریات اور مسلک کو وضاحت سے بیان کرنا چاہیئے۔ یہ سطور اسی مطالبہ کی تعمیل میں تحریر ہیں۔

جب اس کرۂ ارض پر انسانوں نے پہلے پہل مل جل کر رہنا شروع کیا تو وہ (مختصر ہی سہی) لامحالہ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک معاشرہ تھا جس میں کسی قسم کی تفریق اور تقسیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ان میں تفریق پیدا ہونی شروع ہوئی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱۹)

"ابتداء میں نوعِ انسان ایک ہی اُمت تھی۔ پھر اُن میں اختلافات پیدا ہو گئے۔"

ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں کو پھر سے اُمتِ واحدہ بنانے کے لئے انبیاء کرامؑ کا سلسلہ شروع ہوا۔

ارشاد ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (۲/۲۱۳)

" نوع انسان شروع میں ایک ہی اُمّت کے افراد تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشّرین اور منذرین انبیاء کرام ؑ کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے ساتھ ضابطہ قوانین بھی نازل کیا۔ تاکہ وہ اس کے ذریعہ ان کے اختلافات کو مٹا کر (انہیں پھر سے اُمّتِ واحدہ بنا دیں)"۔

نوع انسان کی اُمّتِ واحدہ، سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی۔ خاندان بڑھے تو اس تفرق نے قبائل کی شکل اختیار کی۔ قبائل دامن دراز ہوئے تو نسلی امتیازات کی تفریق پیدا ہو گئی۔ اور اب اس دور میں، اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تفرق کے لئے کرۂ ارض پہ لکیریں کھینچی گئیں اور ان سے مختلف ممالک وجود میں آ گئے۔ اور ایک ملک کی چار دیواری کے اندر بسنے والے انسان ایک قوم کے افراد قرار پا گئے۔ اس طرح خدا کی وسیع و عریض زمین مختلف ملکوں کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ اب کوئی انسان محض انسان ہونے کی نسبت سے پہچانا نہیں جاتا۔ وہ متعارف ہوتا ہے وطن یا قوم کی نسبت سے۔ اس سے دنیا کس قدر عالمگیر جہنّم کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کا اندازہ اُس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو دنیا (بالخصوص مغرب کے دانشکدوں) سے مسلسل اُٹھ رہی ہے (یہ بہرحال دوسرا موضوع ہے)۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تفرق، خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کی بنیادوں پر پیدا ہوتی۔ حضرات انبیاء کرام ؑ نے (وحیِ خداوندی کی رُو سے) کہا کہ یہ معیارِ تفریق باطل ہے حقیقی معیارِ تقسیم فکر و نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی ہے۔ زندگی کا ایک تصور، مستقل اقدارِ خداوندی کی رُو سے متشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ اس تصورِ حیات میں ہم آہنگ ہوں وہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلاف کے باوجود ایک برادری کے افراد ہیں۔ جو اس تصور کو تسلیم نہ کریں وہ دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم میں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط (۶۴/۲)

" خدا نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ نے بلند انسانیت کی زندگی سے انکار

کر دیا۔ دوسرے گروہ نے اسے تسلیم کر لیا۔"

اور یوں نوعِ انسان دو گروہوں میں بٹ گئی۔ بلند سطحِ زندگی سے انکار کرنے والوں کو اصطلاح میں کافر کہتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے تسلیم کرنے والوں کو مومن۔ کافر کے معنی انکار کرنے والا ہیں اور مومن کے معنی مان لینے والا۔ قرآن کریم کی رُو سے، تفریقِ انسانیت کا یہی معیار ہے۔ جس کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں۔ مومن اور کافر۔ یا مسلم اور غیر مسلم۔

حضرات انبیاء کرامؑ نے اس معیارِ تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھا بھی دیا۔ سلسلۂ وحی کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب ان کے زمانے میں، ان کی اپنی قوم میں، اس معیار کے مطابق تفریق پیدا ہوئی تو حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف، کیونکہ وہ مبنی بروحی نظریۂ حیات میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ:-

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۹/۴۸)

"میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔"

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ:-

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ز ...

"ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔"

كَفَرْنَا بِكُمْ ۔ "ہم تم سے ہر شے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔" وَبَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا ۔ "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے، اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کر لو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (۶۰/۴) اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶) "جو شخص میرے پیچھے

پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے"۔ اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے لئے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا۔ (۱۱/۸۱) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوع انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آ گیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی۔ اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں، ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیل

قوم رسولؐ ہاشمی

قومیت کے مطابق حبش کا بلال۔ فارس کا سلمان۔ اور روم کا صہیب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) محمدِ عربی کی "اپنی قوم" کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور حقیقی چچا) ابولہب "غیر قوم" کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آگیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف، حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر۔ نہیں! اور آگے بڑھئے۔ ادھر خود محمدؐ تھے تو اُن کے بالمقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیم انسانیت، جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر، خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ اُمتِ محمدیہ، وہ ملتِ اسلامیہ۔ وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے اُن انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجۂ اشتراک صرف ایمان تھا۔ یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸/۷۲) "ایک دوسرے کے دوست (اور چارہ ساز) ہیں"۔ اور ان کے مقابلہ میں، نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز" اس کے بعد اس قوم مومنین کو تاکید کر دی کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ

"اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔"

اس لئے کہ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا "یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔" وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ... "ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو۔" قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ

مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِىْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ " ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو اُن کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔" قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۳/۱۱۷) "ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے اگر تم عقل و فکر سے کام لوگے تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے"۔ ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ " اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے۔" وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (۳/۱۱۹) " اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے [1]"

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی، بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (ESTABLISH) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ، تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکام خداوندی کے مطابق کرنے ہیں؛ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) جو ایسا نہیں کرے گا وہ مومن نہیں کافر ہے۔ (۵/۴۴) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو فرعی قوانین مرتب کرنے پڑیں۔ انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو۔ (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ ۴۲/۳۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امورِ مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہؐ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا

نہ خلفائے راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت خالصتاً جماعت مومنین پر مشتمل تھی؛ اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ "قومِ مسلم" کے افراد نہیں تھے۔

---

[1] عدم گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کے لئے دیکھئے۔

۳/۲۷ ، ۴/۱۳۹ ، ۴/۸۹ ، ۴/۱۴۴ ، ۵/۵۵ ، ۸/۸۳ ، ۹/۱۰ ، ۵۸/۲۲ ، ۶۰/۱۱-۱۰

صدرِ اوّل کے بعد

اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد، جب دین ، مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر مہمات اصول کی طرح قومیت کا یہ نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مسلمان بھی ، دیگر قوموں کی طرح ، نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے ۔ صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آ رہی تھی کہ ہم میں اقبالؒ جیسا مفکر پیدا ہو گیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی رُو سے (دین کی دیگر اساسات کی طرح) اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی از سرِ نو یاد دہانی کرائی کہ اُمتِ محمدیہ کا نسلوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا ، اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے ۔ یہ پوری اُمّت ، ایمان کے اشتراک کی بنا ، پر اُمّتِ واحدہ ہے ۔ فکرِ اقبالؒ کے عام ہو جانے کی وجہ سے آج ہمارے لئے یہ سمجھنا کہ اسلامی قومیت کا یہی معیار ہے ، چنداں تعجب انگیز نہیں لیکن خود اقبالؒ کا اس قرآنی حقیقت تک پہنچنا بڑا تعجب انگیز تھا ۔ وہ ۱۹۰۵ء میں (جب اس کی عمر تیس تیس سال سے زیادہ نہ تھی) حصولِ تعلیم کے لئے یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے ۔ دانایانِ مغرب اس نظام کو نوعِ انسان کی مشکلات کا مداوا قرار دے رہے تھے ۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے ۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کا جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو ، متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیے تھا ۔ لیکن مؤرخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رُونما ہوا ۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ ؎

ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ :-

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا   مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ ؎

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے !

اور وہ واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چونکہ یہ نظریہ اسلامی نظامِ زندگی کی اصل اور بنیاد تھا، اس لئے علامہؒ نے اس کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اسے کس شدومد سے پیش کرتے تھے، اس کا اندازہ اس نظم سے لگائیے جو "بانگِ درا" میں "وطنیت" کے عنوان سے درج ہے۔ اور اس میں وہ کہتے ہیں ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفویؐ ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ! خاک میں اس بت کو ملا دے

اس نظریہ کی مخالفت

میں نے اپنے مقالہ (شائع شدہ نوائے وقت بابت ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۱ء) میں بتایا تھا کہ جب قائداعظمؒ نے سیکولر سٹیٹ کے خلاف اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی شدید ترین مخالفت بھی انہی کی

طرف سے ہوئی۔ اس کاٹیپ کا بند اُن کی وہ بحث ہے جو (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ہوئی۔
شروع ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مولانا مرحوم نے دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ـــ
"قومیں" اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں"۔ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم دیوبند،
کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جاسکتا۔
علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہیئے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس خلاف اسلام نعرہ
کو سُنا تو ان کے دلِ صد چاک سے ایک آہ اُبھری، جو ان الفاظ کی شکل میں، فضا کو چیرتی ہوئی آں سوئے
افلاک تک جا پہنچی کہ :-

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمدؐ ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ ممبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِؐ عربی است
بمصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "بمصطفٰےؐ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس
ہیں۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن اُمت کی تشکیل اس رسُول کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو
انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو،
اُمتِ محمدیہؐ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پاجائے تو رسولؐ سے نسبت ختم ہو جاتی
اور جب رسولؐ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

"جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کریں اور اس طرح الگ الگ فرقے، پارٹیاں، قومیں بن جائیں
اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔

یعنی اگر قومیت کی اساس، اسلام کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا
رسولؐ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پہ، علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے
سے، رسول اللہؐ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت،
وطن کے بجائے حضور نبی اکرمؐ کی طرف کرو۔ بمصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ـــ اگر باو نرسیدی

اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو — تمام بو الہبی است — پھر دین باقی نہیں رہتا۔ بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہؒ نے کہا:-

"اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابل قدر اور اہم تھا تو رسول اللہؐ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت، ابوجہل و ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔۔۔۔ محمدؐ (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی، لیکن جب محمدؐ کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب اُمتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را   نہ داند نکتۂ دینِ عرب را!
اگر قوم از وطن بودے، محمدؐ   ندادے دعوتِ دیں بولہب را!

حضور رسالت مآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا بوجہل یا کفارِ مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ نبیٔ آخر الزماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریۂ قومیت کو کس قدر اُبھار کر اور نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی تک اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن اُمت کی تشکیل اس نبیؐ کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں، لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر، اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُمت کی یہ تشکیل اس رسولؐ کی طرف نسبت

سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی، حضرت عیسےٰؑ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ حضرت عیسےٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے، یعنی نبوت کو حضرت عیسےٰؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ اُمتِ حضرت عیسےٰؑ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسےٰؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمدؐ رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ اُمتِ عیسویؑ سے کٹ کر ایک نئی اُمت یعنی اُمتِ محمدیہؐ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رُو سے، اگر کوئی شخص، محمدؐ رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ اُمتِ محمدیہؐ سے کٹ کر ایک نئی اُمت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسولؐ اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ، اُمتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی اُمتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔

انہوں نے کہا ہے کہ :-

"حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمدؐ مدنی یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ خاتمیت" کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابد الآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرلے جس طرح قادیانی نظریہ، ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہؐ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی اُمتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور، ذاتِ رسالت مآبؐ سے اپنا رشتہ منقطع کرکے، ایک جدید اُمت، یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور اس کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے

بجائے مولانا مدنی نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکۂ دین و وطن" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابلِ تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے اس معرکہ آراء بیان کو یہاں درج کرا دیا جائے۔ لیکن عدم گنجائش اس سے مانع ہے۔ (ویسے میں اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں)

(ضمناً، مولانا مدنی (مرحوم) کے متبعین میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان کے بعد، مولانا مدنی نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ آجکل قومیتیں، وطنیت کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں۔ اور علامہ اقبالؒ نے ان کی اس معذرت (یا وضاحت) کو تسلیم کر لیا تھا، اس لئے اس قصہ کو اب دہرانا نہیں چاہئے۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو سامنے نہیں لائے کہ مولانا مدنی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا موقف مبنی بر حقیقت نہیں تھا۔ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ طلوعِ اسلام نے اسی زمانہ میں اس کتابچہ کا بھرپور جواب شائع کیا تھا جس کا کسی سے آج تک جواب بن نہیں پڑا۔ (یہ مقالہ بارِ دیگر، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا)۔

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے، لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کرتا رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا؟ جب آنے والا مورخ اس حقیقت پر نگاہ ڈالے گا کہ اس مقصد کے لئے ان کی نگہِ انتخاب کہاں جا کر ٹکی تو وہ یقیناً محوِ حیرت رہ جائے گا۔ ان کی نگاہ کا ہدف تھا مسٹر محمد علی جناح۔ وہ جناحؒ جو عمر بھر نیشلسٹ رہا اور پھر ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشۂ خلوت میں جا بیٹھا تھا۔ اس قسم کے نیشلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریہ کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لے، اقبالؒ کا وہ کارنامہ ہے جس سے ملتِ اسلامیہ ان کی ہمیشہ رہینِ منت رہے گی۔ یہ کیسے ہوا تھا؟ اس حقیقت کی پردہ کشائی قائدِاعظمؒ کے سوانح حیات کا انگریز مرتب (ہیکٹر بولیتھو) ان الفاظ میں کرتا ہے :-

" اپنے قیامِ لندن کے دوران مسٹر جناحؒ نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ ایک دوسرے کے بہت

اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پہ تسلیم نہیں کیا
اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔" (ص ۹۹)

جناحؒ انگلستان گیا تھا تو اس نیشنلزم کا پرستار جس کی شہادت آج بھی بمبئی میں "جناح کانگریس ہال" دے رہا ہے۔ اور واپس آیا تو اقبالؒ کا یہ پیغام دہراتا ہوا کہ ؎

اپنی ملت پہ قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قائداعظمؒ نے اسلام کے اس تصورِ قومیت کو کس کس انداز سے پیش کیا، اس کی مثالیں آگے چل کر پیش آئیں گی لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا فقرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ انہوں نے ۸۔ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:۔

"پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم، اسلام لے آیا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آگیا۔ اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، ایڈورڈس کالج۔ پشاور میں، ۲۷۔ نومبر ۱۹۴۵ء کو کہا تھا:۔

"ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔"

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شد و مد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔"

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا:-

"مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔"

جب قائدِ اعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ ۵ استمبر ۱۹۴۴ء کو) ایک خط میں لکھا:-

"میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔"

مسٹر گاندھی کا یہ خط، یوں سمجھئے کہ قائدِ اعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے، مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ:-

"اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے، نہ شک و شبہ، کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برِ صغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے، کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے.... (لہٰذا، مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں)، آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے اگر مذہب نہ ہو تو انسانی

اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے۔ لیکن مقصود کچھ نہیں ہوتا۔"

(جناحؒ کا خط بنام گاندھی۔ جنوری ۱۹۴۰ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا:۔

"میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندو مت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بناء پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے، ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا، جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔"

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس، کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملّی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔"

قائدِ اعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شدومد سے دہرایا کہ اس کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن، مسٹر این، سی دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار مدینہ، بجنور کی یکم فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت

میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا:۔

"ان حالات میں، میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کو "دو" قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ، میرے خیال میں، اب نہیں، تو کل حقیقت ہو کر رہے گا.... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ البتہ اس میں ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہئے"۔

اور اس حقیقت کو، بالآخر، ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا۔ اس موضوع پر، قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔

میں نے اپنے مقالہ (مندرجہ نوائے وقت مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں کہا تھا کہ تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے مخالفین، قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو ترپ کے پتّے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ نہ تو اسلامی مملکت کے قائل تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی الگ قومیت کے مؤیّد۔ وہ وطن کی بنیادوں پر متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں (محولہ بالا تقریر کے ضمن میں) اسلامی مملکت کے مسئلہ پر تو وضاحت سے بحث کی تھی۔ لیکن نظریۂ قومیت کے سلسلے میں صرف اتنا کہا تھا کہ اس سے ان کی مُراد یہ نہیں تھی کہ "مسلمان اور غیر مسلم" اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم بن جائیں گے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ غیر مسلم یہاں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

غیر مسلم اقلیتیں

انہوں نے (۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی محولہ بالا تقریر سے قریب ایک ماہ پہلے) ۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء کو نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے، دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس میں ان سے جب پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:-

"میں ان وعدوں میں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کیئے ہیں، منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو بھی کہتا ہوں اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور فرقے سے متعلق ہوں بہر طور پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات و عبادات کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائیگی۔ ان کی جان، ان کے مال اور ان کے تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلا تفریق مذہب و ملت و رنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائے گا۔"

(بحوالہ نوائے وقت۔ مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۴۸ء)

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلموں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی ۱۱ر اگست کی تقریر سے ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد) ۱۴ر اگست کو مجلس آئین ساز کا افتتاح کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں کہہ دیا تھا کہ

۱۱ر اگست کے بعد

مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہِ اکبرؒ نے کیا تھا۔ قائداعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

"شہنشاہ اکبرؒ نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا، وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آرہا تھا جب حضور نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت و احترام کی نظروں

سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہیں پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہو گی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمائیے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطۂ نگاہ سے "دو قومی نظریہ" کا بیّن ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائداعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ ان سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار ابھرتا ہے، اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسن سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی، انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو گا۔"

پھر انہوں نے ۳۰ر اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے۔ خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعث عزت اور وجۂ افتخار ہونا چاہیئے۔"

۳ر فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائداعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب

میں انہوں نے فرمایا کہ "حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے، خوف اور بد اعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے" انہوں نے ۱۹، فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا :-

"اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہل مذہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے ہم ان کے اس تعاون کا گرمجوشی سے استقبال کریں گے۔"

انہوں نے ۲۱، مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔"

اس کے بعد انہوں نے، اسی تقریر کے دوران فرمایا :-

"اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے ـــ اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں یہ سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں، اوّل و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے ۔۔۔۔ اس لئے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی لعنت فرقہ بندی یا شیعہ سنی کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا :-

"میں اس موقعہ پر ایک بار پھر دُہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔"

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں "ایک قوم" کہاہے۔ اور دوسرے اقتباس میں، غیر مسلموں کو اقلیتیں۔ فرمائیے کہ ایسا کہنے والا "دو قومی نظریہ" کا علمبردار تھا، یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے ۲۶، مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔"

۱۴، جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائد اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ :۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلا تمیز مذہب و ملت اور بلا لحاظِ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔"

آپ نے دیکھا کہ قائد اعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ زندگی کی بناء پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹، فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈکاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کہا کہ :۔

"یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ　　کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف واحترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خاص

جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات، ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے"۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لیئے کون کون سے اجزا کو لاینفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا اُمتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائداعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں؟

پھر انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو اُن کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو، اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقعہ پر، مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرینِ سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو، اُسے کبھی بھی، مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوئی ہو، اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اس بحث کے سلسلہ میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ:-

"اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پرواہی"۔

لہٰذا، قائداعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

نئی نسل کی تعلیم

یہ تھے دو قومی نظریہ کے متعلق قائداعظمؒ کے خیالات۔ میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد، ملک کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں گذارش کیا تھا کہ مذہب (دین) کی بنیادوں پہ ایک مملکت اور ایک جداگانہ

قومیت کا تصور دنیا میں رائج نظریات سیاست کے خلاف اور انوکھے نظریات ہیں۔ ہم (پرانی نسل کے افراد) تو وہاں سے یہ کچھ پکارتے ہوئے یہاں آ گئے ہیں۔ لیکن ہماری نئی نسل کی سمجھ میں یہ بات از خود نہیں آ سکے گی اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کا نظام ایسا کیا جائے کہ یہ نظریات علیٰ وجہ البصیرت ان کی زندگی کا جزو بن جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ عام نظریات سیاست سے متاثر ہو کر، سیکولر سٹیٹ اور وطنی قومیت کا قائل ہو جائے گا، اور اس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے میری ان گزارشات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ یہ زہر ہماری نئی نسل کے رگ و پے میں سرایت کر تا گیا۔ ملک میں موجود پاکستان دشمن عناصر اس زہر آلودہ خون کی گردش کو تیز سے تیز کرتے چلے گئے اور اس کا عملی مظاہرہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہوا۔ تعلیم کی طرف سے ہماری مجرمانہ تغافل شعاری کی وجہ سے وہاں کے طالبعلموں کی ذہنیت کیا بن چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے (اس زمانے کے) ایم اے فائنل کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو روزنامہ (DAINIC PAKISTAN) کی اشاعت بابت ۶ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا ہے کہ ہم مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ :-

"ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ، جیسے اپنے ڈی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسیٰ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا، اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا، یعنی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نوراللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگنی، گھاگنی جیسے سیدھے سادھے ناموں کو تیاگ کر دیا۔"

اس کے بعد اس نے لکھا تھا :-

"اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔"

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور وجوہات معلوم کرنے کے لئے ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے رہے۔ لیکن یہ سب بے سود تھا۔ اس کا بنیادی سبب وہ ذہنیت تھی جس کی جھلک عزیز الرحمٰن کے مندرجہ بالا خط میں صاف نظر آرہی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد، سقوطِ ڈھاکہ کے جگرخراش المیہ پر شادیانے بجاتے ہوئے بنگلہ دیش کے اس وقت کے قائم مقام صدر، مسٹر نذر الاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ:۔

"ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سر پھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولرازم نہیں۔ انہیں لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے، وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا، حقائق کسی کے جھٹلائے ہوئے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔"

مسز اندرا گاندھی

ادھر نذر الاسلام صاحب یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اس زمانہ کی بھارت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اپنی پارلیمان میں جشن "فتح بنگالہ" پر ہدیۂ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ:۔

"یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ

کامیاب نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب ۲۵ سال کے تجربہ نے بتادیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے"۔

(سابقہ مشرقی پاکستان) حالیہ بنگلہ دیش میں اس ذہنیت نے ملک کو دولخت کر دیا۔ ادھر مغربی پاکستان میں اس ذہنیت کی پرورش کے لئے دوسرا انداز اختیار کیا گیا۔ یہاں کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں۔

قارئین کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی "عوامی ادبی" انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوشؔ ملیح آبادی اور فیض احمد فیضؔ کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:-

"ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کیے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں"۔

یعنی سیکولر مملکتوں میں تو وطن کی چاردیواری کے اندر بسنے والے تمام افراد ایک قوم کہلاتے ہیں یہاں ان حضرات نے اس نظریہ کی ترویج شروع کی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے الگ الگ قوم ہیں۔ یعنی یہ "اربابِ دانش" سیکولرزم سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے! ادھر تقسیم ہند کے سب سے شدید مخالف خان عبدالغفار خان بھی اسی قسم کے نظریات عام کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں "ٹائمز آف انڈیا" کے نمائندے مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں اب چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی"۔ انہوں نے یہ بات کوئی پہلی مرتبہ نہیں کہی۔ وہ جب ۱۹۶۹ء میں کابل سے بھارت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا:-

"میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے

لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی، لہٰذا میں لے سے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔"

(سٹیٹسمین ۱۶ / اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ پاکستان ٹائمز ۳/۷/۱۹)

اُدھر والد بزرگوار یہ فرما رہے تھے اور ادھر ان کے صاحبزادہ خان عبدالولی خان، یہ اعلان کر رہے تھے :-

"دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔"

(نوائے وقت ۔ ۱۳ / اکتوبر ۱۹۷۲ء)

میں نے پہلے لکھا ہے کہ بنگالی طالب علم، عزیز الرحمٰن نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اب وطن پرستی کی ذہنیت مشرقی پاکستان سے آگے بڑھ کر سندھ میں سرایت کر رہی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "حریت" کی اشاعت بابت ۴ / نومبر ۱۹۶۸ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ :-

"وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بد ترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجو ڈارو، کوٹ ڈجی جان کے آثارِ قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے۔ (نہ کہ اسلام کی وجہ سے)۔

(طلوعِ اسلام ۔ دسمبر ۱۹۶۸ء)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے بہاری (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی (اور ان پر مصائب و آلام کا جو سلسلہ اب تک جاری ہے)، اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے سندھ کی ایک ادبیہ غزالہ بلوچ کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ / اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا :-

"اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُر مسرت حالت میں ہوتے لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان۔ ایک پاکستان کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن شروع ہوئی تھی جب انہوں نے ۱۹۴۶-۴۷ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اسقدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔"

(طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء، صفحہ ۴۳)

وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت از خود پیدا نہیں ہو گئی تھی وہاں کے "بزرگ سیاستدانوں" نے جب اپنی گاڑی کا رُخ بدلا تو اس سے ساری فضا متاثر ہو گئی۔ سندھ کی "بزرگ ترین سیاسی شخصیت" مسٹر جی ایم سید کی تھی۔ وہ مسٹر سید جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا اور بعد میں ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اوائل ۱۹۷۲ء میں جب ان کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :-

"پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظامِ حکومت کا تخیّل، فسطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔"

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ :-

"۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیر باد کہا جائے، یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں

کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے"۔

(المنبر۔ ۴؍ فروری ۱۹۷۲ء)

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آیئے۔ وہاں کے (اس زمانے میں) وزیر اعلیٰ، سردار عطاء اللہ مینگل نے ۱۹۷۲ء میں کہا تھا کہ:۔

"جس دو قومی نظریہ کی اساس پہ پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے"۔

(نوائے وقت۔ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

اور وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے۔ انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہوں گے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہو گی تو پاکستانی قوم کی بات ہو گی"۔

(نوائے وقت۔ ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

کسی نے ان سے یہ پوچھا کہ جب سارے ملک میں قومیں الگ الگ ہوں گی تو پاکستانی قوم کی بات کون کرے گا؟ میں اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے زیرِ نظر مقصد کے لئے سردست اتنا ہی کافی ہے۔ (میں مزید تفاصیل کسی دوسرے وقت پر اٹھائے رکھتا ہوں۔)

اس وقت تک دو قومی نظریہ سے متعلق گفتگو پاکستان کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ لیکن، جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے یہ نظریہ نہ تو تحریک پاکستان کے کسی سیاسی محرکہ کی تخلیق تھا اور نہ ہی پاکستان یا کسی اور ملک سے وابستہ یا اُس تک محدود۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو کفر اور اسلام کی تفریق کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے، اس لئے کوئی اہلِ ایمان، جہاں بھی ہے، وہ عظیم اُمت

مسلمہ کا فرد ہے۔ اور جغرافیائی بُعد اور مسافت اُسے نہ اُس اُمت سے الگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسری قوم کا جزو بنا سکتے ہیں، اسلام چھوڑنے کے بعد ہی کسی دوسری قوم کا جزو بن سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جب دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا تھا تو اُسے صرف ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا تھا۔ (پاکستان کا اس زمانے میں ابھی تصور تک بھی ذہنوں میں نہیں آیا تھا)۔ انہوں نے اس پیغام کو تمام دنیا کے مسلمانوں تک پھیلا دیا۔ (مثلاً) انہوں نے ۱۹۲۲ء میں، پہلی جنگِ عظیم کے بعد، تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور تُرکی کی بالخصوص حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالمِ اسلام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یاد رکھو ہماری نکبت و زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے، اور وہ یہ کہ ؎

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مِٹ جائے گا — تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گُہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدّم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء میں)، انہوں نے اپنی مشہور نظم، طلوعِ اسلام میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ: ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے!
تو اے مرغِ حرم، اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

وہ عمر بھر اسی طرح وحدتِ اُمت کے اس پیغام کو عام کرتے رہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی اسلام کے داعی تھے اور اسلام اور وحدتِ اُمت لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن مسلمانانِ عالم، جو حقیقی اسلام کو نظر انداز کر کے دنیا کی دوسری قوموں کی طرح جغرافیائی حدود میں بٹ کر مختلف قومیں بن چکے تھے، انہوں نے اس پیغام کا کوئی اثر نہ لیا۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اس نظریے کو عملی شکل دینے کے لئے اسے پاکستان کے خطۂ زمین تک سمٹایا اور اس کی ابتداء ہندوستانی مسلمانوں سے کی۔ انہوں نے اس خطۂ زمین کا تصور ہی اس لئے دیا تھا کہ اس میں اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں عملاً نافذ کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے اسلام، دو قومی نظریہ، اور پاکستان

ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے تھے۔ پاکستان وجود میں آگیا، لیکن یہ دیکھ کر تاسف ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے کہ اس میں حقیقی اسلام کا احیاء تو ایک طرف، ہم پاکستانی مسلمان بھی ایک اُمت نہیں بن سکے۔ ہم میں صوبائی تقسیم بدستور قائم ہے۔ یہ صوبائی تقسیم نہیں، درحقیقت نسلی تفریق ہے، اور وہ بھی اس قدر گہری کہ ایک ہی نسل کے ایک ہی صوبے میں بسنے والے پاکستانی مسلمان ہندوؤں کی طرح ذاتوں، برادریوں، گوتوں تک میں بٹے ہوئے ہیں اور باہمی تفریق و تقسیم کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جارہے ہیں۔ ہم میں قدرِ مشترک صرف مسلمان کا لفظ ہے۔ اس سے زیادہ اس کا مفہوم کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر ہم ... دو قومی نظریہ کے الفاظ دہراتے ہیں تو اس کا عملی نتیجہ تو کچھ نہیں نکل سکے گا۔ لہٰذا، جہاں ہم اُن لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو دو قومی نظریہ کے مخالف ہیں، ہمیں ان لوگوں کی بھی اسی طرح مخالفت کرنی چاہئے جو لفظی طور پر تو دو قومی نظریہ کے قائل ہیں، لیکن عملاً ایک اُمت بننے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ اس وقت مسلمانانِ عالم کے لئے بالعموم اور پاکستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص مقدم ترین مسئلہ وحدتِ اُمت کی تشکیل کا ہے جب تک یہ وحدت قائم نہیں ہوتی نہ مملکتی سطح پر ہمارا کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور نہ ہی بین المملکتی سطح پر۔

والسلام

پرویز

۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احترام آدمیت

کس نگردد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است وبس!

بتقریب یوم اقبالؒ اپریل ۱۹۸۱ء

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر! سلام ورحمت!

جو حضرات میرے ہفتہ واری درس قرآن مجید میں شریک ہوتے ہیں، یا جن کی نگاہوں سے میری تحریریں گزرتی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں کس طرح قرآنی حقائق کی تشریح وتفسیر، کلامِ اقبالؒ سے کرتا ہوں۔ اس سے جہاں قرآنی معارف وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں، وہاں خود اقبالؒ کا شعر بھی فلک بوس بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اقبالؒ کا احسان حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ عالمگیر انسانیت پر احسان اس اعتبار سے کہ اس وقت اقوامِ عالم جن زہرہ گداز مصائب اور اضطراب انگیز آلام کا شکار ہو رہی ہیں، اُس نے انہیں ان سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتایا۔ ملتِ اسلامیہ ہندیہ پر اس کا یہ احسان کہ اس نے، ان کے لئے ایک ایسی آزاد مملکت کی نشاندہی کی جس میں وہ اقدارِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کر کے صحیح آزادی حاصل کر سکیں۔ اور پھر ان کا احسانِ عظیم اس ہیچمدان پر کہ جس کی قرآن فہمی کا طریق فکرِ اقبالؒ کا رہینِ منت ہے۔ یہی ہے احسانات اقبالؒ کی وہ سرگزارمیت جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے میں ایسی تقاریب پر خصوصی خطاب پیش کیا کرتا ہوں۔

جیسا کہ آپ نے اعلان میں دیکھ لیا ہوگا، میرے آج کے خصوصی درس کا موضوع ہے:-

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں، این است وبس!

یعنی اسلام کا ملخص اور شریعتِ قرآنیہ کا منتہیٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔

اقبالؒ نے ان دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں، اسلام کے مقصود و منتہیٰ کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ قرآنِ کریم کا اعلان ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ..... (۱۷/۷۰) "خدا نے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ آپ دیکھئے! اس میں کافر و مومن کی تمیز تفریق نہیں۔ (یہ تفریق آگے جا کر شروع ہوتی ہے) اس نے ہر انسان کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ اور یہی (شرف و تکریمِ انسانیت) پیغامِ اقبالؒ کا بھی منتہیٰ ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است   اصلِ تہذیب، احترامِ آدم است

اس، مقصود و مطلوب پیامِ خداوندی کے بعد، اقبالؒ نے بتایا ہے کہ انسان کو اس عزّت و تکریم سے محروم کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس نے (بصیرتِ قرآنی کی روشنی میں) کہا ہے کہ مستبد قوتیں سامانِ رزق کو اپنے قبضے میں لے کر، کمزور انسانوں کو ضروریاتِ زندگی کے لئے ان کا محتاج بنا دیتی ہیں، اور جب وہ ان کا محتاج ہو جاتا ہے تو پھر وہ اسے اپنا محکوم بنا لیتی ہیں۔ قرآنی نظام، رزق کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج ہی نہیں رہتا۔ اور جب وہ کسی انسان کا محتاج نہیں رہتا، تو کسی کا محکوم بھی نہیں بنتا۔

جنّتِ ارضی

اس (اقبالؒ) نے جنّتِ ارضی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:-

کس دریں جا، سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست!

چونکہ اس میں کوئی بھی اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اس لئے اس معاشرہ میں غلام اور آقا۔ حاکم اور محکوم کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔ اقبالؒ نے جو کہا کہ:-

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے   تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

تو وہ اسی جنّتِ ارضی کی خصوصیت ہے جو قرآنی نظام سے وجود میں آتی ہے۔

شاعر نہیں

اقبالؒ کے متعلّق بنیادی غلط نگہی یہ ہے کہ ہم نے اسے یا تو ایک شاعر سمجھا ہے اور یا فلاسفر ——— وطن نے اسے جو سب سے بڑا "اعزاز" بخشا ہے۔ وہ "شاعرِ مشرق" کا ہے۔ وہ عمر بھر کہتا رہا کہ بابا! میں شاعر نہیں!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ   کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

بلکہ تنگ آکر یہاں تک بھی کہنے پر مجبور ہو گیا کہ :-

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست کہ بر ما تہمتِ شعر و سخن بست

یہ اس لئے کہ :-

شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

نہ فلاسفر

جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، اس نے دو لفظوں میں ساری بات کہہ دی کہ ہے فلسفہ زندگی سے دوری ! اور فلاسفرز سے برملا کہا کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

چنانچہ وہ عمر بھر زمین کے ہنگامے سہل کرنے کی تدابیر سوچتے رہے۔ ان ہنگاموں میں سرِفہرست روٹی کا مسئلہ ہے۔ جس سے محرومی سے، محتاجی پیدا ہوتی ہے۔ جو شرف و تکریم انسانیت کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔
یہ مسئلہ کب سے ان کی توجہ کا مرکز بنا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ یوں تو ہمارا دور، اقتصادیات کا زمانہ (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے لیکن ہمارے ہاں اس نے بہت تھوڑے ... عرصہ سے اہمیت اختیار کی ہے۔ اقبالؒ کا قلبِ حساس اوز نگہ دُوربیں اس کی منتظر نہیں تھی کہ یہ مسئلہ یہاں اہمیت اختیار کرے تو وہ لب کشائی کرے۔ اُردو زبان میں اقتصادیات پر سب سے پہلی کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اس کے مصنف اقبالؒ تھے۔ حالانکہ تعلیم کے زمانے میں اقتصادیات (اکنامکس) ان کا اعلیٰ مضمون بھی نہیں تھا۔ اور

علم الاقتصاد

ان کی عمر بھی تیس تئیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی سی عمر میں فلسفہ کے اس... طالب علم نے وہ کتاب لکھی جس کے دیباچہ میں کہا :

"اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصول مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی، قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی، اور

تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔" (اقبالؒ اور قرآن۔ صـ ۱۷۸)

اس کے بعد یہ نوجوان، مزید تعلیم کے حصول کے لئے یورپ چلا گیا۔ اس زمانے میں یورپ میں، نظامِ سرمایہ داری انتہائی عروج پر تھا۔ یہ نظام کن بنیادوں پر استوار تھا، اس کے متعلق میں اس مقام پر صرف ایک اقتباس پر اکتفا کروں گا۔ اس نظام کے ایک علمبردار WILLIAM TOWNSEND نے ایک کتاب لکھی تھی: 'DISSERTATION ON THE POOR LAWS'۔ اس میں اس نے کہا تھا:۔

"بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند خو سے تند خو جانور کو رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان بھی مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک ———— بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔"

(بحوالہ۔ نظامِ ربوبیت۔ صـ ۳۲۳)

یورپ میں اقبالؒ نے ان کوڑوں کے خونچکاں زخموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی پر انہوں نے ۱۹۱۱ء میں، علی گڑھ میں، وہ معرکہ آرا تقریر کی جس کا شہرہ آج تک قائم و دائم ہے۔ (مولانا) ظفر علی خان (مرحوم) نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا۔ ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر۔

مسلمانوں کا افلاس

۔ اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:۔

"یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور

قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں۔ معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان، اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلّہ میں جا نکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی۔ جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر دینم برہنہ بچوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی۔ جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جاکر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے۔ جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پساریں۔ ہمارے نوجوان علم بردارانِ اصلاحِ تمدّن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قوئی روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں شاید نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمّہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و افاصی کو کھائے جا رہا ہے۔" (بحوالہ مضامینِ اقبالؒ۔ مرتّبہ تصدّق حسین تاج۔ صد ۱۰۳)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ، عمر بھر، "بھوک سے کراہنے والوں کی دلخراش صداؤں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے" مصروف جہاد رہے۔ اس کا علاج، قرآن کے معاشی نظام کا قیام تھا جس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر عطا فرمایا تھا۔

علامہ اقبالؒ کے اس جہاد کے تین نمایاں مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قلّتِ وقت کے پیشِ نظر میں ان مراحل پر مختصر انداز سے روشنی ڈال سکوں گا۔

مرحلہ اوّل۔ محنت کشوں کا مسئلہ

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد، اقوامِ یورپ جس طرح ترکی کے حصّے بخرے کر کے، اس کی قوّت اور شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے درپے تھیں، اس کے احساس سے اقبالؒ کے قلب درد آگیں کی فلک رس صدائیں، اس زہرہ گداز نظم کی صورت میں لرزہ انگیز ہوئی تھیں جس کا عنوان "خضرِ راہ" ہے۔ اس کا عمودی موضوع

تو یہ تھا کہ :-

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل ؑ　　　خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

لیکن اس میں، اُن اہم مسائل کا حل بھی (بزبانِ خضرؑ) پیش کیا گیا ہے جن سے اس زمانے میں دنیا وقفِ اضطراب تھی۔ اس میں ایک اہم ترین مسئلہ "سرمایہ و محنت" کا بھی ہے اس کے متعلق اقبالؒ کے سوال کے جواب میں خضر کہتا ہے :-

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　　خضر کا پیغام کیا؟ ہے یہ پیامِ کائنات!

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر　　　شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی　　　اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے　　　(بانگِ درا)

یہ ۲۳-۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ اس کے بعد، پیامِ مشرق کے آخری باب میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث سامنے آئی ہے۔ لیکن ایک تو وہ بحث عمیق فلسفیانہ ہے اور دوسرے وہ فارسی زبان میں ہے، اس لئے ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، بالِ جبریلؒ تک پہنچ جاتے ہیں، اس میں، دو تین مربوط نظمیں بڑی دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ اس سلسلہ کی پہلی نظم کا عنوان ہے۔

لینن ——— خدا کے حضور

جیسا کہ معلوم ہے، مارکسزم کا مشہور لیڈر اور مفکر، لینن، خدا، وحی، آخرت، سب کا منکر تھا۔ اس کا خدا کے حضور" نظر آنا بڑا تعجب انگیز سا ہے لیکن وہ اپنے سوال تک پہنچنے سے پہلے، اس معمّہ کو خود ہی حل کر دیتا ہے جب کہتا ہے کہ جو گتھی فلسفہ نہیں سلجھا سکا تھا، اسے عینی مشاہدہ نے حل کر دیا۔ تو (خدا) میرے سامنے ہے اس لئے تیرے وجود سے اب کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ اس تمہید کے بعد وہ کہتا ہے :-

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں　　　حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے　　　کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا　　　جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کے اس اسلوبِ بیان میں، وہ لینن کس طرح چلمنی انداز سے سامنے آرہا ہے جو زندگی بھر خدا کا منکر ہی نہیں، انتہائی درجہ کا سرکش تھا، اور اب خدا سے مخاطب! اس کی (سابقہ) خوئے سرکشی، روح میں تلاطم برپا کر رہی ہے، لیکن احترامِ خداوندی، دل کی بات بیباکانہ زبان تک آنے کے راستے میں حائل ہے۔ بات حلق تک آتی ہے، پھر لوٹ جاتی ہے جھجکتے اور لرزتے ہوئے، بعد توقف و تامّل، اسے بہ نوکِ زبان تک لانے کی کوشش (بلکہ جرأت) کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تامّل اور اضطراب تھا جس سے تنگ آکر ایک وقت طلسمِ پیچ و تاب نے کہا تھا کہ:۔

از سینہ تا بہ چشم برآرم، فرو برم
ایں نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

اب سنیے وہ بات جسے لینن اس صبر آزما توقف کے بعد زبان تک لایا۔ کہا کہ میں جانتا ہوں کہ "تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات" ہے، لیکن میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ:۔

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟

یہ پوچھنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ:۔

مشرق کے خداوند، سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزّات!

مشرق میں، سفید فام مغربی اقوام کی پرستش ہوتی ہے۔ اور مغربی اقوام چاندی سونے (دولت) کی پرستار ہیں۔ ان دونوں کے خدا تو یہ ہیں! میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کون سے آدم کے خدا ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کا تبیانِ حقیقت کا انداز کس قدر بلیغ اور حسین ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس وقت خدا کی حکمرانی دنیا میں کہیں بھی نہیں، اس لئے لینن کا یہ سوال بالکل فطری ہے، اور ایسا جس کا جواب کوئی نہیں بن پڑ سکتا۔ کہ وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ ۔ ہم پر تو منکرینِ خدا ہونے کا الزام دھر دیا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خدا کے مومن کون ہیں، اور وہ کس دنیا میں بستے ہیں؟

اقبالؒ نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ۔ نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری —— اور یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری —— وہ نہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، نہ دوسروں کو یہ کہہ کر فریب میں رکھنا چاہتا ہے کہ دنیا میں نوّے کروڑ مومن بستے ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ:۔

تیرے محیط میں کہیں، گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اس میں نہ مشرق کا استثناء ہے نہ مغرب کی تمیز!

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ　　　　وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

لینن کہتا ہے کہ اہلِ مشرق جن (مغربی) خداؤں کو پوجتے ہیں، ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ:۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت　　　　پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

اس کے بعد وہ اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالتا ہے، اور کہتا ہے کہ:۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں　　　　ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

دنیائے اخلاق کا ایک قدیم معمہ ہے جسے ذہنِ انسانی آج تک حل نہیں کر سکا۔ معمہ یہ ہے کہ:۔

اگر خدا خیر ہے، تو دنیا میں شر کا وجود کیوں ہے؟

اگر شر کا وجود، اس کی مرضی سے ہے تو وہ خیر نہیں۔

اور اگر شر کا وجود اس کی مرضی کے خلاف ہے تو وہ قادرِ مطلق نہیں۔

لینن نے خدا سے کہا ہے کہ تیرا دعوےٰ ہے کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔

عدل کا تقاضا ہے کہ بندۂ مزدور کو اس کی محنت کا ماحصل ملے۔ لیکن وہ نہیں مل رہا اور بندۂ مزدور کے اوقات سخت تلخ ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ خدا عادل تو ہے لیکن اس کے فیصلے عملاً نافذ نہیں ہوتے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ قادر نہیں۔ JUDICIARY تو اس کے پاس ہے لیکن EXECUTIVE اس کے پاس نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کے عادل ہونے کا فائدہ کیا ہے!

اور اس کے بعد وہ اس نہایت پیچیدہ سوال کا جواب خود ہی دیتا ہے کہ میں مانتا ہوں کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔ لیکن تیرا قانون یہ ہے کہ انسان کے عمل اور اس کے نتائج کے محسوس طور پر سامنے آنے میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اور یہ خود تقاضائے عدل ہے، جس طرح دنیاوی قانون کی رُو سے بھی حاملہ عورت کی سزائے موت، وضعِ حمل تک ملتوی کر دی جاتی ہے۔ اس قانونِ مہلت کی رُو سے وہ پوچھتا ہے کہ:۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟　　　　دنیا ہے تری منتظرِ یومِ مکافات!

یہ نہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ سرمایہ داری کا سفینہ ڈوبے گا یا نہیں۔ سوال صرف 'کب' کا ہے۔ یہ کب ڈوبے گا؟ تیری دنیا اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی ہے! اس لئے آپ ذرا جلدی کریں۔

"کب" کا یہ سوال، فرشتوں کے دل میں بھی مچل رہا ہے جس کا تذکرہ اگلی نظم میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس کا عنوان

فرشتوں کا گیت

ہے ــ "فرشتوں کا گیت"۔

قرآن مجید نے قصّۂ آدم، اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کسی خاص شخص (آدم)، یا ایک جوڑے (آدم اور حوّا) کا تذکرہ نہیں۔ وہ خود آدمی کی داستانِ حیات ہے۔ وہ تاریخِ انسانیت کا تمثیلی بیان ہے۔ اس تمثیل میں یوں سمجھئے گویا ایک مجلس میں خدا اور اس کے فرشتے بیٹھے ہیں اور بات اس مخلوق کی ہو رہی ہے جسے دنیا میں صاحبِ اقتدار بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ..... ۲/۳۰ ملائکہ جب اس ہیولیٰ آب و گِل پر گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو انہیں اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ وہ عرض کرتے ہیں اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ بارِ الٰہا! جرأت معاف ہو تو ہم عرض کریں کہ کیا تو کرۂ ارض کو ایسی مخلوق کے حوالے کر دینا چاہتا ہے جو وہاں خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گی؟ جواب ملا اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ..... (۲/۳۰) گھبراؤ نہیں! ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

اس پر فرشتے خاموش ہو گئے اور نہایت گہری نظروں سے تاریخِ انسانیت کا مطالعہ، بلکہ مشاہدہ کرتے رہے۔ جو کچھ وہ دیکھتے اس پر بڑے ضبط اور صبر سے کام لیتے۔ لیکن ضبط کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ ہمارے دور میں پہنچ کر، جب انہوں نے آدم کی عالمگیر سفّاکیوں اور نابکاریوں کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا، اور ایک دن بارگاہِ خداوندی میں لب کشائی کی جرأت کر ہی لی۔

لیکن ملائکہ کی جرأتِ لب کشائی اور لینن کے استفسار میں بڑا فرق تھا۔ لینن نے بھی ادب و احترام کو ملحوظ رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے حرفِ تمنّا میں، طعن و تشنیع کا کھلا ہوا نشتر نہ سہی، چھپی ہوئی پھانس ضرور تھی۔ ملائکہ کی عرض داشت کا انداز کچھ اور تھا۔ انہوں نے کہا ..... ؎

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی   نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اس "ابھی" میں گہری حقیقتیں سربستہ ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ "کیوں؟ کیا وہی نہیں ہوا، جو ہم کہتے تھے؟ کیا آدم ویسا ہی نہیں نکلا جیسا ہم نے اندازہ لگایا تھا"؟ انہوں نے کہا یہ ..... کہ ہمیں اس کا تو یقین ہے کہ آدم ویسا ہی ہو گا جیسا آپ کی مشیئت میں تھا، لیکن ابھی تک یہ اُس معیار پر پورا نہیں اترا۔ ابھی یہ نقش ناتمام ہے۔

ارتقائی منازل

اور اس میں عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ یہ کائنات اور انسان، پہلے ہی دن اپنی مکمل شکل میں وجود پذیر نہیں ہو گئے تھے۔ یہ ابتدائی ہیولیٰ کی صورت میں تخلیق کئے گئے تھے۔ اس کے بعد انہیں ہزارہا ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اس منتہیٰ تک پہنچنا تھا جو ان کا مقصود تھا۔ قرآن مجید میں اس سلسلۂ ارتقاء کے شواہد موجود ہیں اور کلام اقبالؒ میں اس کی بکثرت تفصیلات۔ ذرا ان دو قطعہ بند شعروں کو دیکھئے:۔

یکے در معنیٔ آدم نگر۔ از من چہ می پرسی؟ ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او، پُرخوں شود روزے!

یہ پیکر آب و گِل ہنوز ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اسے تکمیل تک پہنچنے دو، پھر دیکھنا کہ یہ کیا بنتا ہے:۔

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا وہ مشت خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

ان حقائق کی روشنی میں دیکھئے کہ ملائکہ کی "ابھی" میں کتنے راز سربستہ تھے! انہوں نے عرض کیا تھا کہ بارالہا!:۔

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی نقش گر ازل تیرا نقش ہے ناتمام ابھی

عقل حیلہ جو کی اس بے زمامی، عشق انسانیت ساز کی اس بے مقامی، اور آدم کی ناتمامی کا نتیجہ یہ ہے کہ:۔

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

دانش و دین و علم و فن، بندگیٔ ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز، پردگیٔ نیام ابھی! (بالِ جبریل ص۱۴۸)

ملائکہ کی اس عرضداشت میں اتنا ہی نہیں کہا گیا کہ آدم کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہے کہ فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کی ابلیسی قوتیں ساری دنیا میں برہنہ رقص کر رہی ہیں۔ انہوں نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ جب آدم تکمیل تک پہنچ گیا تو ان میں سے کوئی قوت بھی باقی نہیں رہے گی۔ انہوں نے بھی زیر لب یہی کہا تھا کہ بارالہا! اس میں اس قدر

تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔؟ ص۱

ملائکہ کی اس عجلت پسندی کے جواب میں، اگلی نظم میں، جس کا عنوان ہے، "فرمانِ خدا (فرشتوں سے) ایک اور بسیط حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے بڑی تخریب انگیز

فرمانِ خدا

غلط فہمیاں پیدا ہوتی" (یا پیدا کی جاتی) ہیں، اور ہمارے "تشدد" پسند کمیونسٹ تو اس شعر کو گلی گلی، کوچے کوچے، گاتے پھرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو! خدا خود "جلاؤ، گھیراؤ" کے طریق کی تاکید کرتا، بلکہ فرشتوں کو ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے اور اقبالؒ اس پیغام کو عام کرتا ہے کہ:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

خدا کے کائناتی ارتقاء کے پروگرام کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کی رُو سے) بڑی سست ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲/۴۷) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا (۷۰/۴)۔ اگر اس پروگرام میں انسان کے دست و بازو بھی شریک ہو جائیں، تو پھر یہ مدت انسانوں کے حساب و شمار کے دنوں میں سمٹ آتی ہے۔ انسانی دنیا میں اس قسم کا انقلاب جماعتِ مومنین کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ لوگوں کے قلب و دماغ میں انقلاب پیدا کیا جاتا ہے اور ذہنیتوں کے اس انقلاب سے، قوم میں تعمیری انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ یہ طریقِ کار خود خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۔۔۔۔ (۱۳/۱۱) "خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ اپنی ذہنیت میں (نفسیاتی) تبدیلی نہ پیدا کر لے"۔ اس طریقِ انقلاب میں کسی قسم کی تخریب نہیں ہوتی، تباہی نہیں ہوتی، فساد نہیں ہوتا، خونریزی نہیں ہوتی۔

لیکن اگر انسانوں کی ایسی جماعت کھڑی نہ ہو۔ اور دوسری طرف، سلب و نہب کی خون آشام قوتیں حد فراموش ہوتی چلی جائیں، تو پھر مظلوم و محتاج عوام، تنگ آ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور بپھرے ہوئے سیلاب

ص۱ بالِ جبریل ہی کے اس شعر کو دیکھئے:

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا　　کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

اور جس تپش و خلش اور سوز و گداز کی یہ فغانِ سحری تخلیق ہے، اس کا اندازہ لگائیے!

کی طرح ہر اس چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے ہیں جو ان کی لپیٹ میں آجائے۔ وہ سیلاب نہ مسجد و مندر میں تمیز کرتا ہے، نہ ظالم اور مظلوم میں تفریق۔ ان کے جنون خیز پروگرام میں، تخریب ہی تخریب ہوتی ہے تعمیر نہیں ہوتی۔ یہ انقلاب نہیں ہوتا، فساد ہوتا ہے، عام اصطلاح میں اسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے اور قرآن کی اصطلاح میں "عذاب لانے والے ملائکہ"۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کا (وسیع پیمانے پر) "فساد" روس میں برپا ہوا جسے اقبالؒ نے دلوں کہئیے گویا، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی نگہ حقیقت بین و دوررس نے دیکھا کہ اس پروگرام میں لَا ہی لَا (یعنی تخریب ہی تخریب) ہے۔ اِلَّا (مثبت یا تعمیر) کا شائبہ تک نہیں۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ

(پس چہ باید کرد)

میں نے ان کے پروگرام کی مختلف کڑیوں پر غور کیا ہے۔ وہ ظلم و استبداد کی حکومتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ قوتیں، مذہبی پیشوائیت کے سہارے مصروف جور و ستم رہتی ہیں۔ اس لئے وہ مذہب کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں، لیکن ان کا جوشِ جنون یہیں تک نہیں رہتا۔ آگے بڑھتا ہے۔ وہ خود خدا کی ہستی کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے ضوابطِ اخلاق و اقدار کو مسترد کر دیا ہے۔ لینن کے الفاظ میں، جو اس نے ۱۹۲۰ء میں، یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانفرنس میں، نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے:-

"ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت سرچشمہ (یعنی وحیٔ خداوندی) یا طبقاتی تصوّر کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے۔ یہ تصوّر زمینداری اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفّظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔۔۔۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکام خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔۔۔۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔" (بحوالہ۔ نظامِ ربوبیت۔ صہ۳۳)

یہ ٹھیک ہے کہ اخلاق کا جو ضابطہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، وہ نظامِ ملوکیت اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفّظ کی ضمانت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ لیکن اسے مسترد کرتے ہوئے، خدا اور مستقل اقدار سے انکار کر دینا، شدّتِ جنون کا نتیجہ ہے۔ جب اخلاق و اقدار کے وجود سے انکار کر دیا جائے تو پھر معاشرہ میں تبدیلی

لانے کے لئے، تشدد اور تلوار کے سوا کون سا طریق رہ جاتا ہے؟ لینن نے، انجلز کے ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"انقلاب، ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصہ، دوسرے حصہ پر اپنا اختیار اور تسلط، قوت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی قائم کرتا ہے"۔ (نظامِ ربوبیت - صفحہ ۳۴۰)

روس کا یہی وہ لا کا پروگرام تھا جس کے نتائج و عواقب سے متنبہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے اس سے کہا تھا کہ، یاد رکھو! :-

در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا برگ و سازِ امتاں نفیِ بے اثبات، مرگِ امتاں

اس کے بعد کہا :-

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے جستۂ او را اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی؟ فرمایا

داستاں کہنہ شستی باب باب فکر را روشن کن از امّ الکتاب

(اقبالؒ اور قرآن ص۱۸۸ جلد ۱)

ان تصریحات کی روشنی میں کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ اقبالؒ کمیونزم کا حامی اور اس کے "جلاؤ گھیراؤ" کے تشدد آمیز طریق کار کا مؤید تھا؟ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ شمس الدین حسن نامی ایک کمیونسٹ نے اپنے ایک مضمون میں لکھ دیا کہ "اقبالؒ ایک اشتراکی ہی نہیں، بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔" علامہ اقبالؒ نے ایک دن کے بھی توقف کے بغیر، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ زمیندار میں حسبِ ذیل خط شائع کرا دیا۔

(۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآنِ مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۲) روسی بالشوزم، یورپ کی ناعاقبت اندیشی اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم، دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہمیں بتائی ہے"۔

(اقبالؒ اور قرآن۔ صہ ۱۹)

اس کے بعد آپ اس نظم کی طرف آئیے جس کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لئے اس طولانی تمہید کی ضرورت لاحق ہوتی۔ اس نظم میں درحقیقت، عالمگیر انسانیت کو متنبہ (WARN) کیا گیا ہے کہ اگر تم نے مستبد قوتوں کی دراز دستیوں کو نہ روکا، تو زمانے کے تقاضے، ایسا سیلاب بلا بن کر اُبھریں گے جس کے سامنے انسانیت کی کوئی متاعِ حیات کبھی ٹھہر نہیں سکے گی۔ یہ وارننگ قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے ان الفاظ میں دی تھی کہ:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۸/۲۵)

"اس فتنہ سے بچنے کی کوئی حفاظتی تدبیر کر لو، کہ جب وہ آتا ہے تو اپنے آپ کو ظالموں تک ہی محدود نہیں رکھا کرتا۔ وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات، بڑی قوتوں کا مالک بھی ہے اور مجرموں کا پیچھا کرنے میں انتھک بھی" ——

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

خدا کے اس جلالی قانونِ مکافات کی تشریح حضورؐ نے ایک نہایت دلنشین مثال کی رُو سے فرمائی۔ ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا:۔

"کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اُوپر کے حصے میں پہنچ گئے۔ کچھ نیچے کے حصے میں۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اُوپر گئے۔ اُوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا:۔ بہت اچھا، ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس اقدام سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ اُوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر روک دیا گیا، تو سب بچ جائیں گے"۔

(ترمذی۔ جلد دوم۔ باب الفتن)

یہ نتیجہ ہوتا ہے اس طوفان کا جو زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہونے والے، عوام کے ہاتھوں برپا ہوتا ہے اور جس کی شعلہ فشانیوں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا۔

ان تشریحات کی روشنی میں اس نظم کو دیکھیے جس کا مفہوم سمجھنے میں، میں سمجھتا ہوں، اب آپ کو کوئی دقّت نہیں ہو گی۔ نظم کا عنوان ہے۔

فرمانِ خدا ـ فرشتوں سے

اُٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے ۔۔۔ کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ ۔۔۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی ۔۔۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے ۔۔۔ پیرانِ کلیسا کو، کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے ۔۔۔ بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے ۔۔۔ میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیبِ نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

یوں تو اقبالؒ کا پیغام، پوری نوعِ انسان کے لئے تھا لیکن اس کی اوّلین مخاطب، ملّتِ اسلامیہ (مسلمانوں کی قوم تھی) جو، ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، تینوں کی صید زبوں تھی۔ یہ موضوع ایک مستقل تصنیف کا متقاضی ہے اور میں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ اس مظلوم و مقہور قوم سے کہتے ہیں: ـــ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری ۔۔۔ اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری (جاوید نامہ)

ہ۱ ایک مشہور شعر ہے: ـــ

زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند ۔۔۔ حق را بسجودے و نبیؐ را بدرودے!

ہ۲ ضربِ کلیم میں ہے: ـــ

اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے ۔۔۔ ہے ان کی نمازوں سے محراب تُرش ابرو

اقبالؔ نے ملائی و پیری کے خلاف جو کچھ کہا ہے ، اسے تو سرِ دست چھوڑیئے - اس نے سلطانی (ملوکیت یا شہنشاہیت) کے خلاف جو بات کہی ہے ، میری نظر سے اس کی مثال کہیں نہیں گذری - ہمارا آج کا موضوع "محتاجی" ہے - یہ

گدائے بے حیا

خیال عام ہے کہ اور لوگ تو ، کم و بیش ، کسی نہ کسی کے محتاج ہوتے ہیں - لیکن بادشاہ (سربراہِ مملکت) کسی کا محتاج نہیں ہوتا - سب اس کے محتاج ہوتے ہیں - اقبالؒ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے - وہ سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے - قبل اس کے کہ ہم اس نکتہ کی تائید میں اقبالؒ کے دلائل تک پہنچیں ، اصولی طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ محتاج کسے کہتے ہیں - مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو شخص اپنی محنت سے رزق حاصل کرتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا (یہ اور بات ہے کہ اس کا رزق چھین کر اسے محتاج بنا دیا جائے) محتاج وہ ہوتا ہے جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے - محتاج کی اس DEFINITION کے بعد ، جس کے حقیقت ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا ، بالِ جبریل کی اس نظم کو سنیئے جس کا عنوان ہے ، گدائی ـــــ سنیئے ، اور محوِ حیرت رہ جائیے کہ ہم کیا سن رہے ہیں ، محوِ حیرت ہی نہیں بلکہ قدرے محجوب بھی کہ ایسی بدیہی بات ، اس سے پہلے ہماری سمجھ میں کیوں نہ آئی ! جس قدر اس کا موضوع انوکھا ہے اسی قدر اس کا اندازِ بیان بھی شوخ ہے - فرماتے ہیں : ـــ

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا   ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا

ذرا دیکھو کہ : ـــ

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے ؟   کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا ؟
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید   تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی   دینے والا کون ہے ؟ مردِ غریب و بے نوا !
مانگنے والا گدا ہے ! صدقہ مانگے یا خراج   کوئی مانے یا نہ مانے ، میر و سلطان سب گدا [۱]

ایک غزل میں وہ باندازِ دگر اسی خیال کو پیش کرتے ہیں ، جہاں لکھتے ہیں : ـــ

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے !   خراج کی جو گدا ہو ، وہ قیصری کیا ہے !

---

[۱] بالِ جبریل میں ، نظم کے آخر میں لکھا ہے (ماخوذ از انوری) لیکن اقبالؒ نے دیگر متعدد مقامات پر بھی اس موضوع کو پیش کیا ہے -

ایک اور شعر: ؎

کسے نہیں ہے تمنائے سروری، لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

خودی کی موت اسی گداگری سے واقع ہوتی ہے۔ اس باب میں، وہ عہدِ قدیم کی ملوکیتؒ اور عصرِ حاضر کی جمہوریتؒ، دونوں کو ہم سنگ قرار دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ ؎

مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

گداگری سے خودی کی موت واقع ہوتی ہے، اور خودی کی موت کے بعد، کمینگی کی زندگی۔ بالِ جبریل ہی میں علامہؒ نے اس نکتہ کو بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

اک مفلسِ خود دار یہ کہتا تھا خدا سے
میں کر نہیں سکتا گلۂ دردِ فقیری!
لیکن یہ بتا، تیری اجازت سے فرشتے
کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری؟

مردِ فرومایہ اس لئے کہ — خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟

قزاقی

ان مقامات میں تو اقبالؒ نے ان والیانِ مملکت کو "گداگر" کہا ہے۔ ضربِ کلیم کی ایک نظم میں وہ انہیں ڈاکو کہہ کر پکارتا ہے۔ سکندر کے سامنے ایک بحری قزاق، مجرم کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے۔ سکندر اس سے کہتا ہے: ؎

صلہ تیرا، تیری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی!

قزاق جواب دیتا ہے: ؎

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی!
کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی، میں دریائی

کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطاں سب گدا!

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جسے سامنے لائے بغیر، آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مملکت تو قرآن بھی قائم کرتا ہے۔ اس مملکت کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔ اس سربراہ کو اپنے گذارے کے لئے بہرحال، مملکت کی آمدنی سے کچھ لینا پڑتا ہے، جو دوسروں کی محنت سے حاصل ہوتی ہے۔ تو کیا اسے بھی "گدا"، کہا جائے گا؟

آپ ان سربراہانِ مملکت کی زندگی کو سامنے لائیے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ انہیں کیا کہا جائیگا؟

خلیفہ کا وظیفہ

حضرت ابوبکرؓ صدیق، منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے سے پہلے، کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور خاصے مرفہ الحال تھے۔ خلیفہ منتخب ہونے کے دوسرے دن حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ وہ کپڑے کا گٹھا اٹھائے بازار کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟ جواب دیا کہ اپنے کام پر۔ انہوں نے کہا کہ خلافت کی ذمہ داریاں قبول کر لینے کے بعد، آپ کا وقت آپ کا نہیں رہا، ملت کا ہو گیا ہے۔ اس لئے آپ اسے ذاتی کام کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا نہ کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کا انتظام کرنا اُمت کے ذمے ہے۔ چنانچہ سوال درپیش ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ، یعنی حق الخدمت کیا ہونا چاہیئے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے کہا کہ اسے میں خود اپنے لئے مقرر کروں گا۔ چنانچہ آپ نے معلوم کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی یومیہ اُجرت کیا ہے! اس کے مطابق آپ نے اپنا وظیفہ مقرر کیا۔ دوسری روایات میں ہے کہ اسے دیگر صحابہؓ نے مقرر کیا تھا اور معیار تھا کہ قریش کے معمولی فرد کا اندازِ زندگی۔ کچھ بھی تھا۔ جب آپؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے اعزا سے کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے مسلمانوں کے بیت المال میں سے لیا ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں، اس کے متعلق قیامت میں بازپرس ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا حساب یہیں چکا دیا جائے۔ ایک مختصر سا قطعۂ زمین میرے پاس ہے۔ اسے فروخت کر دیا جائے اور جس قدر رقم میں نے بیت المال سے لی ہے اسے واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے لئے جو وظیفہ مقرر کیا تھا، وہ یہ تھا:۔

> "کپڑوں کے دو جوڑے، ایک سردی کا ایک گرمی کا، حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں جو ان کا حال سو میرا حال"۔

اس اُجرت کے عوض کام کتنا؟ بائیس لاکھ مربع میل پہ پھیلی ہوئی مملکت کا نظم و نسق۔ ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم۔۔۔۔ کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پالان پر سوار تیز تیز جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، امیر المؤمنین! کدھر؟ کہنے لگے بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے، اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔

حضرت علی رضؓ نے کہا کہ آپ نے کسی اور سے کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ اس اونٹ کو تلاش کرے ۔ آپ نے کہا کہ بخدا ! یہ تو ایک اونٹ ہے ۔ اگر بیت المال کی ایک بکری بھی کہیں گم ہو گئی تو عمر رضؓ سے اس کی بھی بازپرس ہو گی !

امیر المؤمنین ، دن بھر اس قسم کے فرائض سرانجام دیتے تھے ، اور راتوں کو گشت کرتے تھے تاکہ رعایا کا حال براہِ راست معلوم کیا جائے اور ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں توقف یا تاخیر نہ ہو ۔ یہ اسی قسم کی گشت کا واقعہ ہے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک خیمہ میں ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے پاس بیٹھے رو رہے ہیں ۔ آپ کے استفسار پر اس نے کہا کہ کئی وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا ۔ میں نے خالی ہنڈیا میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے ۔ حضرت عمر رضؓ اُٹھے ۔ بیت المال سے آٹا ، گھی ، کھجوریں لیں اور اپنے خادم ، اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو ۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دے دیجئے ۔ میں لے جاتا ہوں ۔ فرمایا ، اسلم ! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے ۔ اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے ۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھا کر لے جانے دو ۔ (شاہکار رسالت صت۳)

" اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں ہر ایک کو اپنا اپنا بوجھ آپ اٹھانا پڑے گا "

یہ تھیں وہ خدمات جو یہ سربراہانِ مملکت سرانجام دیتے تھے ۔ ان خدمات کی اُجرت میں جو کھانا منظور کرایا تھا ، اس کی نوعیت یہ تھی کہ ایک دن مصر کا گورنر ملنے کے لئے آیا تو آپ کھانا کھا رہے تھے ۔ کھانے میں جَو کی روٹی ، زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا ۔ اس نے کہا کہ امیر المومنین ! آپ رضؓ گیہوں کے آٹے کی روٹی کیوں نہیں کھاتے ؟ آپ رضؓ نے کہا کہ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے ؟ اس نے کہا کہ ایسا تو میں نہیں کہہ سکتا ! اس پر آپ رضؓ نے فرمایا :-

" عمر رضؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جَو کی روٹی مل رہی ہے ۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جب اسے اس کا اطمینان ہو جائیگا کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی میسر آرہی ہے ۔"

آپ نے غور فرمایا کہ جو کچھ رعایا سے لیا جا رہا ہے اس کے عوض میں خدمات کس قدر انجام دی جا رہی ہیں کیا کسی کو ایسے کاموں کے لئے اتنا سستا مزدور مل سکتا تھا ؟ سستا بھی اور پھر امین بھی ! خدمت کے بغیر کچھ لینا تو ایک طرف ، وہ تو خدمت کے بغیر مملکت کے لئے بھی کچھ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے ! اس ضمن میں ایک آزاد شدہ غلام (سعید

خدمت کے بغیر کچھ نہیں

کا بیان کردہ واقعہ بڑا البصیرت افروز ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں آزادی حاصل ہونے کے بعد، حکومت کے واجبات کی رقم ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اُٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں! ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ———— اس پر آپ نے فرمایا کہ "پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ۔ جب تمہیں حکومت کی طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لانا"۔

(شاہکار رسالت صد ۳۶۸)

آپ نے دیکھا کہ سربراہِ مملکت تو ایک طرف، وہاں خود مملکت بھی نہ گداگر ہوتی تھی؛ نہ قزاق۔ وہ حق الخدمت لیتی تھی اور یہ نہ محتاجی ہوتی ہے نہ گداگری!

نہ محتاج نہ ذلیل

اور جب اس مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا، تو کوئی ذلیل بھی نہیں ہوتا۔ وہ مملکت، احترامِ آدمیت کی زبانی دعویدار نہیں تھی۔ عملاً بھی اس کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ حمص کے حاکم، حضرت عمیر بن سعدؓ کے منہ سے ایک غیر مسلم (ذمّی) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے۔ اخزک اللہ "خدا تجھے ذلیل کرے"! سہواً یہ الفاظ تو زبان سے نکل گئے، اس کے بعد اس قدر ندامت اور تأسف ہوا کہ بابِ خلافت میں آکر استعفےٰ دے دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ جو احترامِ آدمیت نہیں کر سکتا وہ خود بھی کسی عزت و احترام کا مستحق نہیں۔

یہ تھے وہ حکمران جو نہ گداگر تھے، نہ قزاق۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند　　　در شاہنشاہی، فقیری کردہ اند

اور یہ تھی وہ مملکت جو اس بنیاد پر قائم ہوئی تھی کہ ؎

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس　　　نکتۂ شرعِ مبیں، ایں است و بس

وہ جانتے تھے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور شریعتِ حقہ کا مقصود و منتہا کیا ہے!

عزیزانِ من! وقت تھوڑا ہے اور داستان دراز۔ اس لئے مجھے اختصار سے کام لینا ہے۔

ابھی تک ہم محنت کشوں کی محتاجی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کا اگلا گوشہ، مالکانِ زمین اور مزارعین کی کشمکش ہے۔ اس باب میں قرآن مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ زمین، تمام نوعِ انسان (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سرچشمۂ رزق ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اور جب کوئی شخص زمین کا مالک نہیں ہو

سکتا تو، مالک اراضی اور مزارع کی کش مکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں بھی اس موضوع پر بڑی تفصیل سے آیا ہے اور علامہ اقبالؒ نے بھی اس پر شرح و بسط سے لکھا ہے (تفصیل اس کی میری کتاب، نظامِ ربوبیت میں ملے گی) میں یہاں اس کے صرف ایک مقام پر اکتفا کروں گا۔ سورۂ واقعہ کی چند آیات میں قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ:-

تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے اور سوچو کہ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے کسب و ہنر کے مطابق۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے؟ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا ایسا تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ہوتا ہے۔ أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ۝ (۵۶/۶۳-۶۴)

اس کے بعد کہا کہ تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں، خود تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے۔ أَفَرَءَيْتُمُ ٱلْمَآءَ ٱلَّذِى تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ ٱلْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنزِلُونَ ۝ (۵۶/۶۸-۶۹)

اس کے بعد کہا کہ...... تم اس آگ (حرارت) پر غور کرو جس سے تم اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں مستور کر دینا، تمہاری کاریگری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔ أَفَرَءَيْتُمُ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى تُورُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنشِـُٔونَ ۝ (۵۶/۷۱-۷۲)

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر! تم کسی نہج سے بھی غور کرو۔ بہرحال، اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا اس ماحصل میں تمہارا حصہ صرف تمہاری محنت کے بقدر ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو، اور ہمارا حصہ...... ہمیں دے دو! سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ تک کیسے پہنچائیں؟ جواب دیا: مَتَٰعًا لِّلْمُقْوِينَ ۝ (۵۶/۷۳) یہ انہیں دے دو جو اپنا رزق پیدا کرنے سے معذور ہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ

ہم تک پہنچ گیا۔
علامہ اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بالِ جبریل کی اس نظم میں بڑی برجستگی سے بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے۔

اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ !

اور نظم یہ ہے :-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

(بالِ جبریل ص ۱۶۱)

جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی تو کسی مزارع کو زمین، بٹائی یا پٹہ پر دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ابوداؤد میں حضرت ابن ابی نعیم کی روایت ہے کہ :-

"رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت کی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف سے ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے۔ اور کھیتی کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔" (شاہکارِ رسالت۔ ص ۳۸۲)

جب زمین پر کسی کی ملکیت ہی جائز نہیں، تو کوئی شخص نہ زمیندار ہو سکتا ہے، نہ اس کا کوئی مزارع۔ لہٰذا نہ وہ اس کا محتاج ہوگا، نہ وُہ اِس کا۔ کس نگر و در جہاں محتاجِ کس۔

اور آخر میں ہمارے سامنے وہ گوشہ آتا ہے جو ان تمام خباثت اور مفاسد کی جڑ اور بنیاد ہے۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری۔ قرآن کریم نے معاشی نظام کا بنیادی اصول یہ بتایا ہے کہ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳:۳۹)

معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ اس کے برعکس، نظام سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ معاوضہ سرمایہ کا ہے یعنی ایک شخص سرمایہ لگاتا ہے اور دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں، خواہ اس کی شکل انڈسٹری (کارخانہ داری) کی ہو، اور خواہ کامرس (تجارت) کی۔ یہ شخص ان محنت کشوں کی محنت کے ماحصل میں سے معتدبہ حصّہ لے جاتا ہے اور اسے اپنے سرمایہ کا معاوضہ کہتا ہے۔ قرآن کریم اسے ربٰو کہہ کر پکارتا ہے اور نہ صرف اسے حرام کہتا ہے بلکہ اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیتا ہے۔ سرمایہ، دولت جمع کرنے کا نام ہے اور قرآن کریم دولت جمع کرنے کو، جرم عظیم اور عذاب جہنم کا مستوجب ٹھہراتا ہے۔ قرآن مجید کی بکثرت آیات اسی موضوع پر ہیں۔ میں اس وقت صرف ایک آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ (۹/۳۴-۳۵)

"جو لوگ سونا چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے (یہ عذاب اس دن واقع ہوگا) جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکّوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائیگا۔ اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اس جمع شدہ دولت کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو"۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، قرآن مجید میں اکتناز دولت کے خلاف اس قدر آیات ہیں، کہ ان کی روشنی میں اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی دقّت پیش نہیں آتی کہ قرآن کریم نظام سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اگرچہ مجھے اس کے بعد عنان گفتگو اقبالؒ کی طرف موڑ دینی چاہیئے لیکن یہاں ایک ایسا سوال میرے سامنے آتا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے دل میں بھی ابھر رہا ہوگا، جس سے صرف نظر کر کے آگے بڑھا نہیں جا سکتا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ دولت جمع کرنے کے دیگر عنوانات کو چھوڑیئے۔ زکوٰۃ کو اسلام کا ایک ستون قرار دیا جاتا ہے اور زکوٰۃ بہرحال جمع شدہ دولت پر ہی ادا کی جاتی ہے۔ اگر اسلام میں دولت جمع کرنا اس قدر ممنوع ہے تو پھر

زکوٰۃ ادا کرنے کا سوال کس طرح پیدا ہوگا۔ میں سر دست اس موضوع کی طرف نہیں آنا چاہتا کہ قرآن کریم کی رُو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے، اور اس مفہوم کی رُو سے اکتنازِ دولت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں صرف اس قدر بتانا چاہتا ہوں کہ، آیۂ زیرِ نظر کی موجودگی میں زکوٰۃ کس طرح فرض ہوئی؟ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ :-

" (حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ......)
تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دُور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں گذر رہی ہے[ف] آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے...
ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سُن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا........"
(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

اس سے واضح ہے کہ ہماری مروّجہ زکوٰۃ کو (یعنی جمع شدہ مال پر سال کے بعد، اڑھائی فی صد دے دینا) قرآن نے فرض نہیں قرار دیا۔ وضعی روایات کی رُو سے ایسا ہوا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ نظامِ سرمایہ داری جسے ختم کرنے کے لئے اسلام آیا تھا، عین مطابقِ اسلام قرار پا گیا۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی کتاب مسئلہ ملکیتِ زمین، میں لکھتے ہیں :-

" اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔۔۔۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ بلا حدّو نہایت رکھی جا سکتی ہیں، روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ (پہلا ایڈیشن صفحہ ۵۲)
پھر جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو...... نیز وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت

[ف] خدا کا حکم ہے۔ رسول اللہؐ کی لسانِ مبارک سے اور صحابہؓ پر گراں گذرے! (معاذ اللہ)

کرے۔ اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے حقوقِ ملکیت ہی حاصل نہیں۔" (ص ۲۳)
اس سے نظامِ سرمایہ داری (ربوٰ) کے دروازے چوپٹ کھل گئے اور مزارعت (بٹائی یا پٹہ پر زمین کاشت کرانا) اور مضاربت (SLEEPING PARTNERSHIP) سب جائز قرار پا گئے۔ اقبالؒ نے اس کے خلاف مسلسل جہاد جاری رکھا۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ قرآن کریم نے اس کا راستہ ہی بند کر دیا۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ یَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ط .... "اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دیں؟" ... قُلِ الۡعَفۡوَ ..... ط "فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہو، وہ سب!" (۲/۲۱۹)

ہماری ملوکیت نے ان .... آیات کو یا تو منسوخ قرار دے رکھا تھا اور یا محض تلاوت کے لئے برقرار ان کا حکم بہرحال منسوخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس اُمت میں بھی نظامِ سرمایہ داری رائج رہا اور باقی دنیا بھی قرآنی نظام کی برکات سے محروم رہی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اگر کوئی جماعت، قرآنی نظام کو قائم کرنے کے لئے نہیں اٹھتی، تو کائناتی قوتیں یا زمانے کے تقاضے، انسانوں کو اس کی طرف آنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔ روس کا انقلاب انہی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس میں فاضلہ دولت کے نظریہ کو شدت سے مسترد کیا گیا تھا۔ اقبالؒ نے اسی کے پیشِ نظر کہا تھا کہ :-

قوموں کی روش سے ہے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم   بے سُود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر   کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں   اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

ہمارے ہاں آجکل معاشرہ کے ہر جزو اور کُل کو "مسلمان کرنے" کا جنون اعصاب پر سوار ہے۔ معاشیات

ربوٰ

اس کا خاص طور پر ہدف ہے۔ اس سلسلہ میں سود کے مسئلہ پر بڑی طول و طویل بحثیں ہو رہی ہیں۔ پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ یہ کچھ اس مسئلہ کے متعلق ہو رہا ہے جسے قرآن کریم نے دو لفظوں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلامی نظام قائم ہونے سے

پہلے ، عربی معاشرہ میں ربوٰ کا کاروبار عام تھا۔ جب قرآن مجید نے ربوٰ کو حرام قرار دیا اور مملکت کے خلاف بغاوت ، تو سابقہ کاروبار کے سلسلہ میں فرمایا۔ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ؎ .... تم صرف اپنا اصل زر لے سکتے ہو ...... لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ٥ (۲۷۹) اس سے نہ تو تم پر کوئی زیادتی ہوگی کہ تمہیں تمہارا پیسہ واپس مل جائے گا۔ اس میں کچھ کمی نہیں ہوگی اور فریقِ مقابل پر بھی کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہوگی کہ اسے اصل سے کچھ زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔ قرآن مجید کے ان چار لفظوں نے ساری بات واضح کردی۔ جو کچھ راس المال (اصل زر) سے زیادہ لیا جائے گا ، وہ ربوٰ ہوگا ، خواہ اس کی شکل نقدی قرضہ کی ہو ، مزارعت کی ہو ، مضاربت کی ہو ، بینک کی ...... اصطلاح "شرکتِ منافع" کی ہو۔ سب ربوٰ کے زمرہ میں آئے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ سود پر پان پان پر سو صفحات پر مشتمل تصانیف میں ، قرآن کریم کی اس آیت کو کبھی سامنے نہیں لایا جائے گا۔ جو کچھ لکھا جائے گا وہ اس حقیقت کا غماز ہوگا کہ: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

یہ تو تھا سابقہ سودی کاروبار کے متعلق حکم۔ اسلامی نظامِ معیشت میں "قُلِ الْعَفْوَ" نے سارا مسئلہ حل کردیا۔ نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت ہوگی ، نہ اس پر کچھ زائد لینے کا سوال پیدا ہوگا۔ اور نہ ہی کسی کو کسی سے کچھ مانگ کر ذلیل ہونے کی ضرورت پڑے گی۔ اسلامی نظام ہر ایک کی ضرورت ، بطور اس کے حق کے پوری کرے گا۔

انقلابِ روس کے دعاوی میں اقبالؒ کو اسی "قُلِ الْعَفْوَ" کی جھلک دکھائی دی تھی جس سے اس کی خوش نظری نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا تھا کہ: ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ، ساز بدلے گئے

پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں ، میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا!

تماشا دکھا کر مداری گیا!

(ضمناً) "مداری" کا لفظ یوں تو (نظر بظاہر) "سرمایہ داری" کے قافیہ کے لئے لایا گیا ہے ، لیکن اس میں ایک معنوی نکتہ بھی ہے۔ اب تو اس قسم کے مداری نہیں آتے۔ کچھ عرصہ پہلے جو مداری آتے تھے ، وہ خالی ہاتھوں روپے پر روپیہ بناتے چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ روپیہ درحقیقت بنتا نہیں تھا۔ نظر ایسا آتا

تھا کہ روپیہ بن رہا ہے۔ یہی کیفیت نظام سرمایہ داری کی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے: لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ...... (۳/۱۳۰) سمجھا یہ جاتا ہے کہ ربوٰ سے دولت بڑھتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اس سے قومی دولت بڑھتی نہیں، گھٹتی ہے۔ یہ جو دولت بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے، مداری کا "ہتھ ناٹک" ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی نظم میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ: ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

حالانکہ یہ ۳۵-۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ جب ہنوز خود چینیوں کو بھی اس کا احساس نہیں تھا کہ ان کی شب نیرہ و تار کی سحر قریب ہے۔ لیکن قرآنی بصیرت کی روشنی میں حال کے واقعات وحوادث کے تجزیہ سے، مستقبل کے متعلق اس قسم کی قیاس آرائی مشکل نہیں ہوتی۔ اسی بناء پر انہوں نے کہا تھا کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہ روس اور چین کی بات تھی۔ یہ کہتے ہیں کہ مور جنگل میں ناچتا ہے تو اپنے رقص کی نازک خرامیوں اور اپنے رنگین پروں کی جلوہ پاشیوں میں وہ ایسا کھو جاتا ہے کہ اسے ماحول تو ایک طرف، خود اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں رہتا لیکن اس کے بعد جب اس کی نگاہ اپنے پاؤں پر پڑتی ہے تو رقص ختم ہو جاتا ہے۔ پر سمٹ جاتے ہیں۔ اور وہ نہایت پژمردگی کے عالم میں نگوں سار ہو جاتا ہے۔

حضرت علامہؒ — زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے — کی وجد آفرینیوں میں محو تھے کہ ان کی نگاہ ملتِ اسلامیہ پر پڑی۔ کیف و مستی کا وہ عالم، رقصِ طاؤس کی طرح مرجھا گیا اور انتہائی سوز و گداز سے پکار اٹھے کہ ؎

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا لُغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے! (بال جبریل ص۱۶۸)

مشیرانِ ابلیس کی زبان میں : ؎

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود — ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

(ارمغانِ حجاز)

اور خود ابلیس کے الفاظ میں :۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں"

ایسے یاس انگیز حالات میں بڑے بڑے اربابِ عزم کے سینوں میں بھی اُمید کی کرن بجھ کر رہ جاتی ہے، لیکن اقبالؒ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کا ایمان اور پیغام یہ تھا کہ : ؎

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زماں پیشِ نظر، لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادُ دار

وہ قوم کے بڑے بوڑھوں سے نا اُمید ہوا تو اپنی توجہ کا مرکز آنے والی نسل کے نوجوانوں کو قرار دے لیا۔ وہ خدا سے پورے عجز و الحاح کے ساتھ دعائیں مانگتے تھے کہ : ؎

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن! — دارم از روزے کہ می آید، سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا — بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اور : ؎

جوانوں کو میری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور بالِ جبریل (کے ساقی نامہ) کی اسی نظم میں، جو ابھی ابھی فردوسِ گوش بن رہی تھی، کہا کہ : ؎

خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت حالات اُس زمانے سے بھی کہیں زیادہ مایوس کن ہیں، جب علامہؒ پیرانِ کہن سے نااُمید ہوئے تھے، لیکن ان کی یاد میں اس تقریب کو افسردہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کا اختتام ان کی اس دعا پر کرنا چاہتا ہوں جو ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھری تھی۔ یعنی: ؎

تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر! زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں! مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز مری خلوت و انجمن کا گداز!
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری! اُمیدیں مری، جستجوئیں مری!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

ایک سوال

میرا خطاب تو ختم ہؤا، لیکن ایک سوال ہے جو مجھ سے ایک عرصہ سے پوچھا جا رہا ہے اور میں اسے اب تک ٹالتا چلا آیا ہوں۔ لیکن اب اس کے تقاضے اس قدر شدید ہو گئے ہیں کہ مجھے (بادلِ ناخواستہ) اسے سامنے لانا پڑ رہا ہے۔ سوال کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں کہ "ہم برسوں سے آپ کے درس میں بھی اور دیگر تقاریب میں بھی آپ کی زبانی پیغامِ اقبالؒ سُنتے چلے آ رہے ہیں، اور آپ کی تحریروں میں پڑھتے بھی ہیں۔ آپ کو جس قدر اقبالؒ پر عبور ہے اور اسے آپ جس انداز سے قرآن مجید کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ملک میں علامہ اقبالؒ سے متعلق اتنی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ آپ ان میں کیوں شریک نہیں ہوتے تاکہ اس پیغام کا دائرہ وسیع ہو۔"

جواب: اس سوال کا دو لفظوں میں جواب یہ ہے کہ ان تقاریب میں وہی شریک ہو سکتا ہے۔ جسے

شرکت کی دعوت دی جائے۔ مجھے دعوت نہیں دی جاتی . . . . اس لئے میں ان میں شریک نہیں ہوتا۔

لیکن اس پر مجھ سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو دعوت کیوں نہیں دیتے؟ اس کا پھر دو لفظی جواب یہ ہے کہ یہ اُن حضرات سے پوچھئے کہ وہ مجھے دعوت کیوں نہیں دیتے؟ لیکن چونکہ اس سے بھی مستفسرین کا اطمینان نہیں ہوگا اس لئے جو کچھ میں سمجھتا ہوں اسے عرضِ خدمت کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ حضرات مجھے اس لئے نہیں بلاتے کہ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن کریم پیش کرتا ہوں (خواہ اس کا واسطہ کلامِ اقبالؒ ہو یا پیغامِ قائد اعظمؒ) اور قرآن ہماری قوم کے مزاج کے موافق نہیں۔ اس لئے ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس کی آواز عام نہ ہونے پائے۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ میرے ہاں اپنے ذرائع ابلاغ موجود ہیں۔ لیکن اس سے جس طرح قوم اقبالؒ کی قرآنی فکر سے محروم رہ جاتی ہے اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اقبالؒ سے متعلق تقاریب ہوں یا قائد اعظمؒ سے متعلق انہیں رسمی طور پر منایا جاتا ہے اور یہ بھی اس وقت تک کیا جائے گا جب تک اس سے کچھ مفاد حاصل ہوتے ہوں۔ اس کے بعد فقط تاریخ کی کتابوں میں ان کے نام رہ جائیں گے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ داتا گنج بخش (علیہ الرحمۃ) کا عرس تو اس قدر دھوم دھام سے منایا جاتا ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق اتنا بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ وفات (یا شہادت) کون سی ہے! دو ایک سال اُدھر سے یومِ صدیقؓ اور یومِ فاروقؓ کی آوازیں تو سنائی دینے لگی ہیں لیکن بڑی مدہم سی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ داتا صاحب (علیہ الرحمۃ) کی تقاریب کے سلسلہ میں لاکھوں روپے کی یافت ہوتی ہے اور صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی یاد منانے میں (کچھ ملنا تو ایک طرف) گرہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے یا چندہ جمع کرنا۔ اگر اقبالؒ کی تقاریب کے سلسلہ میں بھی یہ صورت پیدا ہوگئی تو اس کی آواز صرف قوالوں کی ڈھولک کی تھاپ پر سنائی دیا کرے گی کہ "طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون ہے۔"

ہماری قوم کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ ——— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں ——— اور قرآن کریم کو تلاوت تک، اور اقبالؒ کو شاعری تک محدود (بلکہ محبوس) رکھنے سے بھی مقصد یہی ہے۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ قوم کی اسی ذہنیت کے پیشِ نظر، علامہ نے کہا تھا کہ: ؎

اقبالؒ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا ——— موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے ——— پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں آخری ریزولیشن یہ پاس ہوا تھا کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اقبالؒ سے متعلق تقاریب بھی اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اس نے سچ کہا تھا کہ: ؎

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی!
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی!

یہ اس لئے کہ: ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

نتیجہ اس کا یہ کہ: ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی!

اور: ع

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

— والسلام —

پرویز

بسلسلہ یوم آزادی
۱۴ اگست ۱۹۸۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کا مطلب کیا؟

لا الٰہ الا اللہ!

یوم آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں ہم اپنے خیالات و جذبات کا اظہار طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء کے لمعات میں کر چکے ہیں۔ وہ سطور ماہ جولائی میں رقم ہوئی تھیں، لیکن جب ۱۴ اگست کی صبح نمودار ہوئی تو ہماری کیفیت یہ تھی کہ ؎

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب — آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

لیکن ہم نے ان طوفانوں کو پھر قطرات میں منتقل کر دیا کہ صبر طلبی عشق کا یہی تقاضا تھا۔

ابھرنے کو تو تحریک پاکستان کی بہت سی یادیں افق سینہ سے ابھریں، لیکن ان میں سر فہرست وہ چند الفاظ تھے جن میں پاکستان کا مفہوم، مطلوب و مقصود اس جامعیت سے سمٹا دیا گیا تھا، جس کی مثال کم ملے گی۔ معلوم یہ الفاظ کس نے کہے تھے، لیکن تھے ایسے مقبول کہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں میں سے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ وہ الفاظ تھے:-

پاکستان کا مطلب کیا؟ — لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

ل؎ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ۱۲ اگست ۱۹۸۱ء کی شب کو لاہور ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے ایک انٹرویو میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس ترانہ کے خالق پروفیسر اصغر سودائی ہیں۔ جنہوں نے اسے ۱۹۴۴ء میں لکھا۔ ہم سودائی صاحب کی خدمت میں، ان کی اس زندہ جاوید تخلیق پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے آرزو مند ہیں کہ خدا اس قوم کو، اس "سودائی" کی کہی ہوئی بات سمجھنے کا شعور عطا فرمائے۔

تحریکِ پاکستان کے دوران تو پاکستان کا مطلب — لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ — کہہ کر سمجھا دیا گیا، لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد کسی نے یہ نہ سمجھایا کہ خود لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب کیا ہے؟ تحریکِ پاکستان کے دوران، داعیانِ پاکستان اور اس کے مخالف علماء (مذہبی پیشواؤں) کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ ہی لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب اور مفہوم تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی "پرستش" جائز نہیں اور داعیانِ پاکستان کہتے تھے کہ اس کا مطلب ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) یعنی خدا کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو "خدا کی پرستش" کی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے معتقدات میں کوئی دخل نہیں دے گا۔ وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ شعائر و ارکانِ اسلام کی ادائیگی پوری آزادی سے کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات ان کے فقہی قوانین کی رُو سے طے پائیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ اسی کا نام اسلام ہے۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا یہی مطلب ہے۔ اور اس کے لئے مسلمانوں کو الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔

ہم اُن سے کہتے تھے کہ اِلٰہ کے معنی پرستیدہ (جس کی پرستش کی جائے) اور عبادت کے معنی پرستش نہیں۔ اِلٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار یا حکمران کے ہیں، اور عبادت کا مفہوم ہے محکومیت۔ اس اعتبار سے لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ اور عبادت سے مُراد ہے خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ خدا کی حکمرانی کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآن مجید) کی حکومت ہے اور اسلام سے مُراد ہے قرآن مجید کی حکمرانی۔ اس اسلام کی اجازت، کوئی مملکت بھی نہیں دے سکتی۔ نہ ہی کسی غیر مسلم مملکت میں اس کا امکان ہے۔ کتاب اللہ کی رُو سے، کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ "انسانوں کی حکومت" کی کوئی شکل ہو، قرآن کی رُو سے اس کی اطاعت، غیر اللہ کی اطاعت، فلہٰذا کفر اور شرک ہے۔ "انسانوں کی حکومت میں، عہدِ پارینہ کی ملوکیت سے لے کر عصرِ حاضر کی جمہوریت تک، سب شامل ہیں۔ حتیٰ کہ فقہی قوانین کی اطاعت بھی انسانوں کی اطاعت ہے کیونکہ وہ قوانین بھی ان ماہرینِ قوانین کے وضع کردہ ہیں جو انسان ہی تھے۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا صحیح مطلب، قرآنی حکومت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اور اس قسم کی حکومت اپنی آزاد مملکت میں ہی قائم ہو سکتی ہے۔ اسلام کا یہی تقاضا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ تھا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران، حقیقی نزاع، لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے مطلب کا یہی اختلاف تھا۔ یہ جنگ اوّل

تو انگریز یا ہندو کے خلاف تھی ہی نہیں کیونکہ وہ مذہبی سطح پہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اور اگر تھی بھی تو اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ بنیادی جنگ، داعیانِ پاکستان اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کے مابین تھی۔ ہندو اگر اس مطالبہ کے خلاف کبھی مذہبی دلیل پیش کرتا تھا تو اس لئے کہ اس کے مذہب کی رُو سے، مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اور یا اس لئے کہ خود مسلمانوں کے علماء یہی دلیل پیش کرتے تھے (مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے نزدیک، اسلام کا ماحصل "خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی" تھا۔ (یعنی وہی "پرستش" کا تصور)۔ ان کے پیش کردہ اس تصور کو ہندوؤں نے اپنے اہتمام سے سارے ملک میں عام کیا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پہ مسلمانوں کی جُدا مملکت کا تصور پیش کیا تھا، تو ایسا اچانک یا کسی ہنگامی جذبہ کے تحت نہیں کیا تھا۔ اُن کی ساری عمر "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا مطلب سمجھانے میں گذر گئی تھی۔ انہوں نے (مثنوی رموزِ بے خودی) میں پہلے یہ بتایا کہ نزولِ قرآن سے پہلے انسانوں کی حالت یہ تھی کہ ؎

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست

اس میں "انساں پرست" کا ٹکڑا غور طلب ہے۔ اس میں ہر قسم کی انسانی حکومت آجاتی ہے۔ یعنی ؎

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش

یہ ملوکیت کی "انسان پرستی" (غلامی اور محکومی) تھی۔ اس کے ساتھ ؎

کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

یہ تھیا کریسی (یعنی مذہبی پیشواؤں کے فقہی قوانین) کی محکومی تھی۔ ملوکیت اور تھیا کریسی کے گٹھ جوڑ سے حالت یہ ہو چکی تھی کہ ؎

صاحبِ اورنگ و ہم پیر کنشت باج بر کشتِ خراب او نوشت

در کلیسا اُسقفِ رضواں فروش بہرِ ایں صید زبوں دامے بدوش

(رموزِ بے خودی۔ صہ ۱۱۹)

غریب و مُفلس۔ محنت کش و مزدور۔ مزارع و کاشتکار بیچارے، دونوں ہاتھوں سے لٹتے تھے۔ ایک طرف حکومت اپنے ٹیکس وصول کرتی تھی۔ دوسری طرف مذہب کے نام پہ، ان کا خون نچوڑا جاتا تھا اس

کا نتیجہ یہ تھا کہ ؎

از غلامی فطرتِ اُو دوں شدہ ‏ ‏ ‏ ‏ نغمہ ہا اندر نئے اُو خوں شدہ (ایضاً)

نزولِ قرآن کے وقت ... انسان کی یہی حالت تھی۔ وہ ایک طرف مستبد حکمرانوں کی ذلت آمیز اور اذیت ناک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے غضبناک اور قہر آلود پھندوں میں بندھا ہوا، کہ انقلابِ محمدیہ نے (وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۷/۱۵۷) فرعونوں کی ان زنجیروں کو توڑ دیا اور ہامانوں کی ان پھندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس طرح، انسانوں کو انسانوں کی محکومیت سے آزاد کرا دیا ؎

تا امینے حق بحق داراں سپرد ‏ ‏ ‏ ‏ بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد ‏ ‏ ‏ ‏ کوہکن را پایۂ پرویز داد
قوتِ اُو ہر کہن پیکر شکست ‏ ‏ ‏ ‏ نوعِ انسان را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید ‏ ‏ ‏ ‏ بندہ را باز از خداونداں خرید

(رموزِ بے خودی۔ صفحہ ۱۱۹۔۱۲۰)

حضرت علامہؒ نے اس آخری مصرعہ میں قرآن کے انقلابِ عظیم کا ماحصل چار لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے، جب کہا ہے کہ "بندہ را باز از خداونداں خرید"۔ یعنی انسانوں کو انسانوں کی محکومیت سے آزاد کرا دیا۔ خواہ وہ انسان قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کے نمائندے تھے اور خواہ مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ خداوند!

سوال یہ ہے کہ اس انقلابِ عظیم کا نقطۂ ماسکہ یا بنیادی محرک کیا تھا؟ علامہ اقبالؒ نے (قرآنِ کریم کی روشنی اور راہنمائی میں) بتا دیا تھا کہ یہ سب کرشمہ اور اعجاز تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا۔

یہ کلمۂ انقلاب آفریں دو گوشوں پر مشتمل ہے:۔ "لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ"

"لَا اِلٰہ" ہر انسانی حکمرانی سے انکار، بلکہ اس کے خلاف اعلانِ بغاوت۔ اور "اِلَّا اللّٰہ" کتاب اللہ کی حکومت کا اثبات۔ اقبالؒ کا سارا کلام اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ وہ اپنی دوسری مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" میں کہتے ہیں ؎

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست ‏ ‏ ‏ ‏ ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات ‏ ‏ ‏ ‏ تازہ از ہنگامۂ اُو کائنات

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟ — تخمِ لَا در مُشتِ خاکِ اُو بریز
لَا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے — ایں غو رعد است، نے آوازِ نے

(پس چہ باید کرد۔ صفحہ ۱۹)

لَا اِلٰہ کو مسلکِ حیات قرار دینے والے کو قرآن "مومن" کہہ کر پکارتا ہے۔ اقبالؒ اسے مردِ حُر (یعنی بندہ آزاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ مردِ حُر کے متعلق وہ کہتے ہیں:

مردِ حُر از لَا اِلٰہ روشن ضمیر — می نگردد بندۂ سلطان و میر
ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش — اُو ز دستِ مصطفےٰ پیمانہ نوش
در جہانِ بے ثبات اُو را ثبات — مرگ اُو را از مقاماتِ حیات (ایضاً)

جاوید نامہ میں وہ خود غوِ رعد (بجلی کی کڑک) بن کر یوں غلغلہ انداز ہوتے ہیں:

لَا اِلٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں — تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
ایں دو حرفِ لَا اِلٰہ گفتار نیست — لَا اِلٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ اُو قہاری است — لَا اِلٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۲۳۴)

آپ نے غور فرمایا کہ مصورِ پاکستان نے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کا مفہوم کس واشگاف انداز میں سمجھایا تھا۔ لَا اِلٰہ انسانوں کی ہر حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ تھا، اور وہ اِس جنگ کے مضمرات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی آخری تحریر (ارمغانِ حجاز میں) کہا تھا کہ:

بنورِ تو بر افروزم نگہ را — کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم، بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لَا اِلٰہ را (ایضاً صفحہ ۸۱)

اس سے آپ نے اندازہ فرما لیا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران جب کہا گیا تھا کہ:

پاکستان کا مطلب کیا — لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

تو اس میں، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کا مطلب کیا تھا؟ اس کا مطلب تھا۔ انسانوں کی ہر قسم کی حکومت کو ختم کر کے اس کی جگہ کتاب اللہ کی حکمرانی کا ثبت کرنا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ جس کی وضاحت اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

"جب توحید ایک عملی نظام کی شکل اختیار کرے تو اس کا لازمی نتیجہ" مساوات، محکمیت اور آزادی" ہوگا۔ اسلام نہ کسی انسان کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے نہ مذہبی پیشواؤں کے مبینہ الوہیاتی اقتدار کو"۔
(خطبات تشکیل جدید۔ انگریزی۔ ص ۱۴۷)

یہ تھی وہ قرآنی مملکت جسے مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ کے انقلاب آفرین ہاتھوں نے قائم کیا اور ساری دنیا میں اعلان کیا کہ آکر دیکھ لو کہ :-

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہ نتیجہ تھا اس انسانیت سازِ تغیر کا کہ :-

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقشہائے کاہن و پاپا شکست

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۰)

قرآن نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس قوم (ہم مسلمانوں) نے کیا کیا؟ اسے بھی اقبالؒ کے الفاظ میں سُن لیجئے:۔

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست
خود سر تخت ملوکیت نشست!
تانہال سلطنت قوت گرفت
دین او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

(جاوید نامہ۔ ص ۸۷)

یعنی جس قوم نے دنیا سے ملوکیت کا خاتمہ کیا تھا، اُس نے پھر نظامِ ملوکیت قائم کر لیا! بظاہر یہ ایک سیاسی انقلاب تھا، لیکن (اقبالؒ کہتا ہے کہ) یہ سیاسی انقلاب نہیں تھا۔ اس نے دین پر ملوکیت کا ٹھپہ لگا کر اسے مذہب میں تبدیل کر دیا، کیونکہ دین ملوکیت کو راس آ ہی نہیں سکتا۔ اور یہ تبدیلی مذہبی پیشوائیت کے تعاون سے (بلکہ اس کے بل بوتے پر) رُونما ہوئی۔

اُس دن سے لے کر آج تک ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، باہوں میں باہیں ڈال کر اُمت کو دین سے برگشتہ کئے چلی آ رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس (مروجہ) اسلام کی جگہ قرآن کا الدّین قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس الدّین (یعنی قرآنی نظامِ حکومت) کے قیام کا امکان ہندوستان میں تو ایک

طرف، خود مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی نہیں، کیونکہ یہ مملکتیں بھی، ملوکیّت [1] اور مذہبی پیشوائیت کا ملغوبہ تھیں۔ ہزار سال کی اس دُہری غلامی سے ان کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ:۔

لَاۤ اِلٰہ اندر نمازش بود، و نیست ۔۔۔ نازہا اندر نیازش بود، و نیست
نور در صوم و صلوٰتِ اُو نماند ۔۔۔ جلوہ در کائناتِ اُو نماند!
روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام ۔۔۔ فرد ناہموار و ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی ! ۔۔۔ از چنیں مرداں چہ اُمیدِ بہی
ہر کسے بر جادۂ خود تند رَو ۔۔۔ ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دَو

(جاوید نامہ صد ۲۳۵)

لیکن اس کے باوجود وہ (اقبالؒ) اس سے مایوس نہیں ہوا۔ جس کی نگاہیں قرآنی بصیرت سے مستنیر ہوں وہ مایوس ہوا ہی نہیں کرتا۔ وہ نامساعد حالات کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھ لیتا ہے۔ انہوں نے اس کا حل یہ سوچا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو، اور اس لوحِ سادہ پر قرآنی اسلام کا نقش ثبت کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مجوزہ مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ اس سے ہم انگریز یا ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے، نہ ہی انہوں نے یہ کہا تھا کہ اس سے ہم پر معیشت کی راہیں کھل جائیں گی۔ یہ تمام مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ:۔

"اس سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم اسلام پر سے اُس نقش کو مٹا سکیں جسے عربی ملوکیّت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے۔" (خطبۂ الٰہ آباد)

یہ تھا ہمارے اس حسین و سادہ لیکن عظیم انقلاب آفریں سلوگن کا مقصود کہ:۔

پاکستان کا مطلب کیا ؟ ۔۔۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یعنی اس قرآنی نظام کا قیام جو :۔

---

[1] واضح رہے کہ ملوکیّت سے مراد صرف بادشاہت نہیں۔ اس سے مراد ہر غیر قرآنی نظام ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو اور وہ کسی کے ہاتھوں متشکل ہو۔ اس وقت (مسلمانوں کی مملکتوں سمیت) ساری دنیا میں ملوکیّت مسلّط ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　　　نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ)

لیکن اقبالؒ کے اس خواب کی جو تعبیر ہم نے متشکل کی، اُسے:-

کسی بُتکدہ میں بیاں کروں، تو کہے صنم بھی "ہری ہری"!

ہم نے اللہ کو تو (معاذ اللہ) ملک بدر کر دیا، اور فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے اِلٰہ تراش کر انہیں اپنا معبود بنا لیا۔ صدرِ اوّل میں تو پھر بھی قرآنی نظام قائم ہو جانے کے بعد، ہمارا تختہ اُلٹا تھا۔ یہاں ہمیں جھولوں بھی اس کا عکس تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کاہن دیاپا کی وہی قوتیں جنہیں شکستِ فاش ہوئی تھی، یورش کر کے یہاں آگئیں اور انہوں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا وہی مطلب یہاں عملاً ثابت کر دیا جسے وہ متحدہ ہندوستان میں اسلام کہہ کر پیش کرتی تھیں۔ اُن کا دعوےٰ تھا کہ اس اسلام کے لئے الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ان کے اس اسلام کو دیکھ کر جسے وہ پاکستان میں رائج کر رہے ہیں، ہماری نئی نسل نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اس اسلام کے لئے ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یوں ہم نے اپنی جیتی ہوئی بازی ہار دی ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت، کہ ملک میں شاید ہی کوئی آنکھ ہو جو اس شکست کے مضرات کو دیکھ رہی ہو! ایسی حالت اس وقت ہوتی ہے جب "کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا"۔ اور احساسِ زیاں کے جاتے رہنے سے اہلِ کارواں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ، رہزن کو یہ کہہ کر دعائیں دیتے ہیں کہ:-

نہ لُٹتے دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتے؟
(غالبؔ بہ ادنیٰ تصرف)

قوموں کی تباہی اس "بے خبر سونے" کا نتیجہ ہوتی ہے۔

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نومبر ۱۹۸۱ء

نذرِ اقبالؒ

اس سے پہلے ہمارے ہاں علامہ اقبالؒ کے یوم وفات کی تقریب اپریل میں منائی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کے علاوہ ان کے یوم پیدائش کی تقریب بھی (نومبر میں) منائی جاتی ہے۔ اس نسبت سے طلوعِ اسلام کی نومبر کی اشاعت کے لمعات حضرت علامہ اقبالؒ کی تعلیم اور پیغامات کی نذر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا: "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کرکے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ انہوں نے فرمایا۔ "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے تحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآنِ مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خدا تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔" (البیان۔ دسمبر ۱۹۲۹ء)

۲۔ احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو انؔ[1] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہؐ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں۔ جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات

---

[1] خواجہ احمد الدین صاحب (امرتسری مرحوم)

کے متعلق خاص طور پر اسی قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذالقیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیر غور ہیں، اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اصول فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ کر دیا ہے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوام اسلامی کے لئے باعث برکت ہو گا یا شقاوت۔

غرض کہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ میں اور مجھ جیسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سلسلۂ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخرالذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں۔ ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا "مجدد" ہو گا۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں علمائے حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضکہ یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (مکتوب بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ محررہ ۲ ستمبر ۲۵ء)

۳۔ مسلمانوں کا نصب العین

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا، اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا

ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی اُمّت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مؤسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے، بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاءِ الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے، بلکہ یہ رحمت اللعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خودساختہ تفوّقوں اور فضیلتوں سے پاک کرکے ایک ایسی اُمّت کی تخلیق کی جائے جس کو **امۃ مسلمۃ لک** کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر **شہداء علی النّاس** کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں بمتعلقہ قومیت)

۲۔ اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

۱۔ اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا، جو نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ دنیا ان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے، دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کرکے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوونما اور ارتقا ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے، بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمان کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان

کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے۔ تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم
(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

۲

اسلام کے مذکورہ بالا دعوٰی پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اوّل یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور نظام ذہن میں نہیں آسکتا، کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے، اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں، بلکہ اس کو صرف معتقدات پر مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک اُمّت کی تشکیل اور اس کے بقاء کے لئے ضروری ہے۔ اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرفِ انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی مگر کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کی اساس کے انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دور، اصول دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس کی طرف لے گئیں، لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں، مضمون متعلقہ وطنیت)

۴

نبوّتِ محمدیہؐ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے۔ جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو، جو نبوّتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو، باوجود شعوب و قبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان تمام آلودگیوں سے منزّہ کیا جائے، جو زمان، مکان، وطن قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ، یہ ہے نصب العین ملّتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے، ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوّت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں مضمون متعلقہ وطنیت)

۵۔ عالمگیر پیغام کے لئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبارِ اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں، تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اوّلین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معیّن راہِ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

۶۔ مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیشِ نظر ہے، اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں، لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ باعتبارِ آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ یورپ نے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارداتِ مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے ہو، لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ اس کے برعکس یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کر دیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء)

———— ۲ ————

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاستِ اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ

عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

۷۔ اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

(بجواب مولانا حسین احمد مدنی۔ متعلقہ قومیت)

(۲)

اُمتِ مسلمہ جس دین کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیّم ہے۔ دینِ قیّم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوّم ہے۔ اس گروہ کے امورِ معاشی اور مادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے، بالفاظِ دیگر قرآن کی رُو سے حقیقی، تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیرِ اسلام ہو، نامعقول و مردود ہے۔ (ایضاً)

۸۔ مُلّائیت، تصوّف، ملوکیت

۱۔ مُلّائیت: کبھی علماء اسلام کے لئے ایک قوّتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں، لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانہ سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادیٔ اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ پس اُنیسویں صدی کے مصلحینِ اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربہ کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

۲۔ تصوّف: مسلمانوں پر ایک ایسا تصوّف مسلّط تھا جس نے حقائق کی آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے

عوام کی قوت عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور عوام کی جہالت اور ضعف اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصر جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں، جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

(۳)۔ ملوکیت: مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

(ختم نبوت - بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

۹۔ پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالیگی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

(خطبہ صدارت - ۱۹۳۰ء)

۱۰۔ کمیونزم خلاف اسلام ہے

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔

لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے لیعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔

(مکتوب بنام غلام السیدین۔ محررہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

۱۱۔ یہی اسلام کی منزّہ شکل ہے

لیگ کو آخر العمل یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئین جدید (لیعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا) یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش ضرور مل جاتا ہے

(مکتوب بنام قائدِ اعظمؒ محمد علی جناحؒ۔ مورخہ ۲۸۔ مئی ۱۹۳۷ء)

دُرِّ منثور

ان موتیوں میں سے چند ایک جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریرات نثر میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۔ داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

(دیباچہ پیام مشرق)

۲۔ نسل پرستی

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدت انسانیت کے لئے دقیانوسی اصول، مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدت انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہوگا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قویٰ کو بے کار کر دے۔ انسانوں کے سدھانے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

۳۔ مذہب اور سیاست

اسلام، محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک اُمت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

۴۔ شریعت کا مقصود

اسلام نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

۵۔ دورِ انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء، فلاسفہ، سیاستین وغیرہم کو ایک نئی تحریک خیال سے اُبھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اُٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انہیں خوشنما و درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت

کو رجائیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہل قوم کے عملی قویٰ کو شل اور ان کی روحانی قوت نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

۶۔ مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علامات زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں، اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیات روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوئیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق، اخبار لائٹ کے جواب میں)

۷۔ محاورہ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے، اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے، یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لیے جاتے ہیں جو عربی میں ہرگز نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

۸۔ ملت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے، ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے

ڈرتا ہے، صوفیاء اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض راہنما نہیں۔

(چوہدری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

۹۔ اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرلے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

۱۰۔ فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت۔ ۱۹۳۲ء)

۱۱۔ لیڈروں کا فُقدان

اس وقت ہندوستان کے مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فُقدان ہے، جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرکہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کیے جاسکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

۱۲۔ احترامِ آدمیت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

۱۳۔ وحدتِ انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔

۱۴۔ قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تخلیق ہو، قابلِ احترام ہے۔

(دیباچہ پیامِ مشرق)

۱۵۔ وطنیت

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں، جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔ (خطبۂ صدارت)

۱۶۔ مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبّرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی، وہ خونریزی، سفاکی، استبداد اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں، کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔ (ریڈیو تقریر - ۱۹۳۸ء)

۱۷۔ تاریک ترین دَور

اس زمانۂ ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

(ریڈیو تقریر - ۱۹۳۸ء)

۱۸۔ قوانینِ الٰہیہ کا اتباع

جب تک اقوام کی خود ہی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولانا ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

۱۹۔ انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل

کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

۲۰۔ ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام (یعنی خدا کے عطا کردہ دین) سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں، ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کردوں، جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔

(منشی سراج الدین کے نام خط)

۲۱۔ تصوف

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی تو اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین وجمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجب تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کی تنازع للبقاء میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

۲۲۔ تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۱۷ء)

۲۳۔ جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق، اور باری تعالیٰ کی ذات

کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے، تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

۲۴۔ ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت (وحدت الوجود) اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارۂ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

۲۵۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت SUBTLE طریقِ تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں ایجاد یا اختیار کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث (وحدت) وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبع موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو مذموم بیان کیا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

۲۶۔ ابنِ عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

۲۷۔ خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔
(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

۲۸۔ قرآن کا مسلک

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۳۲ء)

۲۹۔ شاعری

میرے زیرِ نظر حقائق اخلاقی و ملی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔
(پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۱ء)

۳۰۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِّنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصوّر نہ کریں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ اقبالؒ

حقیقت خرافات میں کھو گئی

(خصوصی درس تقریبِ یومِ اقبالؒ ۲۲ اپریل ۱۹۸۳ء) (پرویز)

عزیزانِ گرامی قدر! اسلام ورحمت!

آج کل سڑکوں پر بجلی کے قمقمے آویزاں ہوتے ہیں۔ پاور ہاؤس میں بیٹھا ہوا الیکٹریشن ایک بٹن دباتا ہے تو سارے قمقمے بیک وقت روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے بچپن کے زمانے میں سڑکوں پر مٹی کے تیل سے جلنے والی لیمپیں ہوتی تھیں۔ لیمپیں جلانے والا۔ ایک ایک لیمپ روشن کرتا چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے حلقہ کا آخری لیمپ جلا کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور اس کی جلائی ہوئی لیمپیں رات بھر راستوں کو روشن کئے رکھتیں۔ تاریخ انسانیت عبارت ہے اسی قسم کے لیمپ جلانے والوں سے جن کے نورِ بصیرت اور حسنِ کردار سے روشن شدہ شمعوں سے انسانی زندگی کی گذرگاہیں فروزاں ہیں۔ وہ ان شمعوں کو اپنے فائدے کے لئے نہیں جلاتے تھے وہ تو انہیں جلا کر آگے بڑھ جاتے تھے اور ان کے بعد آنے والوں کی راہیں ان سے مستنیر ہوتی تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ:۔

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ یہ سوچ کر کہ کوئی پیچھے بھی آ رہا ہو گا

انہی، خونِ جگر سے شمعیں روشن کرنے والوں میں ایک تابندہ و درخشندہ نام حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا بھی ہے جن کے یومِ وفات کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ حضرت علامہ کا سب سے پہلا عمومی احسان، عالمگیر انسانیت پر ہے جس کی تاریک راتوں کو انہوں نے نورِ سحر سے روشناس کرایا۔ دوسرا احسان ملتِ پاکستانیہ پر ہے جس کے راہ گم کردہ قافلے کو انہوں نے نشانِ منزل عطا کیا۔ اور ایک ذاتی احسان اس ذرۂ ناچیز پر بھی ہے جس کا فہمِ قرآن ان کے نورِ بصیرت کا رہینِ کرم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے آپ آج کسی سامنے

"بوڑھے شاہ" کے مزار پر دھونی رمائے بیٹھا دیکھتے۔

ملّت کا درد

علامہ اقبالؒ کا قلبِ حزیں ملّت کے درد سے لبریز تھا۔ ان کی ساری عمر اسی کے غم کی خونتابہ فشانی میں گذری۔ ان کا سارا کلام اسی سوز و ساز و درد و داغ کی داستانِ خوں چکاں ہے۔ دیکھیے وہ ارمغانِ حجاز کی ایک سادہ سی نظم میں پہلے ملّت کی زبوں حالی پر کس طرح خون کے آنسو روتے ہیں۔ جب کہتے ہیں کہ :۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے — کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟ — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار — کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ — کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں — نے گرمیِ افکار، نہ اندیشۂ بے باک!

یہاں تک تو امّتِ مرحوم کی نکبت و زبوں حالی کا مرثیہ تھا۔ اس کے بعد چار لفظوں میں اس کے اسباب کو اس حسنِ ایجاز و جامعیت سے مرتکز کیا دیا ہے کہ ہماری ساری تاریخ اس میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ فرمایا ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری! — اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری!

دوسری جگہ ہے۔ ؎

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و مُلّا و پیر

چار بلائیں

ان کے نزدیک یہی وہ چار عفاریت ہیں جنہوں نے اُمّت کے جسدِ ناتواں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ یعنی ملوکیت۔ نظامِ سرمایہ داری۔ خانقاہیت اور مُلّائیت! ان کا کلام انہی چار امراض کی تشریح اور ان کا پیغام انہی سے جان چھڑانے کی تلقین ہے۔ میں آج کی نشست میں ان کے صرف ایک گوشے یعنی مُلّائیت کی اقبالیؒ تشریحات و تلقینات پیش کر دوں گا۔ لیکن پہلے دو امور کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) آپ تاریخِ انسانیت کا پہلا صفحہ اٹھائیے۔ آپ کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی استبدادی قوتیں شانہ بشانہ چلتی نظر آئیں گی۔ جہاں تک تسلّط و تغلّب کا تعلق ہے۔ یہ دونوں قوتیں یکساں دکھائی دیں گی لیکن حکمران طبقہ کے مقابلہ میں مذہبی پیشوائیت کی زنجیریں زیادہ محکم اور سنگین ہوتی ہیں۔ حکمرانوں (بادشاہوں۔ راجاؤں) کو اپنا

غلبہ و تسلط قائم رکھنے کے لئے پولیس اور فوج کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مذہبی پیشوائیت کو ان میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اس لئے کہ حکمرانوں کا تسلّط محکوموں کے جسم پر ہوتا ہے اور مذہبی پیشوائیت کا تغلّب ان کے قلب اور دماغ پر۔ حکمرانوں کے خلاف سرکشی کے خیالات ذہنوں میں اُبھرتے اور بعض اوقات بغاوت کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن مذہبی تسلّط کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے کسی حاکم کے خلاف کسی کے دل کی گہرائیوں میں شائبہ تک بھی کروٹ لے تو وہ ڈرتا ہے، روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، معافیاں مانگتا ہے، منّتیں مانتا ہے، کفّارے ادا کرتا ہے۔ "نادیدہ خوف" اس کے اعصاب پر ایسی کڑی گرفت رکھتا ہے کہ وہ سر اُٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔

ملکی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کے غلبہ اور خوف کی ایک بیّن مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ گزشتہ فروری میں قانونِ شہادت کے خلاف، کچھ خواتین نے احتجاجاً جلوس نکالا۔ حکومت نے اسے خلافِ قانون قرار دے کر مؤاخذہ کیا۔ بعض گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ لیکن انہوں نے اسے ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ نہ کسی کی آنکھ میں آنسو آئے۔ نہ دل میں دھڑکن پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اخبارات میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی:-

فتویٰ کی گرفت

"جمعیّت العلماء جموں و کشمیر کے مرکزی ڈپٹی چیف آرگنائزر مولانا عبدالرزاق چشتی نے فتویٰ دیا ہے کہ قانونِ شہادت کے خلاف حال ہی میں لاہور میں نکالے جانے والے جلوس میں جن شادی شدہ خواتین نے حصّہ لیا ہے ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں۔ اب انہیں جائز تصوّر نہیں کیا جانا چاہئے۔ مولانا نے ایسی خواتین کے شوہروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ نکاح کی تجدید کے لئے شرعی طریق کار اختیار کریں۔ ایک بیان میں مولانا چشتی نے کہا کہ جن خواتین نے جلوس میں شرکت کی ہے انہوں نے خدا اور قانونِ پاک کی تعلیمات کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ انہوں نے ایک مقدّس قانون کو چیلنج کیا ہے۔ چنانچہ ان کے نکاح جائز نہیں رہے۔[1] اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے کہا کہ جن سیاسی جماعتوں نے اجتماعی اور افراد نے نجی طور پر عورتوں کی حمایت میں جلوس میں شرکت کی ہے۔ وہ بھی خدا اور اس کے رسول کے مجرم ہیں۔ انہوں نے مذہبی تعلیمات کی توہین کی ہے اس لئے وہ پھانسی کے مستحق ہیں۔"

(جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۸۳ء)

سنا گیا ہے کہ جن عورتوں کے خلاف یہ فتویٰ صادر ہوا، ان میں سے جو زیادہ "مذہب زدہ" تھیں، ان کا بُرا حال

---

[1] اُمید ہے آئندہ، خواتین محتاط رہیں گی اور صرف غیر شادی شدہ عورتوں کا جلوس نکالا کریں گی۔

تھا۔ ڈر کے مارے ان کا رنگ زرد تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جسم پر لرزہ طاری تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ڈری سہمی ہوئی پوچھتی تھیں کہ اب کیا ہوگا؟

یہ ہوتا ہے مملکتی حکمرانی اور مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی میں فرق!

یہ تو پھر بھی ایک ہنگامی حادثہ تھا۔ یہاں آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ کسی زود رنج خاوند نے غصہ میں آکر بیوی کو "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" کہہ دیا۔ غصہ فرو ہونے پر مولوی صاحب سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا! انہوں نے فرمایا کہ تمہاری بیوی پر طلاق پڑگئی ہے۔ سہمے ہوئے کہا کہ حضرت! اس کے ازالہ کی کوئی صورت؟ فرمایا کہ ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ نکاح کرکے ایک رات اس سے ہم بستر ہو۔ صبح کو وہ اسے طلاق دے۔ پھر وہ تم سے از سرِ نو نکاح کرے تو تم میاں بیوی کی زندگی بسر کر سکتے ہو۔ ورنہ نہیں۔ بال بچوں بلکہ بعض اوقات "دودھ، پوت" والی بڑھیا بیوی کانپ اٹھتی ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ غصہ میں حماقت تو اس کے خاوند سے سرزد ہوئی۔ یہ سزا اسے کیوں مل رہی ہے؟ لیکن مولوی صاحب گرج کر فرماتے ہیں کہ یہ شریعتِ حقہ[1] کا حکم ہے۔ اس کے خلاف چوں چراں نہیں کی جاسکتی۔ آپ سوچئے کہ کسی دنیاوی حکومت کی گرفت اس قدر اعصاب شکن ہو سکتی ہے؟ اس قسم کا ہوتا ہے مذہبی پیشوائیت (تھیاکریسی) کی حکومت کا تسلط!

(۲) اور یہی وجہ ہے جو خود ملوکیت کو بھی مذہبی پیشواؤں کی تائید کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب تک برہمن، کھشتری (راجہ) کے ماتھے پر اپنی توثیق کا ٹھپہ (ٹیکہ) نہ لگا دے وہ گدی پر براجمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک پادری بادشاہ کے سر پر مقدس پانی کا چھینٹا نہ دے دے وہ جائز حکمران تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جب تک مفتیانِ کرام سلطان المعظم کے ظلّ اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) ہونے کا اعلان نہ کر دیں۔ وہ "خلیفۃ اللہ فی الارض" قرار نہیں پا سکتا۔ یہ (ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا) گٹھ جوڑ ہے جو حکمرانی کے شکنجے کو مستحکم رکھتا ہے۔

بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت غلامی کے ان بندھنوں کی یہی حالت تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

بود انسان، درجہاں انساں پرست ناکس و نابود و مند و زیر دست

زیر دست انسان بالادستوں کی غلامی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی اپنی نہ کوئی ہستی تھی، نہ وجود۔ نہ تشخص تھا نہ مقام، ؎

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندھا در دست و پاؤ گردنش

---

[1] واضح رہے کہ یہ خدا کا حکم نہیں، انہی حضرات کی خود ساختہ "شریعت" کا فیصلہ ہے۔

قیصر و کسریٰ (ملوکیت) اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر، اسے لوٹنے میں مصروف تھی ؎

کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

کسریٰ

ایک طرف کسریٰ (قیصر اور سلطان و امیر اور دوسری طرف، مذہبی پیشوا۔ ایک شکار کے پیچھے سینکڑوں شکاری :-

از غلامی فطرت او دوں شدہ — نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

صدیوں کی غلامی سے اس کی فطرت پست ہو چکی تھی۔ اس کی رگوں میں خونِ زندگی منجمد ہو گیا تھا۔ اس میں نہ حرکت باقی رہی تھی نہ حرارت۔ وہ جیتا جاگتا انسان نہیں۔ ممی شدہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔

یہ تھی انسان کی حالت ظہورِ اسلام کے وقت۔ قرآن آیا اور اس نے نوعِ انسان کی غلامی کے ایک ایک بندھن کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس نے ملوکیت کی زنجیروں کو توڑا تو اس کے ساتھ ہی اس مذہبی پیشوائیت کے حلقہ ہائے زنّار بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ قرآن نے اعلان کر دیا کہ یاد رکھو! یہ احبار و رہبان لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں۔ انہوں نے مذہب کو کاروبار بنا رکھا ہے۔ یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی طرف تمہاری راہ نمائی کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ "یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" (۹/۳۴) خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خود ہیں۔ یہ اور سرمایہ دار دونوں جہنم کا ایندھن ہیں۔

اس طرح اس نے نوعِ انسان کو غلامی کی ان تمام زنجیروں سے رہائی دلا دی :- ؎

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

دورِ ملوکیت

انسانی حریت و آزادی کا یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہا جب تک قرآنی نظامِ مملکت قائم رہا۔ اس کے بعد خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور ملوکیت کے ساتھ ہی اس کے لازم عناصر۔ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت بھی وجود پذیر ہو گئے۔ خود مسلمانوں نے ملوکیت کے تختوں اور مذہبی پیشوائیت کی مسندوں کے ان ٹکڑوں کو جنہیں انہوں نے ابھی کچھ عرصہ پہلے توڑ کر پھینک دیا تھا۔ اپنی مژگانِ عقیدت سے ایک ایک کر کے چُنا اور انہی منہدم کردہ مسندوں کو بار دیگر استوار کر کے ان پر مسلّط ہو کر بیٹھ گئے۔ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز نظارہ کہیں نہیں دیکھا ہو گا :-

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس طرح سلاطین، اقتدارِ مملکت بزورِ شمشیر یا وراثتاً حاصل کر کے تختِ حکومت پر متمکن ہو گئے،

اور علماء حضرات بر سر ممبر، ان کے حق میں نصرتِ خداوندی کی دعائیں مانگتے رہے اور ان کی قصیدہ خوانی اور چاپلوسی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ یافعی کی تاریخ کے مطابق خلیفہ یزید بن عبدالمالک کے عہد میں، چالیس شیوخ نے اکر گواہی دی کہ :-

"خلفاء قیامت کے دن بغیر حساب کے بخشے جائیں گے"۔

(تاریخ یافعی صہ ۲۲۴ - بحوالہ طلوعِ اسلام - جولائی ۱۹۶۴ء)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے لکھا تھا کہ :-

"انہی دنوں محدثین کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے اس عقیدہ کو اپنا دین بنا لیا تھا۔ چنانچہ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہِ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ ہاں بادشاہ کے سوا عوام کو ٹوکنا درست ہے اور وہ بھی صرف زبان کی حد تک۔ ہتھیار تو بہرحال کسی کے مقابلہ میں اٹھانا شرعاً جائز نہیں"۔

(احکام القرآن - جصاص - جلد دوم - صہ ۳۴ - بحوالہ "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" صہ ۳۵)

جاہ پرستی کچھ آج ہی کے تملق پیشگان کا شیوہ نہیں۔ اقتدار اور قصیدہ خوانی کا چولی دامن کا ساتھ چلا آ رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس سارے دور میں کوئی بھی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ہوگا جس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام میں ہوتا ہے۔ ان کی آواز چھوڑ، ان کے آثار تک کو مٹا دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفاصیل کے ساتھ انبار در انبار موجود ہے لیکن ان کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا نام تک بھی کہیں نہیں ملتا۔

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ان سلاطین میں کوئی نیک سیرت نہیں تھا۔ لیکن جب ملوکیت کا نظام ہی خلافِ قرآن تھا تو کسی بادشاہ کے انفرادی طور پر نیک ہونے سے وہ نظام تو اسلامی نہیں ہو جاتا۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ خلافِ اسلام نظام مسلسل اور متواتر جاری رہا۔ یہ سعادت ہمارے زمانے کے حصے میں لکھی تھی کہ اس میں ملوکیت، اور اس شجرۃ الزقوم کے برگ و بار (نظامِ سرمایہ داری، خانقاہیت اور ملائیت)، کے خلاف بھرپور آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز تھی، حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی، جس نے کہا تھا کہ :-

مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبریل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

لیکن اس کے دردِ دل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس صورِ اسرافیل کو اسی جہان کون و مکاں میں پھونکے۔ اس نے ایسی بھرپور آواز میں، جس سے یہ چار سو، لرز اٹھے پکار کر کہا کہ :۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است
غلام فقر آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است

(ارمغانِ حجاز ص ۱۲۷)

" دنیا میں انسان ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے اگرچہ غلامی کی شکل بدل گئی ہے۔ اسے ابھی تک کوئی انسانیت ساز نظام میسّر نہیں آیا۔ میں اس شاہنشاہِ بوریہ نشین ؐ و گیتی پناہ کے در کا غلام ہوں جس نے اعلان کیا کہ اس کے نظام کی رُو سے ملوکیت حرام ہے۔ اس نے غلامی کی ہر زنجیر کو توڑ دیا۔"

اقبال ؒ نے اس ایک نعرۂ مستانہ سے، ہماری تاریخ اور اس کے مضمرات کی، جسے ہم خود فریبی یا ابلہ فریبی کی بنا پر اسلامی تاریخ کہتے چلے آرہے تھے اور اب تک یہی کہہ رہے ہیں۔ حقیقت بے نقاب کر کے رکھ دی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ آج کی نشست میں میرا یہ موضوع نہیں۔ میرا موضوع مذہبی پیشوائیت ہے جس کی طرف مجھے زُود پلٹ آنا چاہیئے۔

مُلّا سے مراد

لیکن ایک اہم نقطہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ علامہ اقبال ؒ (یا خود میں) جب ملّا پر تنقید کرتے ہیں تو اس سے کسی خاص فرد یا افراد کے گروہ کی تنقیص یا (خدانکردہ) تحقیر مقصود نہیں ہوتی۔ ملّا یا ملّاازم درحقیقت ایک انسٹی ٹیوشن، ایک نظام، ایک مسلک کا نام ہے (جیسے عیسائیت میں چرچ یا ہندومت میں برہمنیت)، اس مسلک کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف سے چلا آرہا ہے وہ اسلام میں سند و حجت، قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے۔ وہ ابدی ہے اور غیر متبدل۔ نہ اس پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ نہ کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ، وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ وہ ممکن العمل ہو یا نہ۔ اسلام بہرحال وہی ہے اس سے اختلاف مستوجب سزا ہے اور انکار کفر کے مرادف ہے۔ جس سے مسلمان مُرتد ہو جاتا ہے اور مُرتد کی سزا موت ہے۔ یہ ہے وہ مسلک

مشرب جس کی اقبالؒ مخالفت کرتا ہے کیونکہ اس قسم کے مسلک کی نہ اسلام میں گنجائش ہے نہ جواز۔ اسلام سے مراد کتاب اللہ کی راہ نمائی میں علم وعقل سے کام لینا اور مذہبی پیشوائیت کے مسلک میں نہ کتاب اللہ کا کوئی عمل دخل ہوتا ہے نہ علم وعقل سے کچھ واسطہ۔ علم وعقل سے اسے کس قدر واسطہ ہوتا ہے اس کے لئے صرف ایک مثال پیش کر دینا کافی ہوگا۔ کچھ عرصہ ادھر کی بات ہے:-

"سعودی عرب کے شہر مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کے صدر نے اعلان کیا کہ زمین ایک جگہ پر قائم ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف تصور کرے تو اسے پھانسی پر لٹکا دینا چاہیئے۔ سعودی عرب ہی کی ایک اخبار میں صدر یونیورسٹی شیخ عبدالعزیز بن باز کا مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ چاہے کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو گئی ہو لیکن اب بھی اگر لوگوں کو صحیح راستے پر لایا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ بنی نوع انسان خود دیکھتے ہیں کہ زمین اپنی جگہ ساکت ہے اور سورج اس کے گرد گردش کر رہا ہے، طلوع ہوتا ہے اور پھر غروب ہوتا ہے۔ آپ نے مزید لکھا کہ آج کے دعوے کے بموجب زمین اگر گردش کرتی ہوتی تو پھر شہر، درخت، پہاڑ، دریا اور سمندروں میں استقامت نہ ہوتی۔ اگر زمین گردش کرنے لگے تو مشرق کے شہر مغرب میں اور مغرب کے شہر مشرق میں دکھنے لگیں گے۔"

(بحوالہ طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۶ء)

اقبالؒ علی الاعلان اسی مسلک پر تنقید بھی کرتا ہے اور بعض مقامات پر اس میں اور حقیقی اسلام میں تقابل بھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ صدرِ اول کے بعد، ہماری تاریخ، ملوکیت کی تاریخ ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام ہی اسلام کا نقیض ہو اس میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہوگا اسلام کا نقیض ہوگا۔ اقبالؒ نے اپنے کلام میں، غیر اسلامی عقائد، نظریات، تصورات، مسالک ومشارب کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مروجہ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے　　یہ اُمت روایات میں کھو گئی ہے
بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے!

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

ساری دنیا کی مساجد میں مؤذن، دن میں پانچ مرتبہ، مینارۂ مسجد پر یا لاؤڈ سپیکر کے سامنے کھڑے ہو کر، باآواز بلند اعلان کرتا ہے کہ:-

اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

وہ یا تو ساری عمر ان الفاظ کو بلا سمجھے دھراتا رہتا ہے اور اگر سمجھتا ہے تو یہ کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ اسے الٰہ کے یہی معنی بتائے گئے ہیں لیکن جب اسلام ایک زندہ حقیقت تھا تو الٰہ کے معنی تھے۔ صاحب اقتدار، وہ جسے حقِ حکومت حاصل ہو۔ مؤذن اعلان یہ کرتا تھا کہ اے اہلِ دنیا! کان کھول کر سُن لو کہ:-

"میں اس حقیقت کی شہادت دیتا ہوں کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے"

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کس قدر زلزلہ انگیز اور انقلاب انگیز اعلان ہے۔ جو ساری دنیا کے در و دیوار کو ہلا دیتا ہے۔ پھر اسے بھی سوچئے کہ شہادت یا گواہی تو اسی کی قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے۔ جو اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔ وہ مؤذن جس مقام پر کھڑا اعلان کر رہا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ (کم از کم جہاں تک میری نگاہ جاتی ہے) حکومت صرف خدا کی قائم ہے۔ کسی انسان کی نہیں۔ اور یہ اعلان ساری دنیا میں قدم قدم پر ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ تھا اذان کے سب سے پہلے جزو کا مفہوم حقیقی اسلامی نظام کے زمانے میں۔ اس مفہوم کا ملوکیت کے لئے قابلِ قبول ہونا تو ایک طرف وہ اسے خود نہ سن سکتی تھی نہ اس کی اجازت دے سکتی کہ کوئی اور بھی اسے سُن پلئے۔ مشکل اس کی یہ تھی کہ وہ ان الفاظ کو تبدیل بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس مشکل کا حل مذہبی پیشوائیت نے مہیا کر دیا۔ اس کے لئے اِلٰہ کا ترجمہ کر دیا "وہ جس کی پرستش کی جائے" اب یہ اعلان بالکل بے ضرر ہو گیا۔ مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے۔ وہ الفاظ تو وہی رہنے دیتی ہے۔ ان کا مفہوم بدل دیتی ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ضمناً۔ اقبالؒ نے جو کچھ کہا ہے "الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں" تو یہ صحیح نہیں۔ الفاظ میں تو بے شک تفاوت نہیں۔ لیکن یہ معانی کا تفاوت تو ہے جو ملّا کی اذان، اور مجاہد کی اذان میں فرق پیدا کر تا ہے۔ وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

لیکن یہ بھی اقبالؒ کی خوش فہمی تھی جو کہا تھا کہ "شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات" مُلّا کے دل میں قرآن کی بات اُتر ہی نہیں سکتی۔ خود ارشادِ خداوندی ہے کہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ[1] (۵۶/۷۹) قرآن کے مطالب و مقاصد تک اسی کی رسائی ہو گی جو دل و دماغ کو غیر قرآنی خیالات و معتقدات سے پاک و صاف کر کے اس کی طرف آئے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!
وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے!

توحید کے مقابلہ میں سب سے بڑے بُت، فرقہ پرستی کے ہیں جسے قرآن نے شرک کہہ کر پکارا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر فرقہ کے اسلام کی انتہا کسی نہ کسی شخصیت پر جا کر ہو جاتی ہے اور یہی شخصیت پرستی توحید کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو شخص بھی کسی فرقے کے ساتھ متمسک ہے۔ اس کی قرآن تک رسائی نہیں ہو سکتی جب تک ان بتوں کو کعبۂ ذہن سے نکال باہر نہ کیا جائے، خدا اس کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ یہ حقیقت ہے کہ:۔

کھو یا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

---

[1] مروجہ اسلام میں اس کے معنی یہ لیے گئے کہ قرآن مجید کو نہا دھو کر باوضو چھونا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جسم کی پاکیزگی بھی اچھی چیز ہے لیکن یہاں بات تطہیرِ قلب و دماغ کی ہو رہی ہے جس کے بغیر قرآنی مفاہیم سامنے نہیں آ سکتے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔

بیرنگیٔ ادراک ہی کو اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کہا گیا ہے۔

کارِ مُلّا

اقبالؒ نے جاوید نامہ میں ترکی کے مشہور مدبر، سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی زبانی عجمی اسلام کے ان علمبرداروں کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ میرے نزدیک اس سے بہتر تصویرکشی اور حقیقت نگاری شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ غور سے سُنئے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ کہتے ہیں، ؎

دین حق از کافری رسواتر است زانکہ مُلّا مومن کافر گر است

اللہ کا دین ملّا کے ہاتھوں، کفر سے بھی زیادہ ذلیل و رسوا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کا کام یہ رہ گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ کافروں کو مسلمان کرے، اُلٹا مسلمان کو کافر بنا کر ملّت کی چھانٹی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا شیوہ ہی کافر گری ہے۔ ؎

شبنم ما در نگاہِ ما یم است از نگاہِ او یم ما شبنم است

ہماری نگاہوں میں اُمّت کا ہر فرد متاعِ گراں بہا ہے کہ: ؎

ہر فرد ہے مِلّت کے مقدّر کا ستارہ

لیکن ان کے نزدیک اپنے فرقے کے سوا سب مسلمان جہنم کا ایندھن ہیں۔ ان کی قیمت پرِ کاہ جتنی بھی نہیں۔

از شگرفیہائے آں قرآں فروش دیدہ ام روح الامین را در خروش

یہ قرآں فروش جس نے مذہب کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے ایسی عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے کہ ان سے جبریل امینؑ تک بھی تلملا اُٹھتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ان لوگوں کی دین فروشی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایک مستقل موضوع ہے اور تفصیل کا متقاضی جس کے لئے سردست نہ فرصت ہے نہ گنجائش۔ اختصاراً یہ ایک شعر ہی کافی ہو گا کہ ؎

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

بات جاویدنامہ کی نظم کی ہو رہی تھی۔ اس کا اگلا شعر ہے:۔

زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ نزدِ اُو اُمّ الکتاب افسانۂ

حقائقِ قرآنی کے سرچشمہ، یعنی علمِ خداوندی سے وہ شناسا تک نہیں۔ اس کے نزدیک خدا کی کتاب، قصّے، کہانیوں اساطیر الاوّلین کے سوا کچھ نہیں (معاذ اللہ) افسانوں کا مجموعہ!

بے نصیب از حکمتِ دین نبیؐ آسمانش تیرہ از بے کوکبی

وہ اس دین سے جسے حضور نبیٔ اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، قطعاً بے خبر ہے۔ جس آسمان کے نیچے وہ زندگی بسر کرتا ہے اس میں ایک چمکتا ہوا ستارہ بھی نہیں اس لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا رہتا ہے؛ ؎

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد

وہ بے حد تنگ نظر ہے۔ کور ذوق ہے اور اس کے ساتھ بیہودہ گو بھی۔ اس کی بحث و جدل سے اُمت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ ملت فرقوں میں بٹ چکی ہے؛

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب — کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

صدیوں کی کورانہ تقلید اور علم و عقل سے نفرت و عداوت کی وجہ سے اس کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔ اس لئے خدا کی کتاب کے رموز و حقائق کا سمجھ سکنا اس کے بس کی بات نہیں۔ ایسے ہی جس طرح کسی پیدائشی اندھے کو لاکھ سمجھاؤ۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتا کہ روشنی کسے کہتے ہیں؟

اقبالؒ کی حق گوئی اور تلخ نوائی کا مقطع یہ ہے۔۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اس موضوع میں حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے کہ؛ ؎

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد[1] — دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

فی سبیل اللہ فساد

کفار کا کیش و مسلک تو یہ ہے کہ جُہد للبقاء اور تسخیرِ کائنات کے لئے کیا کیا تدبیریں سوچی اور اختیار کی جائیں اور ان حضرات کا مذہب و مشرب یہ کہ خدا کے نام پر کس طرح فسادات کھڑے کئے جائیں۔

یوں تو اقبالؒ کا سارا کلام ہی بلند ترین حقائق اور حسین ترین شریعت کا مرقع ہے۔ لیکن بعض مقامات پہ اس کی رعنائی، گوہر تابناک کی طرح جگمگا اٹھتی ہے۔ مُلّا کے برپا کردہ فساد کو "فی سبیل اللہ فساد" کہنا اقبالؒ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔

اس "فی سبیل اللہ فساد" کو انہوں نے دوسرے مقام پر ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ قیامت ہیں: ؎

---

[1] جہاد، جُہد سے مراد ہے۔

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا ۔۔۔ حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت!

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف ۔۔۔ خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت!

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول! ۔۔۔ بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!

ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا ۔۔۔ اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

فساد کا اوّلین جرثومہ نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور ان حضرات کے مذہب و مسلک کی بنیاد ہی نفرت پر ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر نفرت اور کیا ہوگی کہ یہ اپنے فرقہ کے سوا، تمام (غیر مسلم تو ایک طرف خود) مسلمانوں کو جہنمی قرار دیتے ہیں۔ یہ نفرت فریقِ مقابل کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی بدستور (بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ) باقی رہتی اور نمودار ہوتی ہے۔ ترکی کے مُلّا، اتاترک اور اس کی پارٹی کے خلاف تھے۔ یہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ اس کے چالیس پینتالیس سال بعد:-

"اتاترک کے ایک ساتھی، عمران اوکتم کی میت نمازِ جنازہ کے لئے جامع مسجد میں لائی گئی۔ تو خطیب نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ وہ اس مرتد کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائیں گے اور نہ ہی دوسرا کوئی مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس پر اتاترک کے ایک اور ساتھی، جنرل عصمت انونو آگے بڑھے اور انہوں نے اعلان کیا کہ جب تک عمران اوکتم کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاتی وہ گھر واپس نہیں جائیں گے۔ ان کے اس اعلان پر بہت سے لوگ جن کی داڑھیاں تھیں ان کی طرف بڑھے۔ جب صورتِ حال نازک ہو گئی تو ترکی کی فوج کے جنرل نبی البرتم نے پستول نکال لیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر کسی شخص نے ۸۵ سالہ جنرل انونو کو ہاتھ لگایا تو وہ گولی چلانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس طرح جنرل انونو کو ہجوم سے بچا لیا گیا۔ (بحوالہ مشرق ۶ رمئی ۱۹۶۹ء)

عمران اوکتم (جن کے جنازہ کے ساتھ یہ کچھ کیا گیا) ترکی کی سپریم کورٹ کے صدر تھے اور ان کا جرم یہ تھا کہ اتاترک اور عصمت انونو کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اتاترک اور عصمت انونو کے ساتھ ہزار اختلاف کے باوجود ایک دنیا جانتی ہے کہ اگر ۱۹۲۲ء میں یہ جانباز اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر آگے نہ بڑھتے تو یہ خطیب صاحب اور ان کی مسجد اہلِ صلیب کے تسلط میں ہوتی۔ لیکن مولوی صاحبان کو اس سے کیا غرض۔ ان کا کام تو مسلمانوں کو کافر اور مرتد قرار دینا، ان کی زندگی میں ان کی بیویوں پر طلاق وارد کرنا اور مرنے کے بعد ان کی نمازِ جنازہ کو ناجائز قرار دینا ہے۔ اس کے مظاہرے آپ آئے دن یہاں بھی دیکھتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت کی پرورش اور حوصلہ افزائی کرتی ہی اس لئے ہے کہ یہ اس کی اپنی بقاء اور استحکام کا ذریعہ بنتی ہے۔ بزورِ شمشیر حاصل کرنے والے مستبد حکمران کو ظل اللہ علی الارض کی حیثیت سے منوانا مذہبی پیشوائیت ہی کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ اربابِ اقتدار، لاکھ زور لگاتے، از خود نہ ایسا بن سکتے تھے۔ نہ منوا سکتے۔ اتنا ہی نہیں۔ اربابِ اقتدار جو کچھ کرنا چاہتے اس کے جواز اور عین مطابقِ اسلام ہونے کا فتویٰ ان حضرات سے حاصل کر لیتے تھے۔ اس طرح ان حکمرانوں کی رعایا ان کے ظلم و استبداد اور سلب و نہب کو بطیبِ خاطر برداشت کر لیتی تھی کہ دین کے یہ مدعی اسے منشائے خداوندی کہہ کر عوام کو مطمئن کر دیتے تھے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں۔ ؎

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

ان کی اس قسم کی دین فروشی اور دیدہ دلیری کو دیکھ کر اقبالؒ کا دلِ دردمند پکار اٹھتا تھا کہ: ؎

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر

یہ سیاستِ ملوکیت کی انتہائی چابکدستی تھی کہ اس نے امورِ مملکت تو خود اپنے ہاتھ میں رکھے اور نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر کے انہیں مطمئن کر دیا کہ حکومت کا ایک شعبہ ان کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ امورِ سیاست سے یہ حضرات یکسر بے بہرہ رہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جس طرح یہ لوگ ہندو عیار کے ہاتھوں میں کھلونے بن کر کھیلتے رہے۔ اسے دیکھ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

(غیر منقسم) ہندوستان میں، جب تحریکِ خلافت کے زمانے میں علماء حضرات کو پہلی بار سیاست میں لایا گیا، تو ان کی اس میدان میں تہی ماندگی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اقبالؒ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے اکبر شاہ خاں صاحب (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:۔

"آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خانؒ کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار پھر ہندی مسلمانوں میں قائم کر دیا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔"

پھر انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں ، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ر اپریل کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ :۔

"تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔"

علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ان علماء کو میدانِ سیاست میں لانے کی جو غلطی قوم نے کی ہے اس کا احساس اس زمانے تک کسی کو نہیں ہوا تھا، سو اس کا احساس تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ہوا۔ ہندوؤں نے انہیں اپنا آلۂ کار بنایا اور قوم کی بیشتر توانائیاں وقت اور پیسہ ان کی مخالفت کی مدافعت میں ضائع ہو گیا۔ یہ کہتے تھے کہ جب ہندو ہمیں مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے تو مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کی ضرورت کیا ہے؟ یہ وہی مذہبی آزادی تھی۔ جو انہیں اپنے دورِ ملوکیت میں حاصل تھی۔ یہ اسی کو اسلام کی آزادی سمجھتے تھے۔ اسی بناء پر علامہؒ نے کہا تھا کہ :۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت   نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ ان علماء کے سرخیل کہے جاتے تھے۔ وہ حقیقی اسلام کے مبادیات تک سے کس قدر نا آشنا تھے۔ اس کا اندازہ اس بحث سے بخوبی لگ سکتا ہے جو مسلم قومیت کے مسئلہ پر ان کے اور علامہ اقبالؒ کے مابین ہوئی تھی اس کی یہی وجہ تھی کہ ان کے نصابِ تعلیم سے علومِ سیاسیات اور قرآن دونوں خارج تھے۔ جبہ و قبہ میں ملبوس حضرات، اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے متعلق بار بار کہا کرتے تھے کہ یہ مغرب زدہ انگریز پرست، اسلام نا آشنا، مسٹر قسم کے لوگ ملحد و بیدین ہیں۔ یہ کہا جائیگا اسلام کسے کہتے ہیں؟ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہؒ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ :۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی   اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!

اس وقت ہمارے ایوانِ قانون سازی میں جو ڈھول اُڑ رہی ہے، اس کے ذمہ دار بھی انہی حضرات کے باہمی اختلافات ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ ہم نے اپنے اختلافات مٹا لیے ہیں اور قانون سازی کی متفق علیہ بنیاد فراہم کر لی ہے۔ وہ بنیاد کیا تھی؟ یہ کہ ملک کے قوانین کتاب و سنّت کے مطابق ہوں گے۔ اس باہمی اتفاق کی حقیقت کیا تھی اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ کتاب کا لفظ تو محض برائے وزنِ بیت تھا۔ جہاں تک سنّت کا تعلق ہے) سنّت کا کوئی متفق علیہ مجموعہ تو ایک طرف۔ سنّت کہتے کسے ہیں؟ اس پر بھی سب کا اتفاق نہیں۔ ان کے سب فرقوں کی سنّت الگ الگ ہے۔ اسی پر تو ان کے فرقوں کی بنیاد ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں سوچیے کہ کیا اس بنیاد پر ملک کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکتا ہے جسے یہ سب اسلامی تسلیم کر لیں۔ ہم حیران تھے کہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت بھی ہمارے واضعینِ قوانین کو نظر نہیں آئی؟ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ دُھند چھٹ رہی ہے اور روشنی کی کرن ان حضرات کو دکھائی دینے لگی ہے۔ اگلے دنوں، مجلسِ شوریٰ کے صدر محترم خواجہ صفدر صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ:

اختلاف

> "ملک میں مکمل اسلامی نظام کی راہ میں فقہ کا اختلاف ایک رکاوٹ ہے ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کیے بغیر ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ حماقت ہو گی۔۔۔۔ انہوں نے ایک بار پھر کہا کہ مختلف مکاتبِ فکر کا باہمی فقہی اختلاف تاخیر کا باعث بن رہا ہے اور ہمیں زیادہ سوچ بچار کے بعد ایسا متفقہ لائحہ عمل تیار کرنا ہے جو انتشار کی راہیں بند کر دے"۔ (جنگ۔ لاہور ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء)

ان (مزعومہ) کوششوں کے بارے میں جو اختلافات مٹانے کے سلسلہ میں کی جا رہی ہیں۔ خواجہ صاحب نے دوسرے موقعہ پر فرمایا:-

> "ان فقہی اختلافات پر علمائے کرام غور کر رہے ہیں۔ ان کا حل نکالا جائے گا یہ اختلافات طے کیے بغیر فوری طور پر اسلامی قوانین کا نفاذ انتشار کا باعث بنے گا"
>
> (جنگ۔ لاہور۔ ۲۶۔ مارچ ۱۹۸۳ء)

ہم نہیں سمجھتے کہ محترم خواجہ صاحب جیسا پختہ کار، صاحبِ دانش و بینش سیاست دان اتنی سی بات بھی نہ جانتا ہو کہ جو علماء ہزار برس میں اتنا سا باہمی اختلاف بھی نہ مٹا سکے ہوں کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیے یا نیچی

اُدا نے اور تراویح آٹھ پڑھنی چاہئیں یا بیس، وہ ان فقہی اختلافات کو مٹا سکیں گے جو ملکی قوانین کی تدوین کی راہ میں حائل ہیں؟ ہم سے تو غالب زیادہ معاملہ فہم تھا جو جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ، ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

ان کے یہ اختلافات آج کے پیدا شدہ نہیں۔ (اقبالؒ کے الفاظ میں) "دیرینہ ہے تیرا مرض کوزنگاہی"۔ یہ روایات اور فقہ کے اوّلین دور ہی میں پیدا ہو چکے تھے۔ اس کی ایک مثال علامہ محمد اسلم جیراج پوریؒ" نے اپنی کتاب، ہمارے دینی علوم، میں ان الفاظ میں پیش کی ہے:۔

"روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار، یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں تھا بلکہ ایک ہی مقام میں مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہا، حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابوحنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہوگی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابنِ ابی لیلیٰ سے بھی جا کر یہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابنِ شبرمہ سے جا کر دریافت کیا۔ بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں سوچا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہا ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں راویوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں، فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں۔ مجھے تو حدیث ملی ہے:۔

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع و شرط

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی"۔

یہ سن کر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ حدثنی

ھشام عن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃؓ قالت امرنی رسول اللہ ان اشتری بریرۃ فاعتقھا فاشترط اھلھا الولاء

لانفسهم فقال رسول الله ﷺ ما کان من شرط لیس فی کتاب الله فهو باطل۔

"یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ وہ ان کی رہے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔"

اب ابن شبرمہ کے پاس آیا۔ انہوں نے سب کچھ سُن لینے کے بعد کہا کہ حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعت النبی بعیر او شرطت لی حملانه الی المدینه۔ "یعنی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری شرط یہ منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔"

اس پر علامہ موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں، چار سطروں میں جو تبصرہ فرمایا ہے وہ اپنے مقام پر منفرد ہے۔ فرماتے ہیں:-

"مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف پر نہیں بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز، فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی۔ اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔"

روایات اور فقہ کے یہ اختلاف اسی ایک مسئلہ میں نہیں۔ زندگی کے ہر گوشے اور ہر معاملہ میں یہی کیفیت ہے اور مشکل یہ ہے کہ کوئی فرقہ اپنے معتقدات یا مسائل میں ذرا سی تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ یہ حضرات کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر سکیں یا کسی ایسے ضابطہ پر متفق ہو سکیں جس میں ان کے اختلافات کی گنجائش نہ ہو۔ ایسا سمجھنا خوش فہمی ہی نہیں خود فریبی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کا تشخص ان اختلافات کی غیر متبدل حدود سے متعیّن ہوتا اور قائم رہتا ہے۔ یہ اختلافات مٹ جائیں تو ان کی جداگانہ ہستی ہی ختم ہو جائے۔ توحید کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اختلافات کے بُت باقی نہیں رہتے۔ غالب نے کس قدر عمیق اور بلیغ انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ کہ:-

ہم مؤحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ حضرات بڑے دعوے سے کہا کرتے ہیں کہ اس بات کا ثبوت کہ ہمارے اختلافات مٹ سکتے ہیں. تحریک نظام مصطفےٰ کا متحدہ محاذ ہے جس میں مختلف فرقوں کے علماء اپنے اختلافات مٹانے ہوئے شانہ بشانہ جادہ پیما تھے۔ ان حضرات کے اختلافات کس حد تک مٹ چکے تھے۔ اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگایئے۔ مفتی محمود (مرحوم) نے حیدرآباد پریس کلب میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مودودی صاحب (مرحوم) کے متعلق فرمایا تھا:-

"مودودی نے جمیعت العلماء کے مولویوں کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ مودودی کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں اور وہ سب مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔ میں آج اس پریس کلب میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی، گمراہ، کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس سے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا، ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے۔ وہ امریکہ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔ اب وہ موت کے آخری کنارے پہ پہنچ چکا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔"

(ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۹ء)

متحدہ محاذ میں شمولیت کے باوجود، نہ مفتی صاحب نے اپنے اس فتویٰ کو واپس لیا تھا اور نہ ہی مودودی صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

جمیعت العلماء اسلام اور جمیعت العلماء پاکستان، دونوں اہلِ سنّت والجماعت کے حنفی فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ دونوں متحدہ محاذ میں شامل تھیں لیکن اس کے باوجود باہمی اختلافات کی کیفیت یہ تھی کہ:-

"۲۵۔ اگست ۱۹۷۷ء کی شام، پاکستان متحدہ محاذ کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے تو اسلامی اخوت اور نظام مصطفےٰ کے قیام کے دعوے داروں کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مفتی صاحب اور نوابزادہ نصراللہ خاں دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے۔

اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی۔ جب کہ مولانا نورانی اور میاں طفیل محمد دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں شاہ احمد نورانی نے جماعت کرائی اور تحریک استقلال کے میاں محمود علی قصوری نے بھی نورانی صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔"

(مساوات، ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء)

اس سے واضح تر، مولانا نورانی کی وہ تقریر ہے جو معاصر ایشیا کی (۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء) کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا:۔

"ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں اور مولانا عبدالستار نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب۔ یہ ابھی تین چار روز پہلے (۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات) کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے گئے تاکہ دارالعلوم اور ایک مسجد کا سنگ بنیاد ان سے رکھوایا جائے تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں، انہوں نے یہ فرمایا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں، آپ میں بڑی رواداری ہے۔ آپ میں بڑی فراخدلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے۔ قید کے ان لمحات میں رواداری اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہو گئی تو میں نے جواباً عرض کیا۔ جنرل صاحب بڑا افسوس ہے۔ آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہم میں الحمد للہ بڑی وسعت قلب ہے لیکن گستاخ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضور پر نورؐ کی شان میں تنقیص کرنے والے کے لئے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہل سنت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کا لکھا ہوا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتویٰ موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے۔ ہم الحمد للہ! اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو خواہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ کا ہو۔ کسی شاتم رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اور میں نے کہا۔ جناب والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں، ہم تو حرمین شریفین کے نجدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے' یہ ملا جو چار ٹکے کے ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ

کو یہ غلط اطلاع ملی ہے، آپ مطمئن رہیں، ہمارے مسلک میں ایسی رواداری، فراخ دلی اور وسعت قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتمِ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے نہ آئندہ ہو گی اور اس کے لئے لوگ بہت سی باتیں کہتے ہوں گے۔ قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوتی تھی علمائے ازہری موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رُخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رُخ ان سے دوسری طرف۔ اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں، بے شمار لوگ ہیں"۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت فروری ۱۹۷۸ء صفحہ ۶۲)

یہ تھی نظامِ مصطفیٰؐ کے لئے جہاد میں ان کی صفوں میں اتحاد کی عملی شکل! وہ اتحاد کسی مذہبی مقصد کے لئے تھا ہی نہیں، سیاسی مفاد کے لئے تھا۔ مقصد مذہبی ہوتا تو اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جوں ہی وہ مقصد ختم ہوا، وہ اتحاد بھی کالعدم ہو گیا۔

ملوکیت کا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ یہ حضرات ایسے بے کار مسائل کے متعلق بحثوں میں اُلجھے رہیں جن کا زندگی کے عملی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور قوم تشتت و انتشار کا شکار رہے۔ مثلاً ؂

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے | ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے | یا مجدّد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم | اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ)

غرضیکہ :-

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے | تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

جس اسلام کی قوم کو تلقین کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنی اسی نظم میں جس کے چند اشعار پیشِ خدمت کئے گئے ہیں۔ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے کہلوایا ہے :-

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود | ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں | ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج | صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

اور آخر میں یہ کہ :-

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

اس کی تیغِ بے نیام کے کُند ہو کر رہ جانے کی اس سے بڑی اور زندہ شہادت کیا ہو سکتی ہے کہ ابھی کل کی بات ہے فلسطین اور لبنان کی سرزمین بے گناہ مردوں، مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کے خون سے لالہ زار بنی رہی اور اب تک بن رہی ہے۔ لیکن مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک دیکھئے تو ان آزاد مملکتوں کے مسلمانوں کی تلواریں سب کی سب کُند ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک بھی فضا میں نہیں اُبھری۔ اور اس تمام دوران میں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان حج کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے اور عرفات کے میدان میں دشمنانِ اسلام کی ذلت و خواری کی دعائیں مانگ کر اپنے اپنے ممالک کی طرف واپس آتے رہے ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ آسام کے مسلمان، بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں یا ڈھور ڈنگر کی طرح اپنے گھروں سے باہر ہانکے جا رہے ہیں۔ خونِ مسلم کی اس بے پناہ ارزانی کے خلاف کہیں سے آواز تک نہیں اٹھتی۔ البتہ ایک ایک مسجد کے چار چار لاؤڈ سپیکروں سے ذکر و فکر کی محفلیں گرم کر کے جنت میں محلات تعمیر کرانے کے اعلانات مسلسل و پیہم فضا میں گونجتے رہتے ہیں۔ یہ سب اس اسلام کی برکات ہیں جس کے بیج ہمارے دورِ ملوکیت میں بوئے گئے اور جسے آج استعماری قوتوں کی نوازش ہائے گراں مایہ سے پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ اقبالؒ بہت پہلے اس گُر کو سمجھا گیا تھا کہ :-

ترا این نکتہ باید حرزِ جاں کرد   بسر اگفت پیرے خرقہ بازے
زفیضِ شاں براہیمیؑ تواں کرد   بہ نمرودانِ ایں دَور آشنا باش

(ارمغانِ حجاز)

"ایک عیار جُبّہ پوش نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں تمہیں ایک گُر بتلاتا ہوں جسے اچھی طرح گرہ میں باندھ لو۔ وہ گُر یہ ہے کہ اس دَور کے نمرودوں کے ساتھ یارانہ رکھو، اور ان کے فیوض و اکرام سے "اسلام کا جھنڈا" بلند کرتے رہو"۔

اس دَور کے نمرودوں نے اس مقصد کے لئے سب سے پہلا دانہ اس وقت پھینکا جب انہیں کمیونزم کی یلغار کو روکنے کے لئے مسلم ممالک کی تائید اور حمایت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے انہیں سیاسی دعوت نہیں دی۔ ان کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا۔ انہوں نے آواز دی کہ :-

"دنیا کے خدا پرستو! آؤ! اس الحاد اور بے دینی کے خلاف متحدہ محاذ بنائیں"۔

قرآن کی رُو سے جس طرح ابلیس خدا کا منکر ہے اسی طرح مغرب کی عیسائی اقوام بھی اس کی منکر ہیں۔ وہ ان دونوں میں فرق نہیں کرتا اور دونوں کو اس خدا پر ایمان لانے کے لئے کہتا ہے، جس کا تصوّر قرآن پیش کرتا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس دعوت پر گھی کے چراغ جلائے اور اس پر لبیک کہتے ہوئے ان کی طرف دوستی (کیا؟ زیردستی) کا ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ اگر سرمایہ دار اقوامِ مغرب کا یہ بلاک فی الواقعہ مسلمانوں کی حمایت چاہتا ہے تو انہیں یہ دعوت ان کی مذہبی پیشوائیت کو دینی چاہیئے۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کر لی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں... مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے"۔

(اخبار تسنیم، مورخہ ۱۶ ، تا ۲۰ ، دسمبر ۱۹۵۵ء)

بات بالکل واضح تھی۔ مسلم ممالک کے عوام مذہب پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے اس بلاک سے جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ تم ان ممالک کے حکمرانوں کے بجائے وہاں کی مذہبی پیشوائیت سے معاملہ کرو۔ وہاں کے عوام کا تعاون بھی تمہیں حاصل ہو جائے گا اور حکمرانوں کا بھی، کیونکہ جب ہم کہیں گے اس بلاک کی حمایت اسلام کا تقاضا ہے تو ان (حکمرانوں) کو جرأت نہیں ہو گی کہ وہ اس کے خلاف جا سکیں۔ اس بلاک اور ہماری مذہبی پیشوائیت میں اس باب میں کس قسم کی سودا بازی ہوئی اس سے پہلے تو یہ راز ہی تھا لیکن اب اس تحریک کی شکل میں مبرہن ہو گئی ہے۔ جسے فنڈامینٹل ازم کہا جاتا ہے۔ اس کے مراکز مغربی ممالک میں ہیں اور شاخیں مسلم ممالک میں (سرطان کی طرح) پھیلی ہوئی ہیں۔ زر و سیم کے چشمے وہاں سے اُبلتے ہیں اور ان کے صدقے، ان کی منشا کا "اسلام" ساری دنیا میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اسلامک مشن، اسلامک سنٹرز، اسلامک کانفرنسیں

اسلامک سیمینار۔ اور نا معلوم کیا کیا "اسلامک"؟ اور پھر، اس مقصدِ جلیلہ کی خاطر، ہمارے مذہبی راہ نما جس طرح سال کا آدھا آدھا حصّہ، ان ممالک کے اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں گزارتے ہیں، وہ کس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے؟ اس تناظر میں آپ کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی جسے اس دیدہ ورنے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ:-

بہ نمرودانِ ایں دَور آشنا باش　　　ز فیضِ شانِ براہیمی، تواں کرد

اس طرح وہ خطرہ ٹل گیا جو ہمارے دَور کی ملوکیت اور سرمایہ داری کو عفریت کی طرح ڈراتا تھا کہ:-

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

ان سے کہہ دیجئے کہ آپ ان خرقہ بازوں سے ساز باز رکھئے اور چین کی نیند سوئیے۔ یہ شرعِ پیغمبرؐ کو کبھی آشکارا نہیں ہونے دیں گے۔ کہ اس سے تمہارا ہی نہیں، خود ان کا مفاد بھی وابستہ ہے۔

والسلام

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب یومِ اقبال ۱۹۸۴ء
خصوصی خطاب

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر

عزیزانِ گرامی قدر! السلام و رحمت

آج کی تقریب اُس جلیل القدر، نادرۂ روزگار ہستی کی یاد میں منعقد کی گئی ہے جس کا نام ہمارے محسنینِ ملت کی فہرست میں سرِ عنوان آتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اربابِ دانش و بینش کو فکری اور تخیلاتی اُفق پر ایک جہانِ نَو سے روشناس کرایا۔ اسلامیانِ ہندو پاک کو اس الوہیاتی حقیقت سے متعارف کرایا کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے جس کا احیاء اور قیام صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن ہے اور پھر اس آزاد مملکت کے اسلامی خط و خال متعین کر کے اس کے حصول کی راہیں متعین کیں۔ آج اگر ہمارا شمار دنیا کی آزاد قوموں میں ہوتا ہے تو یہ بنیادی طور پر اسی کی نگہِ دوررس اور حقیقت شناس کا تصدق ہے اور اگر اس خطۂ زمین میں کبھی صحیح اسلامی (قرآنی) مملکت کا قیام عمل میں آیا، تو وہ بھی اسی قرآنی مفکر کے تصورات کی رہینِ منت ہوگی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

علامہ اقبالؒ کو ایک شاعر یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ شاعر ہو یا مفکر، وہ اپنے خیالات کی دنیا میں مستغرق رہتا ہے اور اسے دنیائے ممکنات (انسان کی عملی زندگی) سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس شاعر اور مفکر کی کیفیت اس سے مختلف تھی۔ اس کی فکر کی ابتداء دنیائے ممکنات کے سنوارنے سے ہوتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ:

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے   بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

یہ اس لئے کہ اُن کی فکر کا سرچشمہ خدا کی کتاب تھی، جس نے مومن کی زندگی کے سلسلہ میں اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً پہلے کہا ہے اور فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً اس کے بعد (۲/۲۰۱) بالفاظِ دیگر، وہ

انسان کی موجودہ دنیا سنوارنے سے اس کی اُخروی زندگی سنورتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کے نزدیک اُخروی زندگی موجودہ زندگی کے تسلسل کا نام ہے۔ حیات ایک جوئے رواں ہے جو یہاں سے وہاں تک مسلسل چلی جاتی ہے اس لئے جیسی یہاں کی زندگی، ویسی وہاں کی زندگی۔ مَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۷/۷۲) جو یہاں اندھا ہے، وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔

جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے — وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے — وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا

روٹی کی اہمیت

دنیاوی زندگی کا مدار سامانِ زیست پر ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں رزق کہا جاتا ہے، اور ہمارے ہاں اسے "روٹی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے رزق یا روٹی کو کسقدر اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں جنت کی خصوصیت یہ بتائی ہے؛ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) اس میں جہاں سے کسی کا جی چاہے پیٹ بھر کر کھائے۔ یعنی اس میں رزق کے معاملے میں "میری اور تیری" کی تفریق نہ ہو۔ اس کا دسترخوان تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں بچھا ہو۔ جہاں سے ہر شخص، اپنی ضرورت کے مطابق، بلا تکلف لے لے۔ دوسرے مقام پر اس کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کردی: إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ (۲۰/۱۱۸) وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ (۲۰/۱۱۹)۔ اس میں بھوک، پیاس اور رہائش کا سامان ہر ایک کے لئے یکساں موجود ہوگا، کوئی اس سے محروم نہیں ہوگا۔" یہ تو ہی جنت میں آدم کی زندگی۔ حضرت ابراہیمؑ جب خدا کے گھر کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو خدا سے پہلی دعا یہ مانگی کہ وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ ... (۲/۱۲۶)۔ "وہاں کے رہنے والوں کے لئے سامانِ رزق فراہم کیا جائے"۔ اس نے اقوامِ عالم کے لئے زندگی کی جن آسائشوں کا ذکر کیا ہے، ان میں رزق سرِفہرست ہے۔ سورہ نحل میں تمثیلاً ایک بستی کا ذکر ہے جو نعماءِ خداوندی سے متمتع تھی۔ اس کے متعلق کہا کہ يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ ... (۱۶/۱۱۲) "اس کی طرف ہر گوشے سے سامانِ زیست چلا آتا تھا۔" اس نے قریش کو جن انعاماتِ خداوندی کی یاد دلائی تھی۔ اس کے متعلق کہا تھا: أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۴) "وہ روٹی کی طرف سے مطمئن، اور خطرات سے مامون تھے"۔ اس نے بھوک اور خوف کو خدا کا عذاب بتایا ہے۔ جس بستی کا تمثیلی ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ اسے سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل تھیں۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ جب اس نے کفرانِ نعمت کیا تو: فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ ... (۱۶/۱۱۲)

"اس پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہوگیا"۔ جہاں جنتی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ اس میں ضروریاتِ زندگی کی فراوانی ہوگی، اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی کر دی کہ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا۔ "جو قوم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتے گی، اس کی روزی تنگ ہو جائے گی، وہ بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو جائیگی"۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴) "جس کی روزی یہاں تنگ ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔"

رزقِ کریم

لیکن قرآنِ کریم نے رزق کے ساتھ ایک شرط عائد کی ہے۔ یعنی رزقِ کریم، باعزت روٹی۔ روٹی تو ہر طریق سے حاصل کی جا سکتی ہے، لیکن ایک روٹی وہ ہے، جسے عزت بیچ کر حاصل کیا جاتا ہے، اور ایک وہ جس میں عزت وآبرو برقرار رہتی ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے، ایمان و اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں جو مملکت حاصل ہوتی ہے، اسے استخلاف فی الارض، یعنی اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ (وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ... (۲۴/۵۵) اور اس اسلامی مملکت میں جو رزق حاصل ہوتا ہے، وہ اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارتا ہے۔ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۲۲/۵۰) "جو لوگ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے حامل ہوں گے، انہیں خطرات سے حفاظت بھی ملے گی اور رزقِ کریم، باعزت روٹی بھی"۔ اس نے اسے رزقِ طیب بھی کہا ہے۔ یعنی خوشگوار، زندگی بخش اور پاکیزہ رزق۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعماء کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ... (۱۰/۹۳) بنی اسرائیل کو تمکن عطا کیا اور رزقِ طیب۔ یہی مومنین کے متعلق کہا۔ مہاجرین اور مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۸/۴)۔ "یہ پکے اور سچے مومن تھے۔ انہیں خطرات سے حفاظت اور رزقِ کریم حاصل تھا۔" اسی کو اکلِ حلال کہا گیا تھا۔

اقبال نے قرآنِ کریم کے اس بنیادی نکتہ کو پا لیا تھا، اور حیرت ہے کہ اسے اس نے ابتدائی عمر ہی میں پا لیا تھا۔ اس نے کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے دو تین سال بعد جو اپنی سب سے پہلی کتاب تصنیف کی، اس کا موضوع تھا "علم الاقتصاد" وہ فلسفہ کے طالب علم تھے۔ اقتصادیات ان کا مضمون نہیں تھا، لیکن ان کی نگاہ میں معاشیات کی اس قدر اہمیت تھی کہ انہوں نے سب سے پہلے اسی موضوع کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ جب ان کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں انہوں نے کہا تھا:۔

اقبالؒ اور غریبوں کی آہیں

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں، اصول مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی، اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود وعدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔"

(اقبالؒ اور قرآن جلد ۱ صفحہ ۱۷۸)

یہ ایک فلسفہ کے طالب علم، نوجوان کے احساسات ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ان کا سینہ اسی زمانے میں غریبوں اور مفلسوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات سے کسقدر گداز تھا۔ اس کے بعد وہ حصولِ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کے خونچکاں، انسانیت کش مظاہر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی کے بعد انہوں نے ۱۹۱۰ء میں علیگڑھ میں وہ معرکہ آراء تقریر کی جس کی صدائے بازگشت آج تک برِصغیر پاک وہند کے در و دیوار سے سنائی دیتی ہے (مولانا) ظفر علی خان (مرحوم) نے اس تقریر کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ ملتِ بیضا پر عمرانی نظر۔ اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:

ملتِ بیضا پر عمرانی نظر

یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان

اور ان کے پیٹ بھر روٹی کے لئے ترستے ہوئے بچّوں کا حسرتناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہو
کے کسی اسلامی محلہ میں جانکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی، جس کے وحشت
زا سکوت کے طلسم کو وہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچّوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت
آمیز صدا توڑتی ہو گی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی
ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی
پاؤ گے۔ جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا
ایک دانہ تک منہ میں اُڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات
کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پسار یں؟"

اس کے بعد علامہ اقبالؒ عمر بھر بھوک اور افلاس کے خلاف مصروف جہاد رہے۔ اس کا علاج قرآن کا معاشی نظام تھا جس کا قیام اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر عطا فرمایا تھا۔ اپنی آزاد مملکت اور اس میں رزق کریم، باعزّت روزی ہر ایک کے لئے۔ اقبالؒ کا ابلیسی نظام سرمایہ داری کے خلاف جہاد اس مقصد کے حصول کے لئے تھا۔

نظام سرمایہ داری کی بنیاد محنت کش طبقہ کا استحصال (EXPLOITATION) ہے۔ بانگ درا میں ان کی زہرہ گداز نظم "خضرِ راہ" کا ایک گوشہ اسی استحصال کے خلاف نعرۂ انقلاب ہے۔ اس میں اقبالؒ کے سوال کے جواب میں "خضر" کہتا ہے۔

بندۂ مزدور

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا؟ ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

العفو

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے۔ اسی دولت کے بل بوتے پر سرمایہ دار، دوسروں کی محنت کے ماحصل کو چھین لیتا ہے۔ قرآن کی زبان میں فاضلہ دولت کو العفو کہہ کر پکارا گیا ہے اس کے نظام میں العفو کسی کے پاس نہیں رہتا۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ط (۲/۲۱۹) "یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر۔ دوسروں کی ضرورت کے لئے دے دیں کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، سب کا سب"۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کے پاس فاضلہ دولت رہے گی نہیں، تو نظامِ سرمایہ داری خود بخود ختم ہو جائے گا۔ روس میں جب کمیونزم کا غلغلہ بلند ہوا تو وہ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف انقلابی نعرہ تھا۔ اقبالؒ نے اس سے محسوس کیا کہ زمانے کے تقاضے، شاید قرآن کے معاشی نظام پہ پڑے ہوئے پردے اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کمیونزم کا سُقم

کمیونزم، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف برہنہ آواز تھی۔ لیکن ذرا آگے چل کر اقبالؒ کی نگہ، حقیقت شناس نے دیکھ لیا کہ کمیونزم کے فلسفہ کی رُو سے وہ جذبۂ محرکہ میسر نہیں آسکتا جو العفو کے بارِ گراں کا متحمل ہو سکے، اس لئے روس کا نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے روس کو اس سے متنبہ کیا اور کہا:-

ایکہ می جوئی نظامِ عالمے — جُستۂ او را اساسِ محکمے!

لینن خدا کے حضور

یہ اساسِ محکم قرآنی نظام میں مل سکتی تھی۔ چونکہ قرآنی نظام کا قیام، نظامِ سرمایہ داری کا تختہ اُلٹنے کے بغیر ممکن نہ تھا، اس لئے علامہؒ اس کے خلاف، مختلف اسالیب و انداز سے ستیزہ کار رہے۔ ان میں سب سے زیادہ دلکش انداز وہ ہے جسے بالِ جبریل کی دو مربوط نظموں میں اختیار کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے وہ لینن کو بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خدا سے ان سوالات کے جواب مانگتا ہے جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے ہیں۔

وہ خدا سے کہتا ہے کہ ہمیں تو خدا کے منکر و ملحد اور بے دین کہا جاتا ہے۔ لیکن میں، بصد ادب یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ:

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی — مغرب کے خداوند، درخشندہ فلزات

اہلِ مشرق، یورپ کے حکمرانوں کے پرستار ہیں اور اہلِ یورپ دولت کے پرستار، میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ انسان کہاں بستے ہیں جو تیرے پرستار ہیں؟ مجھے تو وہ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

لینن

اقبالؒ نے لینن کے مکالمہ کے پردے میں ایک بے باک حقیقت کو عریاں کیا ہے۔ یعنی اس حقیقت کو کہ اس وقت دنیا میں خدا کی حکمرانی کہیں بھی نہیں، مشرق کی محکوم قوموں کے خدا، مغرب کے حکمران ہیں۔ اور مغرب کے حکمران، دولت کے محکوم۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ کہیں کہا ہے کہ۔ نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری۔ کہیں یہ کہ — یہ تیرے کافر و مومن تمام زناری۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں :-

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ — وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

اس اعتراض کے بعد پھر لینن کی طرف آئیے وہ خدا سے کہتا ہے :-

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

اس کے بعد وہ ذرا کھل کر بات کرتا ہے اور کہتا ہے :-

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ :-

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تیری منتظرِ یومِ مکافات

فرشتوں کا گیت

یہ سوال فرشتوں کے دل کو بھی وقفِ اضطراب کئے ہوئے تھا، جسے حضرت علامہؒ اگلی نظم میں سامنے لائے ہیں۔ قرآن میں، قصۂ آدم کے ضمن میں، (جو درحقیقت تمثیلی انداز میں خود آدمی کی داستان ہے) کہا گیا ہے کہ خدا نے ملائکہ سے کہا کہ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً... (۲/۳۰) "میں دنیا میں ایک صاحبِ اختیار مخلوق پیدا کر رہا ہوں" اس پر

فرشتوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ ۚ "بارالٰہا! کیا تو کرۂ ارض کو ایسی مخلوق کے سپرد کرنا چاہتا ہے جو وہاں خونریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گی؟" جواب ملا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۳۰) "ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔" ؎۱

یہ سن کر فرشتے خاموش ہو گئے۔ خاموش تو ہو گئے، لیکن دل میں یہ کھٹک رہی کہ دیکھیں اس مخلوق جدید میں کون سے جوہر پنہاں ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے، صرف خدا جانتا ہے۔ اس کے لئے وہ تاریخ انسانیت کا مشاہدہ کرتے رہے، لیکن، نہ صرف یہ کہ انہیں اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا، دورِ حاضر میں پہنچ کر انسان کی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں نے انتہائی شدت اختیار کر لی۔ اس پر فرشتوں کا پیمانۂ ضبط لبریز ہو گیا، اور انہوں نے جرأت کر کے کہہ ہی دیا کہ "حضور کا ارشاد بجا، اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" لیکن واقعہ یہ ہے کہ ؎۲

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی　　نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں، رند و فقیہہ و میر و پیر　　تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست　　بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن، بندگیٔ ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

انسان سازی کے تخلیقی مراحل

قرآن کریم کا مقصود و منتہیٰ ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما ہو کہ وہ ایسا انسان بن جائے جو مشیتِ ایزدی کے معیار پر پورا اترے۔ لیکن وہ انسان کو اس مقام تک انقلابی طریق سے نہیں، ارتقائی انداز سے پہنچانا چاہتا ہے۔ اور ارتقائی انداز سے منازل بڑی سست رفتاری سے طے ہوتی ہیں۔ عجلت پسند انسان اس آخری منزل کو اپنے سامنے جلد دیکھنا چاہتا ہے،

؎۱۔ ان امور کی وضاحت میری کتاب، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۴۲ میں ملے گی۔
؎۲۔ اس نظم میں جو کچھ فرشتوں کی زبان سے کہلوایا ہے وہ درحقیقت انسان کے موجودہ معاشرہ کی بے نقاب تصویر ہے۔

اور نظامِ فطرت کی آہستہ خرامی سے جھنجلا اٹھتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر متنوع انداز سے بیان کیا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ :-

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا ۔۔۔ وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

اور کبھی بارگاہِ خداوندی میں بہ پرسوز گلہ کرتا ہے کہ :-

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا ۔۔۔ کہ پیدائی تیری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

فرشتوں کی وہ شکایت زنگیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، دراصل خود انسان کے قلبِ مضطرب کی بیتابی دھڑکن ہے کہ یہ منازل برق رفتاری سے طے کیوں نہیں ہوتیں؟ اس کا جواب خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ قانونِ مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر باطل نظام کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد میں تخریب مضمر ہوتی ہے لیکن وہ رفتہ رفتہ اس مقام کی طرف بڑھتا ہے اس کی رفتار تو بڑی سست ہوتی ہے، لیکن جب وہ آخری لمحہ آجاتا ہے تو وہ نظام اور وہ قوم، جو اس باطل نظام کی حامل ہوتی ہے، اس طرح تباہ و برباد ہوتے ہیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ قرآن اپنے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت میں اقوامِ سابقہ کے تاریخی شواہد پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم ان سے خود اندازہ لگالو کہ باطل کے تخریبی نظام کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔

باطل کا انجام

وہ قوم ثمود کے متعلق کہتا ہے کہ اس کے سرغنوں نے زمین اور اس کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ جما رکھا تھا کہ غریبوں اور کمزوروں کے مویشی پانی پینے تک کو ترس جاتے تھے۔ انہیں بہتیرا سمجھایا لیکن وہ اپنی اس مستبدانہ روش سے باز نہ آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا (۹۱/۱۴) خدا نے، اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ان کے جرائم کی بنا پر اُن پر اس طرح روڈ رولر (ROAD ROLLER) پھیر دیا کہ سب اونچ نیچ برابر ہوگئی۔ غریب اور امیر کا امتیاز مٹ گیا۔ طبقاتی تقسیم ختم ہوگئی۔ وہ، قومِ مدین کی داستان کے ضمن میں کہتا ہے کہ ان کی تجارت سراسر فریب کاری تھی۔ جس سے وہ غریبوں کو لوٹتے تھے۔ جب وہ اس سے باز نہ آئے تو ان کی بستیاں اس طرح برباد ہوگئیں، كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا (۱۱/۹۵)، "گویا ان میں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا۔" وہ قومِ لوط کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے، جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۱۱/۸۲)، "اس کی بلندیاں، پستیوں میں بدل گئیں"۔ وہ ہر ظالم قوم کے انجام کے متعلق کہتا ہے؛ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ... (۶/۴۵)۔ "ان کی جڑوں تک کٹ جاتی ہیں"۔

دوسری جگہ ہے، وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ... ۝ (۲۸/۵۸) "کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں، لیکن چونکہ تقسیمِ رزق کا نظام ظالمانہ تھا، اس لئے وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ ہیں ان کے اُجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔" ان کی بستیوں کے کھنڈرات ان کی بربادی کے نوحہ خواں ہیں۔ ایک آیت میں ان کی تباہی کی ایسی مثال دی ہے جس سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ کہا کہ وہ اپنی بربادیوں کو دیکھ کر چیختے چلاتے رہے۔ لیکن کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ۝ (۲۱/۱۵) "تاآنکہ وہ قوم ایسی ہو گئی جیسے کٹا ہوا کھیت ہو، یا بجھا ہوا شعلہ"۔

فرمانِ خدا

خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے باطل نظام کی حامل قوموں کا یہی انجام ہے، جسے اقبالؒ نے انتہائی اثرانگیز محاکاتی انداز میں فرشتوں کے نام، فرمانِ خداوندی کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ کہا کہ خدا نے فرشتوں کی شکایت سُن کر کہا ؎

اُٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کچھ عرصہ پہلے، کمیونسٹ نوجوان، "گھیراؤ، جلاؤ" کے اپنے تخریبی پروگرام کی تائید میں اقبالؒ کا یہ شعر گلی گلی، کوچے کوچے گاتے پھرا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ دیکھئے! اقبالؒ جیسا مفکر بھی جلانے، مٹانے کی تلقین کرتا ہے۔ انہیں کون بتاتا کہ اقبال جلانے مٹانے کی تلقین نہیں کرتا۔ وہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے باطل نظام کے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے کہ جس قوم میں ظلم و استبداد اس حد تک پہنچ جائے کہ کاشتکار سال بھر محنتِ شاقہ سے اپنا لہو پسینہ ایک کر دے، لیکن اس کی فصل کو زمیندار اُٹھا کر اپنے گھر لے جائے، اسکا انجام یہ ہوتا ہے کہ جس فصل سے کاشتکار کے بچوں کو محروم کیا گیا تھا، خود زمیندار اور اس کے بچے بھی اس سے محروم رہ جایا کرتے ہیں۔ تباہی و بربادی کا ایسا بے پناہ سیلاب آتا ہے جو ان سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی پُرکاری

فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی کے ایک حصے کو آپ دیکھ چکے۔ اس کے بعد اگلے حصے میں اقبالؒ نے اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھایا ہے کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام مذہبی پیشواؤں کی خدا فریبیوں کے بل بوتے پر قائم ہوتا ہے، جا بجا

حکمران اور خون آشام سرمایہ دار، غریبوں اور کمزوروں کو کچلتے چلے جاتے ہیں، اور مذہبی راہنما انہیں تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں کہ یہ سب خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ حکومت اور دولت خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں وہ جسے چاہے امیر بنادے اور جسے چاہے فقیر کردے۔ خدا کی مرضی کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف احساسِ شکایت پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ انسان کو راضی برضا رہنا چاہیئے۔ ان حاکموں اور سرمایہ داروں کو اس دنیا میں یہ کچھ مل رہا ہے، تمہیں آخرت میں جنت عطا ہو گی۔ وہ اپنے اس قسم کے سحر کار وعظوں اور سامراجی نصیحتوں سے غریبوں اور مظلوموں کو افیون پلاتے رہتے ہیں۔ مستبد نظامِ ملوکیت اور خون آشام نظامِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے ضروری ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کیا جائے۔ اس لئے فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی میں کہا گیا ہے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے ہٹادو
"حق را بسجودے صنماں را بطوافے" — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھادو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنادو

آپ اقبالؒ کے پیغام کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے، وہ آمریت اور سرمایہ داری کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کو بھی انسانیت کے لئے باعثِ عذاب قرار دیتا ہے۔ وہ اُمت کی تباہی کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سُود خوار و والی و مُلّا و پیر

دوسرے مقام پر کہا ہے:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کُشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

اصل یہ ہے کہ ملوکیت کا استبداد اور سرمایہ داری کا استحصال بنیاً ہی مذہبی پیشوائیت کی مقدس سحر کاریوں کے بل بوتے پر ہے۔

نظامِ زمینداری

اقبالؒ نظامِ سرمایہ داری کو کاروباری طبقہ تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ نظامِ زمینداری کو بھی اس کا جزو قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے متعلق فرمایا کہ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے ذریعۂ رزق ہے۔ اس لئے اسے تمام افرادِ انسانیہ کے لئے یکساں کھلا رہنا

چاہیئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بنیادی حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ میں یہاں اس کے صرف ایک مقام پر اکتفا کروں گا۔ سورۃ واقعہ کی چند آیات میں اسے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا ہے:۔

"تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے۔ اور سوچو کہ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے کسب و ہنر کی رُو سے۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے، اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے؛ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ ایسا تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ہوتا ہے"؟ أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ○ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ○
(۵۶/۶۳-۶۴)

اس کے بعد کہا کہ تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی کا ہی نہیں، خود تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے"؟ (۵۶/۶۸-۶۹)

اس کے بعد کہا کہ تم اس آگ (حرارت) پر غور کرو جس سے تم اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں سے حرارت کو یوں مستور کر دینا، تمہاری کارگیری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے"۔ أَفَرَءَيْتُمُ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى تُورُونَ ○ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنشِـُٔونَ (۵۶/۷۱-۷۲)

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو کہ اس میں تمہارا حصّہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر! تم کسی نہج سے بھی غور کرو، بہر حال اس نتیجے پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے ماحصل میں تمہارا حصّہ صرف تمہاری محنت کے بقدر ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو۔ اور ہمارا حصّہ ہمیں دے دو۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصّہ آپ تک کیسے پہنچائیں؟ جواب دیا مَتَٰعًا لِّلْمُقْوِينَ ○ (۵۶/۷۳) "یہ انہیں دے دو جو اپنا رزق پیدا کرنے سے معذور ہیں"۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔

اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بالِ جبریل کی اس نظم میں بڑی برجستگی سے بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے:۔

الارضُ للہ !

اور نظم یہ ہے !

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟ — خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں ! (بالِ جبریل صفحہ ۱۶۱)

ظاہر ہے کہ جب زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، تو نہ کوئی شخص زمیندار ہو سکتا ہے، نہ اس کا کوئی مزارع جسے زمین بٹائی یا پٹہ پر دی جائے۔ اس باب میں حضور نبی اکرمؐ کا ایک فیصلہ حقیقتِ ثابتہ ہے۔ صحاحِ ستہ کے ایک مجموعہ، ابو داؤد، میں حضرت ابن ابی نعیمؓ کی ایک روایت ہے کہ:-

مزارعت

"رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت کی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف سے ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔"

(شاہکارِ رسالت صفحہ ۲۸۲)

ربٰو کا مفہوم

یہاں حضورؐ نے فرمایا کہ مزارعت بھی سودی کاروبار یعنی ربٰوا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام کے سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ ربٰو کسے کہتے ہیں۔ زمانۂ نزول میں قرآن میں عربوں میں "سرمایہ داری" کی اصطلاح رائج نہیں تھی۔ اس کی بجائے ربٰو کی اصطلاح عام تھی۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ ربٰو سے مراد نظامِ سرمایہ داری ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹) "معاوضہ محنت کا ہے"۔ اس کے برعکس نظامِ سرمایہ داری میں معاوضہ سرمایہ (CAPITAL یعنی روپے) کا ہوتا ہے۔ لہٰذا، اسلامی نظام اور نظامِ سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ قرآن کریم میں مختلف جرائم کی سزائیں مذکور ہیں۔ لیکن ربٰو کے

متعلق کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو، فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔۔۔ (۲/۲۷۹) "اے خدا اور رسولؐ کی طرف سے لپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھو"۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کی رُو سے ربٰو اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت ہے ۔ یعنی جس طرح اسلام اور نظامِ ملوکیت یکجا نہیں ہو سکتے، اس طرح اسلام اور نظامِ سرمایہ داری بھی یکجا نہیں رہ سکتے۔ جب کہا کہ تم اس سے باز آجاؤ، تو اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی۔ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۔۔۔ (۲/۲۷۹) "تم صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو، اس سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں لے سکتے کہ وہ ربٰو ہوگا" اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے:۔

۱۔ اسلام اور نظامِ سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

۲۔ نظامِ سرمایہ داری کے معنی ہیں، محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا معاوضہ لینا، خواہ وہ کسی شکل میں ہو، زمانۂ نزولِ قرآن میں ربٰو کی تین شکلیں رائج تھیں:۔

(i) دست بدست (ذاتی) قرضوں پر سُود۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر اسے ختم کر دیا کہ تم صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں۔ حتیٰ کہ اگر مقروض تنگدست ہو تو اصل زر بھی چھوڑ دو تو بہتر ہے۔ (۲/۲۸۰)

(ii) زمین کو بٹائی یا پٹہ پر دینا۔ پہلے اسے ربٰو قرار دے کر ناجائز ٹھہرا دیا اور جب زمین مملکت کی تحویل میں لے لی گئی تو اس قسم کی کوئی شکل باقی نہ رہی۔

(iii) عرب، بالخصوص قریش، تجارت پیشہ بھی تھے، اور لوگ دوسروں کے کاروبار میں روپیہ لگا کر، نفع میں شریک ہو جاتے تھے۔ قرآن کریم نے اسے بھی ربٰو قرار دے دیا۔ فرمایا:۔

مضاربت

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۔۔۔ (۳۰/۳۹)

"جو روپیہ تم دوسروں کے مال میں شامل کر دیتے ہو کہ وہ بڑھتا رہے، تو یہ ربٰو ہے، جو اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔"

اس طرح مضاربت یا مشارکت کو بھی ختم کر دیا۔ المختصر اُس نے حَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) کہہ کر ربٰو کی ہر شکل کو حرام قرار دے دیا۔ اور اس جرم کی سنگینی کو یہ کہکر واضح کر دیا کہ اس کے مرتکب اور کفار ایک ہی

جہنم میں اکٹھے ہوں گے۔ (۱۴۰/۳)

اس طرح اس معاشرہ میں رزق، کریم اور طیب ہوگیا۔ یعنی قرآن کی رُو سے وہی رزق کریم اور طیب ہے جسے اپنی محنت سے حاصل کیا جائے۔ (جو محنت کرنے سے معذور ہو اس کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوگی) ربٰو کے ذریعے رزق حاصل کرنے والا چونکہ محنت نہیں کرتا، اس لئے اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں، اور آہستہ آہستہ اس میں محنت کرنے کی صلاحیت اور استعداد ہی نہیں رہتی۔ یہی وہ رزق ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے۔ ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

محنت کر کے کمانے کی صلاحیت، ربٰو سے، مفلوج ہو جاتی ہے اور ہوسِ زر اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہر وقت مضطرب و بیقرار ادھر اُدھر مارے مارے پھرتا رہتا ہے۔
كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ط (۲/۲۷۵) "جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو"۔

یہ تھا دورِ محمد رسول اللہؐ وَالَّذِينَ مَعَهُ کی اسلامی مملکت کا نظام، جس میں کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوتا تھا، اور ہر فرد کو رزقِ حلال میسّر تھا، یعنی عزت کی روٹی۔

دورِ ملوکیت

اس کے بعد ہمارا دورِ ملوکیت آگیا، اور (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے ساتھ ہی نظام سرمایہ داری اور نظام مذہبی پیشوائیت بھی در آیا اور چونکہ خود مملکت غیر اسلامی تھی، اس لئے وہ سب کچھ جسے قرآن نے ناجائز اور حرام قرار دیا تھا، جائز اور حلال قرار پا گیا۔ صرف اس کا نام بدل گیا۔ اس کے لئے مذہبی پیشوائیت نے جواز کی راہیں ہموار کر دیں۔ قرآن مجید نے دولت جمع کرنے والوں کے لئے عذاب جہنم کی وعید سنائی تھی، یہ تہدید اس شدت اور تکرار سے آئی تھی کہ ان آیات کی تنسیخ تو کجا، تاویل تک ممکن نہ تھی۔ اس کے جواز کی ایک اور راہ تراشی گئی۔ قرآن کریم میں ہے :-
وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹ : ۳۴-۳۵)

"جو لوگ سونا چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں، اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ! تو انہیں الم انگیز عذاب کی بشارت" سنا دے (یہ عذاب اس دن واقعہ ہوگا) جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اس جمع شدہ دولت کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو۔"

زکوٰۃ کی وضعی روایات

بات کس قدر صاف اور نکھری ہوئی ہے۔ اب وہ روایت ملاحظہ فرمائیے جسے نظام سرمایہ داری کے جائز قرار دینے کے لئے وضع کیا گیا:۔

(حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ...) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں گزری[ل] ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے ... ابن عباسؓ کہتے ہیں حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوش مسرت سے اللہ اکبر کہا!.... (ابو داؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

لیجئے! ایک وضعی روایت کی رو سے، اکتناز ذر شیر مادر کی طرح حلال قرار پا گیا اور اس طرح نظام سرمایہ داری کے لئے پھاٹک کھل گئے۔

زمین پر ذاتی ملکیت تسلیم کر لی گئی، اور اس طرح بٹائی یا ٹھیکہ کو عین مطابق اسلام قرار دے دیا۔ فقط اس کا نام مزارعت رکھ دیا۔

کسی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر منافع میں شریک ہو گئے۔ اس کا نام مضاربت رکھ دیا۔ جو حلال و طیب ہے۔ قرآنی آیت کے الفاظ اپنی جگہ برقرار اور محفوظ رہے اور وضعی روایات اور ان پر مبنی فقہ کی رو سے وہ سب جائز پا گیا جسے ان آیات نے ناجائز و حرام قرار دیا تھا۔ اقبالؒ نے اس صورت حالات پر اک

ل خدا کا حکم، رسول اللہؐ کی لسان مبارک سے، اور صحابہؓ پر گراں گزرے۔ (معاذ اللہ!)

آہ جگر سوز کیساتھ کہا ہے :۔

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے بعد وہ سلطنتیں ختم ہوگئیں جن کے عہد اقتدار میں یہ تبدیلیاں ہوئی تھیں ، ان کے مملکتی آئین و قوانین نسیاً منسیاً ہوگئے۔ ان کے معاشرہ کے خط و خال مٹ گئے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کی قرآنی تحریفات جنہیں شرعی قوانین کا نام دیا گیا تھا، بدستور آگے بڑھتی گئیں اور رفتہ رفتہ عین اسلام بن گئیں۔ اس پر صدیاں گذر گئیں، اور آج تک ——— ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین ——— عصر حاضر میں زمانہ کے تقاضوں سے سرمایہ داری کے قصر کہن میں کچھ تزلزل کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے تو علامہ اقبالؒ کی کچھ ڈھارس بندھی کہ یہ کابوس سینۂ انسانیت سے اتر گیا تو قرآن کے معاشی نظام کے لئے راہ ہموار ہو جائیگی۔ یہی وہ احساسات تھے جن سے کیف اندوز ہو کر انہوں نے اپنی مشہور مثنوی۔ ساقی نامہ۔ میں جھوم جھوم کر کہا تھا:۔

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دور سرمایہ داری گیا

تماشہ دکھا کر مداری گیا

عجمی اسلام

لیکن ان وجد آفرینیوں میں جب ان کی نگاہ ملت اسلامیہ پر پڑی تو اُن کی امیدیں مایوسیوں میں بدل گئیں۔ انہوں نے بصد حسرت و یاس، انتہائی غم والم کے عالم میں کہا:۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک سب سے بڑا جہاد یہ قرار دیا گیا کہ جہاں کسی نے سرمایہ داری کے

خلاف ایک لفظ بھی کہا، انہوں نے اسے کمیونسٹ قرار دے کر، کفر و الحاد کے فتوؤں سے نواز دیا۔ مغرب کی سرمایہ پرستانہ اقوام کے لئے ان کا یہ اسلام بڑا سازگار تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان کی ہمت افزائی کی اور دامے، درمے، قدمے، قلمے اس اسلام کے فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ انہی اقوام کے نمائندہ ابلیس کے مشیروں نے کہا تھا کہ :-

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا، ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

اور خود ابلیس نے یہ کہہ کر، انہیں اطمینان دلایا تھا :-

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حامل قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستین

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

آپ کو یاد ہو گا کہ روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام کے لئے، امریکہ نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کر کے کہا تھا :-

"دنیا کے خدا پرستو! آؤ۔ ہم متحد ہو کر اس الحاد اور بے دینی کا مقابلہ کریں"

امریکہ اور مودودی مرحوم

ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس دعوت پر لبیک کس طرح کہا گیا اس کا اندازہ اس خبر سے لگائیے جو روزنامہ امروز (لاہور) کی یکم دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا :-

"امریکن سفارت خانہ کے پروفیسر، ڈاکٹر ویلر نے گورنمنٹ کالج میانوالی کے طلباء کو لیکچر دیئے جن میں کمیونزم کی مخالفت کی۔ ان کے ساتھ جماعتِ اسلامی، لاہور، کے راہنما بھی تھے۔ اور مقامی امیر، مولانا گلزار احمد بھی"

(بحوالہ امروز۔ یکم دسمبر ۱۹۷۶ء)

اس کے بعد جب ۱۹۵۵ء میں حکومت پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنے روابط قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو مرحوم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کراچی اور لاہور میں پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا :-

"اگر یہ (امریکن) بلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں..... مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آ رہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔"

(جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار تسنیم بابت ۱۶، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)

ان روابط کا تو ہمیں علم نہیں کہ یہ قائم ہوئے یا نہیں اور اگر ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی، البتہ

مودودی مرحوم اور نظامِ سرمایہ داری

جو معاشی نظام (مرحوم) مودودی صاحب نے پیش کیا وہ خالص سرمایہ دارانہ تھا۔ اسے انہوں نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں تفصیل سے پیش کیا تھا۔ اس کے دو ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :-

"اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کرکے ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے بے کار کر دیا جائے۔"

(مسئلہ ملکیت زمین۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء، ص ۵۳-۵۲)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

"آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں

اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جسطرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسولؐ کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔" (ایضاً ۷۳-۷۲)

مودودی مرحوم اور نظامِ سرمایہ داری

صدر پاکستان نے بھی بھارت کے جریدہ "سنڈے" کو ایک انٹرویو کے دوران فرمایا تھا کہ:۔

"اسلام کی رُو سے ایک شخص جسقدر بھی چاہے دولت جمع کر سکتا ہے۔ بس اس پر اسے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔" (طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۲ء صفحہ ۱۶)

اس سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے پنجاب زکوٰۃ کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام مساوات کا دین ہے اس لئے فضل الحق کے پاس بھی سو روپے ہونے چاہئیں، ضیاء الحق صاحب کے پاس بھی سو روپے ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ قرآن کی طرف توجہ دیجئے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور ہمارا یہ دین ایمان ہے

کہ اسلام کی روح قرآن اور سنت رسولؐ میں ہے تو آپ یہ بتایئے کہ اگر مساوات کا مسئلہ قرآن کے نظریہ کے اندر یہ ہوتا کہ کوئی غریب نہیں ہوگا۔ کوئی مسکین نہیں ہوگا تو پھر قرآن میں اسکا ذکر کیوں آیا ہے۔ یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے اللہ تعالیٰ نے مخیر حضرات سے کہا ہے کہ اپنے اموال میں سے ایک مقررہ رقم[1] ان لوگوں کو دیں جو اس کے مستحق ہیں۔"

(الاعتصام ۹ جولائی ۱۹۸۲ء)

اقبالؒ کی انقلاب آفرینی

ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ یہ اسلام، حضرت علامہؒ کے سامنے تھا۔ انہوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ ایک خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں ایسا قرآنی نظام متشکل ہو سکے جس میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی ہو اور اس طرح اُمت ملوکیت، آمریت، سرمایہ داری اور تھیا کریسی کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے اس کے لئے انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اس تصور کو پیش کرنے کے بعد وہ برابر پکارتے رہے کہ:-

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کے انقلابی نعرہ سے وہ نظامِ زمینداری کے قصرِ تعیش میں تزلزل پیدا کرتے رہے۔ وہ سرمایہ داروں کو براہِ راست مخاطب کر کے کہتے رہے کہ:-

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار عیش کا پُتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

(بانگِ درا صفحہ ۳۳۵)

سرمایہ داروں کو وارننگ

جب زمامِ تحریکِ پاکستان، قائداعظمؒ کے ہاتھ میں آئی، تو انہوں نے بھی زمینداروں اور سرمایہ داروں کو للکار کر کہہ دیا کہ پاکستان میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشن واقعہ دہلی

---

[1] خدا نے کہیں ایسا نہیں فرمایا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں پوری شدت کے ساتھ کہا :-

"اس مقام پر زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں، وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اس کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذراسی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ، ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے"!

پاکستان میں

آمریت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف ان انقلاب آفریں غلغلوں اور طنطنوں کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن قوم کی بدقسمتی کہ جب یہ ذرا اُبھرا تو اُس وقت نہ وہ مفکرِ اعظم (اقبالؒ) موجود تھا، نہ قائداعظمؒ اور (اقبالؒ کے الفاظ میں) شاہیں کا یہ نشیمن، زاغوں کے تصرف میں چلا گیا۔ یہاں آمریت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کے عفاریت نے ہجوم کر کے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا، اور ربٰو کا طوفان بالخصوص، سیلاب کی طرح اُمنڈ آیا۔

قرآن کریم نے قارون کو، نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ وہ یہودی تھا، اور یہودی اسی نظام کے سہارے زندہ چلے آ رہے ہیں۔ ان کی مملکت چھن گئی۔ حکومت باقی نہ رہی۔ کوئی وطن نہ رہا۔ وہ دنیا میں خانماں خراب صحرا نوردوں کی طرح سرگرداں پھرتے رہے۔ ایں سو ماندہ واں سو درماندہ۔ لیکن انہوں نے اپنے نظامِ سرمایہ داری کو اس قدر محکم بنیادوں پر استوار رکھا کہ دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں ان کی دست نگر ہیں، اور اس حد تک کہ ان کی سیاست بھی انہی کے اشاروں پر چلتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ـــ "فرنگ کی رگِ جاں، پنجۂ یہود میں ہے"۔ انہوں نے اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہا تھا کہ :- ـــ

یہودی نظام بینکاری

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار — جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح — دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

یہودیوں نے ساری دنیا میں بنکوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ بنکوں کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ روپیہ محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہیں، لیکن وہ درحقیقت ربٰو کا عالمگیر نظام ہے جس کے اثرات بڑے دوررس ہیں علامہ اقبالؒ کی نگاہِ حقیقت شناس نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ :۔

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است — پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک ، ایں فکرِ چالاکِ یہود — نورِ حق از سینۂ آدم ربود

(پس چہ باید کرد)

یہ اس لئے کہ بنکوں کا سارا کاروبار ربٰو کے سر پر چلتا ہے، اور ربٰو وہ ابلیسی نظام ہے جس سے سینۂ آدم نورِ حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے حرام اور خدا و رسولؐ کے خلاف بغاوت اس لئے قرار دیا ہے کہ اس سے محفل انسانیت کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ دین کا سارا مدار اکلِ حلال پر ہے اور ربٰو کے نظام میں اکلِ حلال کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑی شدت سے واشگاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :۔

نانِ دانی نکتۂ اکلِ حلال — بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ! یورپ زیں مقام آگاہ نیست — چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام — حکمتش خام است و کارش ناتمام
تا نہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

(مثنوی۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق)

آپ ربٰو لیعنی سرمایہ داری کے نظام کی تخریب کاری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (حضرت علامہؒ کے الفاظ میں) اس میں دین تو ایک طرف، تہذیب و دانش تک باقی نہیں رہتے۔
علامہ اقبالؒ نے یہ وارننگ اقوامِ یورپ کو دی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جس اسلامی مملکت کا خواب وہ دیکھ رہے تھے، اس میں یہ تباہ کن کاروبار ان سے بھی زیادہ شدت سے پھیلے گا۔ بنکاری کا سودی نظام تشکیل

پاکستان سے پہلے بھی اس برصغیر میں کارفرما تھا لیکن محدود پیمانے پر۔ پاکستان میں یہ پھیلتا چلا گیا اور اب ملک گیر ہو رہا ہے۔ انگریز کے کافرانہ دورِ حکومت میں سود کو سود (INTEREST) کہا جاتا تھا، لیکن مسلمان عوام کے دل میں سود کے لفظ سے تکدر پیدا ہوتا تھا۔ اس کا

سود نہیں منافع

علاج یہ سوچا گیا کہ اسے سود نہیں بلکہ منافع (PROFIT) کہا جائے۔ اس طرح (ایک لفظ کی تبدیلی سے)، خدا کے حرام کردہ کو حلال کر لیا۔ موجودہ حکومت چونکہ اسلامی ہونے کی مدعی ہے، اس لئے اسے اس تبدیلی کے لئے شرعی سند کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ پاکستان میں اقامتِ دین کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ :-

"روپیہ جمع کرنے والوں کو سود دینے کے بجائے بینک ایسے منصوبے تیار کریں گے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حقدار ہوں گے"۔

(ایشیا، ۵، نومبر ۷۸ ۱۹، بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

آپ کو غالباً علم ہوگا کہ بینک نہ کوئی اپنے تجارتی منصوبے تیار کرتا ہے، نہ خود کاروبار کرتا ہے۔ وہ کرتا یہ ہے کہ لوگوں سے کم شرح سود پر روپیہ لے کر، اسے کاروباری لوگوں کو زیادہ شرح سود پر قرض دے دیتا ہے۔ ان سے جو سود وصول ہوتا ہے، اس سے زائد حصہ خود رکھ لیتا ہے اور باقی روپیہ جمع کرانے والوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یہ خالص سود ہی کاروبار ہوتا ہے۔

غنیمت ہے کہ ہمارے مذہبی حلقوں سے بھی اب یہ آواز بلند ہونی شروع ہو گئی ہے کہ بینک کا منافع ہر شکل میں سود ہے۔ جماعتِ اہلِ حدیث کے ترجمان، ہفتہ وار الاعتصام میں ایک مقالہ قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت بابت ۲۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں تحریر ہے :-

یہ منافع نہیں، سود ہی ہے

"بعض لوگ بینک کے نظام کو سود نہیں، بلکہ تجارتی منافع پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ لیکن اِدھر نصف صدی کے اندر اس موضوع پر اس قدر بحث ہو چکی ہے۔ اُردو زبان میں بھی اتنا لٹریچر آ گیا ہے کہ مزید اضافے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے اور علماءِ حقانی کی کثیر تعداد نے دلائل سے ثابت کر دیا

ہے کہ یہ سُود ہی ہے، منافع نہیں اور اب اسی پر سارے عالم کے تقریباً تمام اہلِ حق کا اتفاق ہے۔"

یا ایں ہمہ ہماری "اسلامی مملکت" اسے منافع قرار دیتی ہے، سُود نہیں۔ اس کاروبار کو مزید "اسلامیانے کے لئے" دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام رکھا ہے "بلاسود بینکاری" اور دوسرے کو کہا گیا ہے "باسود بینکاری"۔ یہ بھی صرف الفاظ کا فرق ہے۔ دونوں کا مدار سود پر ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ باسود بینکاری میں شرح سود پہلے سے متعین کر دی جاتی ہے اور بلاسود بینکاری میں اس شرح کا تعین منافع (یعنی سود) تقسیم کرتے وقت کیا جاتا ہے۔

ربوٰ سے زکوٰۃ

اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ باسود بینکاری کی مجموعی رقم (یعنی روپیہ جمع کرانے والے اصل زر اور منافع کی مجموعی رقم) سے اڑھائی فیصد وضع کر لیا اور اس کا نام زکوٰۃ رکھ دیا۔ ویسے تو خود لفظِ زکوٰۃ کے معنی پاکیزہ نشو و نما کے ہیں، لیکن قرآن کریم نے یہ کہہ کر اس کی مزید وضاحت کر دی، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ ... (۲/۲۶۷) "اے جماعتِ مومنین (خدا کی راہ میں) اپنی پاکیزہ کمائی خرچ کرو"۔ اس لئے کہ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ ... (۵/۱۰۰) "خبیث اور طیّب کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے"۔ یہاں یہی نہیں ہوا کہ خبیث طیّب کو باہم دگر ملا دیا گیا، بلکہ اس آمیزش کے بعد جو رقم وضع کی گئی، اسے زکوٰۃ قرار دے دیا۔ اس زکوٰۃ میں دینی مدارس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اس لئے حضرات "علماء کرام" میں سے کوئی اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے جھولیاں پھیلا پھیلا کر وصول کرتے ہیں۔

تھا جو نا خوب، بتدریج وہی خوب ہوا ‎ ‎ ‎ کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

لیکن اس طرح زکوٰۃ وصول کرنے سے بھی مسئلہ کما حقہٗ، حل نہیں ہوا۔ چنانچہ صدرِ مملکت نے، کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"زکوٰۃ کے نظام اور حدود کے نفاذ سے اچھے نتائج حاصل ہو رہے ہیں، اگرچہ بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ زکوٰۃ کی رقم (۳۳۳ کروڑ روپے) وصول ہوئی ہے لیکن گداگروں کی فوج ابھی موجود ہے۔ بیواؤں کی بڑی تعداد امداد سے محروم ہے۔" (جنگ لاہور، ۱۱ مارچ ۱۹۸۴ء)

لیکن وزیر خزانہ محترم غلام اسحٰق خان صاحب نے اعتراف کر لیا ہے کہ بینک کا منافع بھی سود ہے۔ انہوں نے پاکستان سوسائٹی آف ڈویلپمنٹ اکانومسٹس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"سود کو ختم کرنے کی پوری کوششیں کی جارہی ہیں جب کہ سود کی جگہ منافع کو لے آنا بھی جدید سرمایہ دارانہ طریقہ ہے اور قطعی طور پر اسلامی نہیں ہے۔ اس لئے ہم سرمایہ داری کو جدید سرمایہ داری سے بدلنا نہیں چاہتے"۔

(روزنامہ جنگ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء)

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است، لیکن سود کا خاتمہ کرنے کے لئے سارا نظام سرمایہ داری بدلنا ہوگا کہ اس کے بغیر سود کا خاتمہ ہو نہیں سکتا۔

سُودخوری کے شرعی حیلے

انگریز کے کافرانہ نظام تک ہمارے ہاں "سود خور" کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ "سود خور" سے مُراد ہوتی تھی، نجی قرضوں پر سود لینے والا۔ یہ کاروبار ہندو بنیا کیا کرتا تھا۔ مسلمانوں میں ایک خاص ٹائپ کے پٹھان (بالخصوص بمبئی وغیرہ کے علاقہ میں) اس کے لئے بدنام تھے۔ ہمارے ہاں اس قسم کے قرضے، بینکاری یا سیونگز اسکیموں کے دائرہ کار میں نہیں آتے، اس لئے ان قرضوں پہ منافع کو بہر حال سود سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے مفتیان عظام نے ایسے حیلے بنا دیئے جن سے یہ حرام بھی حلال ہو جائے۔ مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری (ایم اے اسلامک لاء) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "معاشیات نظام مصطفیٰ" اس میں پہلے سود کے خلاف اسلامی احکامات کا ذکر ہے، اور اس کے ایسے حیلے درج کئے گئے ہیں جن کی رُو سے سود لیا بھی جا سکے اور اس کا گناہ بھی نہ ہو۔ ایک آدھ حیلہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

پہلی تدبیر

ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر، اس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے ظاہر

ہے کہ یہ دو روپے سود ہوں گے۔ لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا، قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید کرے اور اسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدتِ معینہ کے لئے بارہ روپے میں اُدھار بیچ دے۔ اس مدت کے بعد قرض لینے والا، قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کر دے۔"

اس فقہی حیلے سے زائد دو روپے حلال وطیب قرار پا جائیں گے۔

اس قسم کی کئی ایک تدابیر، اس کتاب میں درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :۔

"امام ابویوسفؒ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہو گا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لئے ملے گا کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔"

(بحوالہ : فتویٰ قاضی خان مع عالمگیری۔ جلد دوم صہ ۲۷۹/۲۸۰۔ مصری)

اور خود صاحبِ کتاب کہتے ہیں :

"لیکن افسوس کہ مسلمان دینِ فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود ایسی لعنت میں مبتلا ہیں۔ افسوس، صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو۔ دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارے۔"

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۳-۲۲)

اب آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب (مرحوم) نے کیوں کہا تھا؟ کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔

قرآنِ کریم نے نظامِ سرمایہ داری (ربٰو) کو حرام قرار دیا تھا، کیونکہ اس میں یہ ہوتا ہے کہ :۔

کِشتِ دیگر چرد   دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

کھیتی کسی کی ہے، اس میں مویشی کسی اور کے چرتے ہیں۔ کاشت کوئی کرتا ہے، پیداوار کوئی اور لے جاتا ہے۔

از ضعیفاں نان ربودن حکمت است   از تنِ شاں جان ربودن حکمت است

اس میں، مفلسوں، ضعیفوں کے ہاتھ سے روٹی چھین لینا، یعنی ان کے جسم ناتوان سے جان کشید کر لینا کاریگری کہلاتا ہے۔ اس کے بعد کہا تھا کہ :۔

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام   دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

جب تک یہ نظام تہ و بالا نہ ہوگا، دین تو ایک طرف، عقل و خرد، تہذیب و تمدن تک باقی نہیں رہیں گے۔ یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ قرآن کریم نے اس نظام کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ جس مسلک یا شعار کو حرام قرار دیتا ہے تو وہ کوئی آمرانہ اَرطی نص نہیں ہوتا۔ وہ سراسر علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے نظامِ ربو مسلمانوں کے لئے اس لئے حرام قرار دیا کہ اس سے ان کا دین باقی نہیں رہتا لیکن دیگر نوعِ انسان سے کہا ہے کہ یاد رکھو! یہ نظام دشمنِ تہذیب و دانش ہے۔ اس سے تم سطحِ انسانیت سے نیچے گر جاؤ گے۔ انسانیت کی بقا اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس نظام کو حرام قرار دیا ہے، اسے حرام سمجھا جائے:۔

گر جہاں داند حرامش را حرام — تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

دوام اور پائندگی قرآن کے معاشی نظام ہی کو حاصل ہوگی کیونکہ اس میں تہذیب و دانش پروان چڑھیں گے۔ ان تنذیرات و تصریحات کے بعد علامہؒ نے اس کی وضاحت کر دی:۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر — با نگاہے دیگرے اُو را نگر

نظامِ سرمایہ داری کو مٹا کر قرآن کا نظام قائم کرنا، مذہبی پیشوائیت کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ یہ خود دوسروں کی کمائی پر زندہ رہتے ہیں۔ قرآن کا نظام تو یہ تھا کہ

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبین ایں است و بس

لیکن

مکتب و مُلّا سخن ہا ساختند — مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویل مُرد — آتشِ اُو در ضمیرِ اُو فسرد

مذہبی پیشوائیت یہ نہیں ہونے دیگی

نکتۂ شرعِ مبین یہ تھا کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت نے قرآن حکیم کے اس اصل الاصول کو اس طرح مسخ کر دیا ہے کہ یہ سرتاپا حرکت و حرارت قوم، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ یہ سب دین فروش ہیں۔ قرآن حکیم نے کہا تھا کہ ان کا شیوہ یہ ہے کہ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ "یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں کہ وہ ارشاداتِ خداوندی ہیں"۔ یہ سب اس لئے کہ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا "تاکہ اس سے چار پیسے کمائے جائیں" اور نہیں جانتے کہ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا

یکسبون ۱۵ (۲)

ہ ان کے یہ فتوی اور ان کے ذریعے حاصل کردہ روٹی انہیں لے ڈوبے گی۔"

اس سے :

عقل و نقل افتاد در بندِ ہوس منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس

یہ منقولی بات کہیں یا معقولی، مقصد ان کا اپنی مفاد پرستی ہوتا ہے۔ ان کا منبر روٹی بیچنے والے کا خوانچہ بن کر رہ گیا ہے:۔

زیں کلیماں نیست امیدِ کشود آستیں ہائے ید بیضا، چہ سود ؟

یہ وہ صاحبانِ ضربِ کلیم نہیں جن کا ثعبانِ مبین فرعون، ہامان وقارون کو ہڑپ کر جائے۔ ان کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں میں ایمان کی شمعیں نہیں۔ لہٰذا ان سے کشود کار کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

یہ تھے وہ ساحرین وسامرین جن سے پیچھا چھڑانے کے لئے حضرت علامہؒ نے پاکستان کی آزاد مملکت کا تصور دیا تھا تاکہ امتِ مرحومہ کو حلال کی روٹی مل سکے۔ اگر وہ جانتے کہ اس مملکت کا حشر یہ ہونا ہے تو وہ کبھی اپنے نالۂ نیم شبی اور فغانِ سحری کو اس کے لئے وقف نہ کرتے۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ :۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزوں کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے یہ مطلب نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے..... اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا، جس کی بنیادیں انہی اصولوں پہ ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد ؟

کہا جاتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اس دور کا اقتصادی تقاضا ہے۔ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں[1] اگر یہی بات

---

[1] اس کے بغیر چارہ اس لئے نہیں کہ ہم میں قرآن کا معاشی نظام اختیار کرنے کی ہمت نہیں۔

ہے تو اسے اختیار کئے رہیئے، لیکن اسے حرام تو سمجھئے۔ قرآن کے معاشی نظام کے بجائے اسے اختیار کرنے سے جو حشر باقی دنیا کا ہوگا، وہی ہمارا بھی ہوگا۔ لیکن اس کے اسلامی قرار دینے سے اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے گا۔ یہی وہ جرمِ عظیم تھا جس کے احساس سے علامہؒ نے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ کہا تھا:۔

نازدی از محمد رنگ و بو! از درودِ خود میالا نامِ او!

ہماری وجہ سے اگر اسم محمدؐ پر کوئی حرف آگیا تو یہ جرم ناقابلِ معافی ہوگا۔ جو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ دین کا نظام اختیار نہ کرنے سے جو حشر باقی قوموں کا ہوگا وہی ہمارا ہوگا۔ لیکن ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو نظر آجائے گا کہ حشر ان قوموں سے بھی زیادہ اندوہناک اور عبرت آموز ہوگا۔ سیکولر قوموں کی کیفیت یہ ہے کہ جو معاملہ ان کے سامنے آتا ہے وہ عقل و فکر کی رُو سے اس پر غور کرتی ہیں۔ علم و آگہی کی روشنی میں اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیتی ہیں۔ زمانے کے تقاضوں کے ترازو میں رکھ کر اسے تولتی ہیں۔ اور اس کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچتی ہیں۔
جب تجربہ بتاتا ہے کہ اس فیصلہ میں کوئی سقم رہ گیا ہے تو وہ اس پر نظرِ ثانی کرتی ہیں۔ اور اس طرح دانش و بینش کے ہم رکاب زندگی کا سفر طے کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے برعکس، ہماری حالت یہ ہے کہ جونہی کوئی معاملہ ہمارے سامنے آئے، اُدھر سے آواز آجاتی ہے کہ یہ شرعاً ناجائز ہے۔ (بغیر بتائے کہ اس کی اتھارٹی کیا ہے۔) اس آواز کے ساتھ ہی عقل و فکر کی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں۔ علم و شعور کے دروازے مقفل ہو جاتے ہیں۔ دماغوں پر تالے پڑ جاتے ہیں، ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ آپ اگر اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہیں تو آپ پر کفر و الحاد حتیٰ کہ ارتداد تک کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ آپ کو ان کا فیصلہ ماننا پڑتا ہے؛ اس باب میں افراد ہی نہیں، حکومتیں بھی بے بس ہوتی ہیں۔ وہ اعتراف کرتی ہیں کہ فلاں (شرعی) قانون ناممکن العمل ہے لیکن وہ اسے منسوخ کرنا تو ایک طرف اس میں کسی قسم کا رد و بدل بھی نہیں کر سکتیں۔ اس کی زندہ مثالیں خود ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں شدید جذباتی واقعہ ہوئے ہیں، تو اس کی وجہ یہی ہے۔ جس قوم پر صدیوں سے علم و عقل سے کام لینا حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ جس کا غور و فکر کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو، وہ جذباتی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی؟ اور عقل و فکر

سے عاری، جذباتی قوموں کا جو حشر ہوا کرتا ہے، ظاہر ہے۔ اس کی زندہ مثال ہم خود ہیں۔ اقبالؒ ساری عمر یہی رونا روتا رہا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ

داستانِ او مپرس از من، کہ من چوں بگویم، آنچہ ناید در سخن

اور یہی کہتا خود میں بھی چلا جاؤں گا۔[1]

والسّلام

پرویز۔ مئی ۱۹۸۴ء

---

[1] محترم پرویزؒ صاحب کا یہ خطاب فکرِ اقبال پر ان کی زندگی کی آخری نگارش ہے۔